یقیناً اہل تقویٰ کے لیے ہی کامیابی ہے۔

Indeed for those who fear Allah, is a great achievement.

THE HOLY QURAN – Chapter (30) Surat An-Naba, Verse (31)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تصوف پر علمی، تحقیقی ودعوتی مجلہ

کتابی سلسلہ الاحسان الٰہ آباد

زیرسرپرستی: داعی اسلام شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی مد ظلہ العالی

مدیر: حسن سعید صفوی

ناشر

شاہ صفی اکیڈمی، جامعہ عارفیہ/ خانقاہ عارفیہ، سید سراواں، الہ آباد (یوپی)

E-mail :alehsaan.yearly@gmail.com

shahsafiacademy@gmail.com

سلسلۂ مطبوعات نمبر (۱۴)

کتابی سلسلہ: الاحسان (شمارہ نمبر-۷)

مدیر: حسن سعید صفوی

ترتیب: مجیب الرحمٰن علیمی، ذیشان احمد مصباحی، ضیاء الرحمٰن علیمی، رفعت رضا نوری

سال اشاعت: جنوری ۲۰۱۷ء/ ربیع الآخر ۱۴۳۸ھ

ناشر: شاہ صفی اکیڈمی، جامعہ عارفیہ/ خانقاہ عارفیہ، سید سراواں، الہ آباد (یوپی)

قیمت فی شمارہ:	Rs. 300
لائبریری اور سرکاری اداروں کے لیے:	Rs. 500
بیرونی ممالک:	$. 40

Alehsaan (*An Annual Journal on Islamic Spirituality*)
Published by: **Shah Safi Academy**, Jamia Arifia
Saiyed Sarawan, Kaushambi, Allahabad U.P.(India)211001
Ph:8382923993/9026981216-Email:alehsaan.yearly@gmail.com

اہل قلم کی رائے سے ادارے کا اتفاق ضروری نہیں!

قد أفلح من تزكى

انتساب

سراج الملۃ والزمان، شیخ شیوخ اہل الاسلام، قطب العالم والانام
مظہر الشرع والشریعۃ، کاشف الحق والحقیقۃ، قطب اودھ، شیخ المشائخ
حضرت شیخ محمد بن قطب مخدوم شاہ مینا لکھنوی قدس سرہٗ
(پیدائش: ۸۰۰ھ/ ۱۳۹۸ء - وفات: ۸۸۴ھ/ ۱۴۷۹ء)

کے نام

عامل بعمل اتقیا، کامل مکمل اولیا
شامل بفعل انبیا، زیں وصف ہم روشن تری
شیخ محمد قطب دیں، قطب است درعالم یقیں
ہریک مرید از روم وچیں، در ذات برہمہ حاضری
(مجمع السلوک)

عمریست کہ آوازۂ منصور کہن شد
من از سر نو زندہ کنم دار و رسن را

مشمولات

بادہ و ساغر

07-20

تذکیر

21-32

تحقیق وتنقید

33-266

مکتوبات

267-283

بادہ و ساغر

سلطان العارفین شاہ عارف صفی محمدی قدس سرہ
تضمین: شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی

غزل

دل اسیرِ زلفِ پیچانت کنم
جاں نثارِ چشم فتانت کنم
چوں خیالِ روئے تابانت کنم
بس ہمی خواہم کہ مہمانت کنم
دیدہ و دل ہر دو قربانت کنم

تو ہی تو ہے قل ھو اللّٰہ احد
جز ترے ہے کون اللّٰہ الصمد
بس ترا ہی نور ہے ازل و ابد
از طفیلت بندہ مولائی کند
کے ادائے شکر و احسانت کنم

شوق میں ہے سینہ و دل چاک چاک
یوں ہوا ہوں تیر مژگاں سے ہلاک
کچھ نہیں اب آرزوئے جان پاک
از عذاب دوزخ و فردا چہ باک
دین و ایماں ہر دو قربانت کنم

از قیود ما و تو بے زار باش
روز و شب در عشق او بیمار باش
ہر زماں با احمد مختار باش
عارفا مستی مکن ہشیار باش
ضبط خواہد فاش عرفانت کنم

احمد جاوید صاحب (لاہور)

ہدیہ تبریک

اے صاحبانِ صحو بصد چشم بنگرید
در بوستانِ جذب و فنا، سروِ بایزیدؒ

آمد ز سمتِ غیب بہارے کہ بر دمید
از خاکِ پاکِ روضۂ جاں غنچہ ہاے دید

بانگِ ہزار و نغمۂ بلبل بلند شد
اے اہلِ جذبہ وقتِ سماع است برجہید

اے قمریانِ دم بخود و کم نفَس ، صلا
شمشادِ معنی از چمن حرف سرکشید

یارانِ سینہ صاف و رفیقانِ زندہ دل
آمد نویدِ خرّمی و عیش، بشنوید

رندانِ بادہ خانۂ غیب و شہود را
تبریک ہا کہ ساقیِ فیاض در رسید

از بس کہ تازہ شد روش و راہِ واصلاں
از سعی و جہدِ داعیِ اسلام ابو سعید

آں مجریِ قلوب و مصفّا گرِ نفوس
آں وارثِ روایتِ خرقانیؒ و فریدؒ

جمع است حبّ و معرفت و خشیتِ الٰه
در مشربِ مرتّبِ او با کمالِ دید

تنزیہ با حضوری و تشبیہ با خفا
ظاہر بباطن است و باظہار ناپدید

فرخندہ باد گلشنِ اسرارِ حق و خلق
در صدر و قلب و روحِ چنیں مرد یا مجید

صد شکر ربِّ احمد و معبودِ مصطفٰی ﷺ
کز میہنم برآمدہ فردے زبس رشید

از اتباعِ سنّت و پابندی کتاب
اندر حقائق و حِکَمِ بندگی، فرید

سیّارِ اوجِ اوجِ حقیقت بچشمِ باز
سبّاحِ موجِ موجِ طریق است ابو سعید

غوّاصِ ژرفِ ژرفِ محیطِ ولایت است
دانائے حرفِ حرفِ سلوک است ایں عمید

از ناحیاتِ پرگنہ چائل بر آمدست
ابرے کز او شگفتہ شود غنچۂ امید

یا ربِّ ذا الجلال و الاکرام المدد
تا باشد ایں صباحِ ھدیٰ دائما سپید

از صحبتِ مشائخ ایں خانقاہ باد
طلّاب مستفیض و مجاذیب مستفید

دل، قصرِ ہفت باب و چو خواہید فتح باب
اینجا بیاورید کہ یک قفل و صد کلید

جانے کہ دید جائے دلآرام را، ز پس
در عالم مشاہدہ جائے نیارمید

ایں بود شانِ جاذبہء مصطفیٰؐ کہ داشت
مثل عمرؓ مراد و مثالِ علیؓ مرید

از پیرویّ سنّتِ ارشادِ شاہِ دیں
اوجے گرفت مسندِ ایں مرشدِ وحید

در سینہ ہاے اہلِ صفا پرتوے نمود
گلزار در دمیدن و بادِ سحر وزید

رندے کہ جامِ بادہ ز پیرِ مغاں گرفت
یک جرعہ در کشیدہ و خمخانہ آفرید

اینجاست سرِّ غیب کہ از دل بدل رود
بے حرف و بے حکایت و بے گفت و بے شنید

باید کہ ہر مرید بود از نگاہِ شیخ
چوں ذرہء کہ از قفس ذرّگی رہید

از لطفِ کردگار شما را میسّر است
کامل سلوک و منتہی جذبہء شدید

ایں مجمع الصفات چو کبریتِ احمر است
ظاہر شود بہ سلسلہ در مدّتِ مدید

اے صاحبانِ صدق و صفا، با زبانِ حال
ایں بیت را وظیفہ و تکرار می کنید

ما ذرّہ ایم، ذرّہء مجذوبِ آفتاب
ما لمحہ ایم، لمحہء اندر ابد دمید

اے ربّ مہرباں ہمہ اصحابِ حلقہ را
دائم نگاہدار ز ہر حاسد و عنید

ایں خیل خیل اہلِ سعادت ز ہر طرف
باشند ایمن از ہمگی ریو و مکر و شید

○○○

ایں مجمع الصفات چو کبریتِ احمر است
ظاہر شود بہ سلسلہ در مدّتِ مدید

ابتدائیہ

صوفیہ نے نہ تو دل آزاری سیکھی ہے اور نہ ہی ان کے پاکیزہ مشرب میں یہ جائز ہے-ان کا معاملہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ یہاں دل بدست آور کہ حج اکبر است کا پیغام سیکھا اور سکھایا جاتا ہے۔ سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا، بَشِّرُوا وَلَا تُنَفِّرُوا [آسانی پیدا کرو، مشکلیں نہیں-خوش خبری پھیلاؤ، نفرت نہیں-] فرما کر ساری انسانیت کو ایسا لافانی سبق دیا ہے کہ اگر ہم نے صرف یہ سبق یاد رکھا ہوتا تو آج اہل اسلام کو پیش آنے والے نامعلوم کتنے فتنے خود بخود دفن ہو گئے ہوتے-

اسلام دین امن وامان ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے قتل وغارت گری، ظلم وبربریت اور انتہا پسندی کی ایسی مذمت کی ہے کہ دنیا کے کسی بھی مذہب میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ دراصل صوفیہ نے اسی کی دعوت دی اور خلق خدا کو الصِّدقُ مع الحَقِّ و الخُلقُ مع الخَلْق [حق تعالی کے ساتھ اخلاص اور خلق خدا کے ساتھ اخلاق] کا ایسا درس دیا جو لوگوں کے قلوب پر نقش ہو گیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج بھی جب عالمی سطح پر اسلام کو بدنام کرنے کی سازشیں ہو رہی ہیں، ہمیں صوفی دعوت کے مثبت اثرات کا جابجا مشاہدہ ہوتا ہے-ایسے میں تصوف کی اہمیت اور احیاے تصوف کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ کا شکر ہے کہ سالنامہ **الاحسان** اس عظیم فریضے کی انجام دہی کے لیے جزوی طور پر ہی سہی، تسلسل کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ مرشد گرامی حضرت داعی اسلام شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی حفظہ اللہ تعالیٰ، علما، طلبہ اور عوام کے تزکیہ وتربیت میں عملاً مصروف ہیں اور ان کے زیر سرپرستی مجلہ **الاحسان** تصوف کے عہد زریں کی علمی بازیافت کے لیے کوشاں ہے۔ اس تناظر میں یہ بات حقیقت کا ترجمان ہو گی کہ اللہ کی توفیق سے علم وعمل اور تعلیم وتعلم کا یہ سلسلہ دراز رہا تو ان شاء اللہ اسلام کی پرامن نظری وعملی اشاعت کے حوالے سے ایک تاریخی کارنامہ وقوع پذیر ہوگا-ہمیں اللہ کے فضل کا امیدوار اور میدان عمل میں طلب گار رہنا چاہیے-

....

الاحسان کا ساتواں شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ شمارہ چوں کہ ہجومِ کار کے درمیان اور مجمع السلوک، تصنیف قطب العالم مخدوم شیخ سعدالدین خیرآبادی قدس سرہٗ (۹۲۲ھ/ ۱۵۱۶ء) کی طباعت واشاعت کے فوراً بعد تیار کیا گیا، اس لیے اس میں بعض اہم گوشوں کو شامل نہیں کیا جاسکا، ان شاءاللہ اگلا شمارا جو حضرت مخدوم شیخ سعد خیرآبادی اور مجمع السلوک پر خصوصی شمارہ ہوگا، اس میں اس کی تلافی کردی جائے گی۔ اس کے باوجود شمارے کو حسب سابق جدت وتنوع کی مثال بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اب ہم اس کوشش میں کس قدر کامیاب ہوئے، اس کا فیصلہ آپ پر ہے۔

بادہ وساغر میں اس مرتبہ حضرت سلطان العارفین شاہ عارف صفی محمدی قدس سرہ (۱۳۲۰ھ/ ۱۹۰۳ء) کے کلام پر حضرت داعی اسلام کی تضمین شامل ہے۔ یہ کلام کیا ہے، قولِ مرداں جاں دارد کی تصویر ہے۔ حضرت داعی اسلام کی عارفانہ شاعری عصر حاضر کی نوادرات میں سے ہے۔ ان کی مثنوی نغمات الاسرار شائع ہوکر اہل علم اور ارباب ذوق سے تحسین پذیر اور ان کے لیے تسکین بخش ہوچکی ہے۔ دیوان سعید بھی زیر ترتیب ہے۔ اسی بادۂ عرفان کے جام تازہ بہ تازہ سے قارئین الاحسان کی ضیافت کا سامان کیا جاتا ہے۔ حضرت سلطان العارفین قدس سرہ کا کلام اور حضرت داعی اسلام کی تضمین کے اشعار باہم ایسے پیوست ہیں کہ قالب واحد کا گمان ہوتا ہے۔

اس بار اس کالم میں ایک اور عظیم شخصیت شامل ہے اور وہ ہے حضرت احمد جاوید صاحب (سابق ڈائرکٹر اقبال اکیڈمی، لاہور) کی۔ آپ کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ ادب کے ایوان ہوں یا علم وعرفان کی مجلسیں، ہر جگہ آپ کا نام احترام سے لیا جاتا ہے۔ بڑے بڑے مناصب پر آپ فائز رہے لیکن شخصیت میں سادگی اور جذب وسلوک کے عناصر نمایاں رہے۔ ہدیہ تبریک کے عنوان سے آپ کا قصیدہ شامل شمارہ ہے، جو زبان وبیان کی لطافت اور معنی آفرینی میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم خاقانی ونظیری کے کلام سے لطف اندوز ہورہے ہیں۔ اس عظیم دانشور، مفکر، فلسفی، صوفی، صاحب طرز ادیب اور استاذ شاعر کے ہم شکرگذار ہیں کہ انہوں نے ہمیں گراں قدر اور وقیع تاثر سے نوازا۔ جاوید امیر عثمانی معروف بہ احمد جاوید صاحب، سید سراواں کے معزز عثمانی خانوادے کے فردِ فرید ہیں۔ اس لحاظ سے ہمیں آپ سے علاوہ خاندانی نسبتوں کے رشتۂ ہم وطنی بھی حاصل ہے۔

تذکیر کے کالم میں شیخ الاسلام قطب الدین دمشقی (۷۸۰ھ/ ۱۳۷۸ء) کے الرسالۃ المکیۃ اور قطب العالم مخدوم شیخ سعد خیرآبادی کی کتاب نایاب مجمع السلوک سے تعلیم کتاب وسنت کی اہمیت اور مرشد کی ضرورت کے عنوان سے ایک اقتباس شامل ہے۔ صوفیہ کے یہاں علم کی کتنی اہمیت ہے اور یہ حضرات جہل اور جہلا سے کس قدر بےزار ہیں، شیخ کی ضرورت اور اس کا مقام

ومرتبہ کیا ہے؟ اس کا نمونہ ہمیں اس میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ شیخ دمشقی نے فرمایا ہے کہ سالک کو صحبت شیخ میسر ہو یا نہ ہو، اسے علم بہر حال ضروری ہے- حضرت مخدوم صاحب اس پر مزید تاکید کرتے ہوئے فرماتے ہیں: **وھذاھو الصواب عندی** (اور یہی میرے نزدیک درست بھی ہے-) پھر اس پر شیخ کا یہ حاشیہ کہ روحانی منازل کے سلوک کے لیے تحصیل علم کے بعد تلاش شیخ ضروری ہے، اگر چہ یہ بات عقلاً ممکن ہے کہ بغیر شیخ کے ہی کسی کے سارے مدارج طے ہو جائیں، اللہ کریم اس عطا پر قادر ہے، البتہ مشائخ کی سنت اور عادت جاریہ یہی ہے کہ ماضی میں تمام بڑے بڑے علما نے تزکیہ وتربیت کے لیے کسی نہ کسی مرشد کی صحبت ضرور اختیار کی۔

تحقیق وتنقید کے کالم میں ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اہل علم وفکر کے لیے کافی سامان دید فراہم ہے- اس میں کل ۹ مقالات شامل ہیں، جن میں ہر ایک ، ایک سے بڑھ کر ایک ہے۔ حسب سابق اس بار بھی یہ کالم وقیع ترین ہے۔ اتفاق ہے کہ اس شمارے میں بہت سے کالم حذف ہیں، لیکن مقالات کی علمیت اور ثقاہت کی بنیاد پر یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اگر دوسرے کالم ہوتے جب بھی یہی کالم حاوی ہوتا۔

عصر حاضر میں چند مخصوص خیر خواہوں کی طرف سے یہ فکر بھی عام کی گئی کہ جماعت صوفیہ سواد اعظم سے ہٹ کر کسی الگ گروہ کا نام ہے، بالخصوص حضرات محدثین سے تو صوفیہ کو تباین کلی کی نسبت حاصل ہے اور محدثین، اشاعرہ اور ماتریدیہ سے الگ ایک مکتب فکر کے حامل ہیں!! اس بات کو ایک محدث اور اصولی سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے؟ علامہ ڈاکٹر اسامہ سید محمود ازہری جو ازہر شریف (قاہرہ) کے نمائندہ علما میں شمار کیے جاتے ہیں اور اصولی محدث ہونے کی حیثیت سے اپنی منفرد شناخت رکھتے ہیں، اس موضوع پر آپ ہی کے ایک تحقیقی مضمون کا ترجمہ شامل کیا گیا- موصوف نے اس موضوع پر جیسی داد تحقیق دی وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے- انھوں نے اپنا یہ مقالہ سال گذشتہ چیچنیا میں اہل سنت کی تعریف وتحقیق کے حوالے سے منعقد ہونے والی کانفرنس میں **عقیدۃ المحدثین و صلتھم بالتصوف** کے عنوان سے پیش کیا تھا، جس کا بروقت اور سلیس و بامحاورہ ترجمہ عزیز سعید مولانا شاہد رضا نجمی، ریسرچ اسکالر، شعبۂ دعوہ، جامعہ عارفیہ نے کیا۔ مولانا موصوف جواں سال و جواں عزم ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ وہ مستقبل میں بھی اس قسم کے حقائق وانکشافات سے اہل علم کی ضیافت فرماتے رہیں گے۔

مولانا غلام مصطفیٰ ازہری جامعہ عارفیہ کے باصلاحیت، صوفی منش اور محقق عالم ہیں۔ علوم اسلامیہ میں حدیث اور فقہ کے ساتھ خاص ربط ہے۔ ہمیشہ دلچسپ اور اچھوتے موضوع کا ہی انتخاب کرتے ہیں- اس بار تحقیق وتنقید کے کالم میں ان کے دو وقیع مقالات شامل ہیں۔ پہلا

مقالہ علم حدیث میں صوفیہ کے منہج واسلوب کی تحقیق کے حوالے سے ہے۔ ہمارے کرم فرما حضرت مولانا اسید الحق قادری بدایونی رحمہ اللہ نے تقریروں میں موضوع روایات کے حوالے سے ایک تحقیقی مقالہ سپرد کیا تھا، جو کافی زیر بحث رہا۔ اس میں صوفیہ کی بعض مرویات پر بھی عالمانہ گفتگو تھی، جس پر ایک بڑے حلقے میں تشویش کے آثار محسوس کیے گئے۔ زیر نظر مقالے کو اسی جہت کا تکمیلی اور تحقیقی کام کہا جا سکتا ہے۔ میرے محدود مطالعے کی حد تک، کم از کم اردو میں اس موضوع پر اس پائے کا کوئی مقالہ نہیں ہے۔ یہ مقالہ پہلے پہل خانقاہ عارفیہ کے ماہوار اصلاحی ترجمان خضر راہ میں قسط وار شائع ہوا، بعد ازاں مزید اضافات اور ترمیمات کے ساتھ مجمع السلوک کے آخر میں بطور ضمیمہ شائع کیا گیا اور اب مزید بعض اضافات کے ساتھ قارئین الاحسان کے ذوق مطالعہ کی نذر ہے۔ اس بار انھوں نے خلافت کے حقوق وواجبات اور شرطوں پر سیر حاصل گفتگو کی ہے، جس کی یقیناً اس دور میں بہت ہی ضرورت ہے- خلافت کے معنی ومفہوم سے عدم واقفیت کی بنا پر اس کا جیسا مذاق بنایا گیا وہ قابل افسوس ہے- مولانا موصوف نے کتاب وسنت کی روشنی میں اس پر تفصیلی گفتگو کی اور اس کی شرطوں کو وضاحت کے ساتھ لکھا ہے اور دلائل سے مبرہن کیا ہے- اس موضوع پر مزید توضیح وتفصیل کی گنجائش سے انکار نہیں ہے-

حافظ ملت مولانا عبد العزیز مبارک پوری نے کہا تھا کہ ہمارے زمانے کی خلافتیں، خلافت نہیں، کھلی آفت ہیں۔ یہ آفت آج پچاس سال بعد وبا کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ موجودہ زمانے میں تصوف اور صوفیہ کو بدنام کرنے والے بڑے اسباب میں سے ایک نمایاں سبب یہ وبائے عام بھی ہے، جس سے ہم حفظ وامان کی پناہ مانگتے ہیں۔ مولانا ازہری نے اسی تناظر میں اس مسئلے کا تحقیقی اور علمی جائزہ لیا ہے۔ اس کی روشنی میں اہل علم پر یہ بات واضح ہوگی کہ مشائخ کے یہاں خلافت کا حصول کس قدر مشکل تھا اور آج کس قدر مشکل خیز بن گیا ہے۔ یہ مقالہ موجودہ اہل خانقاہ کے لیے دعوت فکر ہے۔

ابن جوزی، ابن تیمیہ، ابن قیم اور قاضی شوکانی کی تحریروں سے اثبات تصوف کرنے والے الاحسان کے سب سے مقبول، محقق اور جوان فاضل مولانا ضیاء الرحمٰن علیمی قارئین الاحسان کے لیے ایک بالکل نئی چیز کے ساتھ شریک محفل ہوئے ہیں۔ اہل علم سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ تصوف اگرچہ ایک فن ہے، لیکن اس کی فنیت، حدیث وتفسیر اور فقہ وکلام کی طرح بہت مستحکم نہیں ہو سکی ہے۔ تصوف کے اصول پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ موجودہ دنیا میں جب کہ مادیت کے فروغ اور روحانیت کے زوال کے بعد یہ ایک عام فکر بنتی جا رہی ہے کہ طریقت کی ضرورت نہیں، جو لوگ اس کی ضرورت کو تسلیم بھی کرتے ہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مرشد کی حاجت نہیں، زیادہ سے زیادہ کتب تصوف کا مطالعہ کر لینا کافی ہے۔ مولانا ضیاء الرحمٰن علیمی نے اس تناظر میں یہ

بتانے کی کوشش کی ہے کہ مرشد کی ضرورت کیا ہے اور اصول تصوف منضبط نہ ہونے کے سبب بغیر کسی رہ نمائی کے کتب تصوف کے مطالعے کے منفی اثرات کیا ہیں۔ مولانا نے صرف اسی پر بس نہیں کیا ہے، بلکہ ایسے لوگوں کے لیے جو مرشد کی رہ نمائی کے بغیر کتب تصوف کے مطالعے سے تصوف حاصل کرنا چاہتے ہیں، مطالعۂ تصوف کے زریں اصول رقم کر دیے ہیں، جن کی روشنی میں اس پر پیچ راستے کے بہت سے کھنڈرات سے بچا جا سکتا ہے۔ یہ بالکل انوکھا اور نیا موضوع اور میدان تحقیق تھا جس سے بخوبی تمام مولانا موصوف عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ مطالعۂ تصوف کے ۲۷ رہ نما اصول رقم فرما کر میدان تصوف میں مولانا موصوف نے ایک اجتہادی نوعیت کا فریضہ ادا کیا ہے، جس پر ہم سب کی طرف سے قابل مبارک باد ہیں۔ یہ مقالہ بھی اس سے پیشتر مجمع السلوک میں بطور ضمیمہ شائع ہو چکا ہے، البتہ اس میں بعض مفید اضافات اور موضوع کی اہمیت نے الاحسان میں اس کی اشاعت ثانی کو جواز فراہم کر دیا۔

مولانا امام الدین مصباحی بھی جامعہ عارفیہ کے ایک ممتاز استاذ ہیں۔ خانقاہ عالیہ عارفیہ کے حوالے سے ان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انہی کی وابستگی کے بعد خانقاہ شریف میں ارباب لوح وقلم کی آمد ورفت بڑھی۔ وہ بھی شروع سے الاحسان کے قلم کاروں میں شامل ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ تصوف سے متعلق خالص تحقیقی موضوعات کا انتخاب کیا ہے۔ شطحات، وحدۃ الوجود اور تفسیر اشاری جیسے دقیق موضوعات پر الاحسان کے سابق شماروں میں داد تحقیق دے چکے ہیں۔ اس بار علم لدنی کو موضوع سخن بنایا ہے اور اس کا تحقیقی مطالعہ کیا ہے۔ یقین ہے کہ قارئین کا ذوق معارف آشنا اس بار بھی خوب محظوظ ہوگا۔

مولانا آفتاب رشک مصباحی کی تحقیق حدیث: **اتخاذ القبور مساجد** ایک مطالعہ اور پروفیسر منظر اعجاز کی تحریر الٰہیاتی تفکر کی شاعرانہ ترسیل بھی بہت اہم ہیں۔ مفتی آفتاب صاحب نے ایک مشہور حدیث سے پیدا شدہ ایک علمی غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے اور خوب کیا ہے جب کہ پروفیسر منظر اعجاز صاحب نے مرشد گرامی حضرت داعی اسلام کی مثنوی نغمات الاسرار فی مقامات الابرار کا فکری ونظری مطالعہ کیا ہے۔ پروفیسر منظر اعجاز صاحب قارئین الاحسان کے لیے نئے ہیں۔ اس بزم عرفان میں ان کی عرفانی شرکت پر ہم ان کے شکر گذار ہیں۔ امید کہ یہ سلسلہ دراز ہوگا اور ہم طالبین پروفیسر صاحب کی افکار وتحقیقات سے مستقبل میں بھی مستفید ہوتے رہیں گے۔

پروفیسر الطاف احمد اعظمی اس مرتبہ بیعت وارادت، قرآن مجید اور آثار کی روشنی میں کے عنوان سے شریک بزم ہیں- پروفیسر صاحب کچھ عجیب قسم کے تصوف نواز ہیں- شروع سے آخر تک صوفیہ کے یہاں مروج بیعت کے معنی ومفہوم کی تردید وتشکیک فرما رہے ہیں اور تصوف کو فکر وعمل ہر دو

اعتبار سے بے اعتدالی اور غلو کا شکار بتا رہے ہیں اور بالآخر یہ کہتے ہوئے بات ختم کر رہے ہیں:

اگر اس غلو کی اصلاح کر دی جائے تو پھر تصوف تزکیۂ باطن میں ایک مفید ذریعہ ثابت ہوگا"۔

حضور والا! جب بقول آپ کے "تصوف کے فکر و عمل دونوں میں بے اعتدالی پائی جاتی ہے یعنی غلو۔ اس بے اعتدالی سے نہ تو اس کا تصور زہد و عبادت محفوظ ہے اور نہ ہی تصور فقر و اخلاق ،حتیٰ کہ توحید کے باب میں بھی افراط موجود ہے یعنی تصور شیخ وولایت اور یہی غلو بیعت ارادت کے آداب و رسوم میں دخیل ہے"۔ یہ تو ع

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

کا معاملہ ہو گیا!! اب کس کس مقام سے اس بے اعتدالی اور غلو کو دور کیا جائے کہ یہ آپ کی نظر میں تزکیۂ باطن کے قابل ہو سکے؟

پروفیسر صاحب نے ایک مقام پر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی ایک عبارت نقل کر کے اس پر ریمارک لگایا ہے۔ پہلے شاہ صاحب کی عبارت ملاحظہ ہو:

وکانت بیعة الاسلام متروکة فی زمن الخلفاء، اما فی زمن الراشدین منهم فلأن دخول الناس فی الاسلام فی ایامهم کان غالبا بالقهر و السیف، لا بالتالیف و اظهار البرهان و لا طوعا و رغبة۔

(خلفا کے زمانے میں بیعت اسلام متروک ہو گئی تھی، جہاں تک خلفاے راشدین کے زمانے کی بات ہے تو ان کے زمانے میں اس وجہ سے کہ لوگ اکثر و بیشتر تلوار اور قہر کے سبب اسلام میں داخل ہو رہے تھے نہ کہ تالیف قلب اور اظہار دلائل کی وجہ سے، اور نہ ہی اپنی رضا اور رغبت سے۔)

اس پر پروفیسر صاحب نے فرمایا:

شاہ صاحب کا یہ بیان تاریخی اعتبار سے غلط اور مذہبی لحاظ سے افسوس ناک ہے۔

واضح رہے کہ یہاں شاہ صاحب کا مقصود فتوحات و غزوات کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ یہ خلفاے راشدین کے زمانے میں بکثرت رونما ہوئے جو بہت سے لوگوں کے اسلام میں داخل ہونے کا سبب بنے۔ **لا اکراہ فی الدین** (البقرۃ:۲۵۶) نص صریح موجود ہے۔ لہٰذا اس مقام پر نہ تو خلفاے راشدین سے جبر و اکراہ متصور ہے اور نہ ہی شاہ صاحب کی یہ مراد ہے۔

بیت القصید کے طور پر شامل مولانا ذیشان احمد مصباحی کا مضمون بیعت و ارادت سے متعلق چند شبہات اور ان کا ازالہ در اصل تصوف و صوفیہ پر وارد ہونے والے چند شبہات کا ازالہ ہے، جو

بالعموم مصلحین تصوف یا معاندین تصوف کی طرف سے اکثر وارد ہوتے رہتے ہیں- یہ مضمون منطقی ترتیب پر مرتب ہے اور دعوت تفہیم دیتا ہے- اولاً ۵ مقدمات ہیں، پھر بالعموم بیعت وارادت سے متعلق اٹھنے والے ۱۰ شبہات ہیں، اس کے بعد ان شبہات کا ازالہ- ازالۂ شبہات میں آپ نے جو داد تحقیق دی ہے وہ بلاشبہ آپ کا امتیازی وصف ہے- ممکن ہے اس میں پروفیسر الطاف اعظمی صاحب کے لیے بھی بعض مقاماتِ تفکر نکل سکیں، ویسے یہ بھی ممکن ہے کہ اس بار بھی ان کو ذیشان صاحب کی تحریر میں بدترین یا کم ترین مغالطہ نظر آجائے، جیسا کہ انھیں گذشتہ شمارے میں مولانا کے اداریے میں نظر آیا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے پروفیسر صاحب کا مکتوب جو اِسی شمارے میں شامل ہے۔ افسوس کہ پروفیسر صاحب نے ہم کم یعلموں کے حق میں اس مغالطے کی وضاحت ضروری نہیں سمجھی، نتیجۃً ہم دوبارہ غور کر کے بھی اس مغالطے کو نہ سمجھ سکے۔ جو کچھ سمجھ میں آسکا وہ فقط یہ ہے کہ گذشتہ شمارے میں پروفیسر صاحب نے اپنے مکتوب میں غیر خدا کے لیے علم غیب کے قرآنی شواہد کو استثنائی مانا تھا۔ ذیشان صاحب نے اپنے اداریے میں اس پر یہ حاشیہ لگایا کہ علم غیب، غیر خدا کے حق میں اگر استثنائی طور پر بھی ثابت ہو تو کم از کم انبیا اور اولیا کے حق میں اس کا عقیدہ کفر یا شرک تو نہیں ٹھہرتا۔ اس کے علاوہ مولانا نے یہ بھی کہا تھا کہ دراصل علم غیب کا اختلاف لفظی اختلاف ہے اور یہ بات سمجھ میں بھی آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے منکرین جس مفہوم میں اسے کفر یا شرک کہتے ہیں، اس کے قائلین اس مفہوم میں اس کے قائل نہیں ہیں اور اس کے قائلین جس مفہوم میں اس کے انکار کو کفر کہتے ہیں، اس کے منکرین اس مفہوم میں اس کے منکر نہیں ہیں۔ لیکن ہمیں یہ نہیں سمجھ میں آیا کہ ذیشان صاحب نے اس میں مغالطہ کیا کر دیا جس کی شکایت کرتے ہوئے پروفیسر موصوف کو یہ لکھنا پڑا:

> اللہ کا اپنے رسولوں کو غیب پر مطلع فرمانا اور ان کا بالذات عالم الغیب ہونا، دو مختلف چیز ہیں۔ پہلی چیز کار رسالت کی انجام دہی کے لیے تقریباً جملہ رسولوں کو حاصل تھی اور ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس وصف سے بخوبی بہرہ ور تھے۔ لیکن بالذات عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ ہے، اس کے سوا کسی کو بھی اس طرح کا علم حاصل نہیں ہے۔

غالباً پروفیسر صاحب کو یہ مغالطہ ہوا کہ ذیشان صاحب خدانخواستہ نبی کریم ﷺ کو بالذات عالم الغیب مانتے ہیں۔ حالاں کہ انھوں نے ایسی کوئی بات لکھی بھی نہیں ہے۔ بہر کیف! ہم پروفیسر صاحب کو یقین دلاتے ہیں کہ آپ کا اور ذیشان صاحب کا اختلاف رائے صرف لفظی بن کر رہ گیا ہے۔ وہ پیغمبر علیہ السلام کے لیے اسی بالواسطہ علم غیب کے قائل ہیں جس کے آپ قائل ہیں اور علم غیب بالذات کو وہ بھی فقط خاصۂ الٰہی سمجھتے ہیں، جیسا آپ سمجھتے ہیں اور جس کے رد کے لیے آپ نے قرآنی شواہد پیش کیے ہیں۔ رہی یہ بات کہ اس علم کو علم غیب کہا جائے یا نہ کہا جائے،

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر لفظ عالم الغیب کا اطلاق کیسا ہے اور جو علم آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ملا ہے وہ کیا کیا ہے اور اس کی مقدار کیا ہے، تو یہ سوالات ضرور مختلف فیہ ہیں، جن کی وضاحت کا یہ موقع نہیں۔

....

آخر میں اپنے تمام معاونین کا شکریہ واجب ہے جن کے دم قدم سے یہ علمی بہار قائم ہے۔ خصوصاً ہم حضرت داعی اسلام کی درازی عمر اور صحت و عافیت کے لیے بارگاہ الٰہی میں ملتجی ہیں، جو اس مشن کی روح ہیں۔ اپنے تمام ادارتی احباب کا شکریہ جو تلاش علم اور اشاعت علم میں شب و روز سرگرداں رہتے ہیں۔ مقالہ نگاروں کا شکریہ بھی ضروری ہے کہ وہ ہیں تو ہم ہیں۔ افسوس اس بار بھی قارئین الاحسان کو مولانا ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی کی کمی محسوس ہوگی۔ اہل علم اور ارباب ذوق سے گزارش ہے کہ اس شمارے پر اپنے گراں قدر تاثرات اور مجلّے کی بہتری کے لیے مشوروں سے ہمیں ضرور نوازیں۔ خیال رہے کہ اگلا شمارہ حضرت مخدوم شیخ سعد خیرآبادی اور آپ کی تصنیف لطیف مجمع السلوک کے حوالے سے ہوگا۔ ہمیں اس سلسلے میں اہل علم کے تعاون کا شدت سے انتظار رہے گا۔

حسن سعید صفوی

تذکیر

شیخ قطب الدین دمشقی قدس سرہ
شیخ سعد الدین خیر آبادی قدس سرہ

تعلیم کتاب وسنت کی اہمیت اور مرشد کی ضرورت

هٰذا العِلْمُ الرَّاجِحُ الَّذِیْ بِهٖ یَصِحُّ مَعَارِفُهٗ وَعَمَلُهُ الصَّالِحُ هُوَ فِي كِتَابِ اللهِ تَعَالٰی، فَإِنَّ الْقُرْآنَ هُوَ الإِمَامُ فِي الاعْتِقَادِ وَالإِیْمَانِ وَالتَّوْحِیْدِ وَالمَعْرِفَةِ وَالأَعْمَالِ وَ الأَحْوَالِ، قَالَ اللهُ تَعَالٰی: (وَالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ) (فاطر: ۳۱)، وقال الله تعالٰی: (اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ) (الاعراف: ۳)

وہ علم راجح ونافع جس سے بندے کے معارف اوراس کے نیک اعمال میں صحت پیدا ہوتی ہے، وہ کتاب الٰہی، یعنی قرآن پاک میں ہے، اس لیے کہ قرآن ہی اعتقاد، ایمان، توحید، معرفت، اعمال اوراحوال کے معاملے میں ہمارا پیشوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ہم نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب قرآن میں سے جو وحی کی ہے وہ حق ہے، اور وہ اس سے پہلے والی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے۔ رب تعالیٰ نے یہ بھی ارشاد فرمایا: اس کی پیروی کرو جو تمہارے پروردگار کی جانب سے تمہاری طرف اتارا گیا ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ قرآن کی پیروی کرو اور قرآن سے الگ ہو کر کوئی کام نہ کرو۔ اس میں خوف وانذار بھی ہے اور نصیحت بھی ہے۔ اتباع قرآن دراصل، حقیقت ایمان اور توحید ومعرفت کے ادراک، تمام احکام قرآنی کی پیروی، تمام ممنوعات سے گریز، قرآن کی جانب سے کیے گئے تمام وعدوں کی طرف رغبت رکھنے اوراس کی تمام وعیدوں سے خوف رکھنے کا نام ہے۔ اس میں پچھلی قوموں کا بیان ہے، گزرے ہوئے لوگوں کے احوال اور آنے والی باتوں کا تذکرہ ہے، جیسا کہ قرآن مبین کا اعلان ہے: (وَ لَا رَطْبٍ وَّ لَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ) (الانعام: ۵۹)

ہر خشک وتر اس واضح کتاب میں مذکور ہے۔

دوسرے مقام پر فرمایا: (وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا) (آل عمران: ۱۰۳) یعنی قرآن کو مضبوطی سے پکڑلو اور افتراق میں مت رہو، فرقہ فرقہ مت بن جاؤ۔

حدیث میں آیا ہے: إِنَّ هٰذَا القُرْآنَ هُوَ الحَبْلُ المَتِيْنُ وَالنُّوْرُ المُبِيْنُ وَالشِّفَاءُ النَّافِعُ وَعِصْمَةٌ لِمَنْ تَمَسَّكَ بِهِ وَنَجَاةٌ لِمَنْ تَبِعَهُ یہ قرآن مضبوط رسی ہے، نور مبین ہے، شفا اور نفع بخش ہے، جو اس کو مضبوطی سے تھام لے گا اس کے لیے لغزشوں سے حفاظت کا ذریعہ ہے اور جو اس کی پیروی کرے گا اس کے لیے نجات کا سامان ہے۔ (۱)

وَكَذَا الأَخْبَارُ، قَالَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: إِنِّيْ تَرَكْتُ فِيْكُمْ مَاإِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِ لَنْ تَضِلُّوا، كِتَابَ اللهِ وَسُنَّتِيْ (۲)

ایسے ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث بھی ان تمام امور میں پیشوا ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں نے تمہارے درمیان ایسی چیز چھوڑی ہے کہ اگر تم اس کو مضبوطی سے تھامے رہو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے اور وہ دو چیزیں قرآن اور سنت ہیں۔ (۳) مطلب یہ ہے کہ یہ تمام باتیں جو ذکر کی گئی ہیں اگر قرآن نہ اترتا اور اخبار واحادیث وارد نہ ہوتیں تو ہرگز نہ سمجھ میں آتیں اور نہ معلوم ہوتیں۔ اس لیے جو شخص قرآن واحادیث کو مضبوطی سے پکڑے گا وہ راہ حق پالے گا؛ کیوں کہ

---

(۱) سنن الدارمي، کتاب فضل القرآن (۴/ ۲۰۹۰، ح: ۳۳۵۸) مسند ابن ابی شیبہ (۱/ ۲۵۱، ح: ۳۷۶) مصنف عبد الرزاق (۳/ ۳۷۵، ح: ۶۰۱۷)

(۲) الرسالۃ المکیۃ اور مجمع السلوک کے تمام مخطوطوں میں ''عِتْرَتِيْ'' کا لفظ ہے لیکن شارح قدس سرہ نے ''سُنَّتِيْ'' کے لحاظ سے ترجمہ فرمایا ہے، اسی لیے متن میں حدیث کے الفاظ کو ان کے موافق ''سُنَّتِيْ'' کر دیا گیا ہے۔ ہاں شرح میں ''عِتْرَتِيْ'' و ''سُنَّتِيْ'' کے درمیان تطبیق دیتے ہوئے عالمانہ و عارفانہ شرح فرمائی ہے۔ خیال رہے کہ ''عِتْرَتِيْ'' کے معنی کو بعض لوگوں نے حسنی و حسینی سادات کرام کے ساتھ خاص رکھا ہے جب کہ بعض علما نے اس میں عرفا و مشائخ کو بھی شامل مانا ہے اور یہی زیادہ صحیح لگتا ہے، کیوں کہ انبیا و اولیا کی وراثت علم و عرفان الٰہی کی وراثت ہے نہ کہ دراہم و دنانیر یا حسب و نسب کی۔

(۳) سنن الترمذي، ابواب المناقب، باب مناقب اہل النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (۵/ ۶۶۲، ح: ۳۷۸۶) بہ الفاظ: : يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي تَرَكْتُ فِيكُمْ مَا إِنْ أَخَذْتُمْ بِهِ لَنْ تَضِلُّوا: كِتَابَ اللهِ، وَعِتْرَتِي أَهْلَ بَيْتِي '' وصحیح مسلم، تاب الفضائل، باب من فضائل علي بن ابي طالب (۴/ ۱۸۷۳، ح: ۲۴۰۸) اوران کے علاوہ دوسری کتب احادیث میں ''عِتْرَتِيْ'' کے الفاظ ہیں جب کہ بعض کتب احادیث میں ''سُنَّتِيْ'' کے الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں جیسے: بیہقی/سنن (۱۰/ ۱۱۴، ح: ۲۰۱۲۴)، حاکم/مستدرک (۱/ ۱۷۲، ح: ۳۱۹)، دارقطنی/سنن (۴/ ۲۴۵) وغیرہ

قرآن وسنت کو چھوڑ کر جو بھی دوسری راہ اختیار کرے گا وہ ہدایت نہیں ہوگی، گم رہی ہوگی۔

وَمَنْ لَمْ يَبْلُغْ هٰذِهِ الرُّتْبَةَ فَلَابُدَّلَهُ مِنْ شَيْخٍ كَامِلٍ يَدُلُّهُ عَلَى الطَّرِيْقِ وَيُرْشِدُهُ إِلَى اللهِ تَعَالٰى

جو شخص اس مرتبے تک نہیں پہنچا ہو کہ وہ قرآن وحدیث سے براہ راست رشد وہدایت حاصل کر سکے تو اس کے لیے ایک شیخ کامل ضروری ہے، جو اسے مولیٰ تعالیٰ کی راہ دکھائے، طریقت وحقیقت کی طرف اس کی رہنمائی کرے اور حق تعالیٰ کی جانب رہبری کرے، جو سراسر مشاہدۂ انوار کا نام ہے۔

مَنْ لَاشَيْخَ لَهُ فَالشَّيْطَانُ شَيْخُهُ کا مفہوم

بعض مشائخ نے فرمایا ہے کہ اس کلام سے اشارہ یہ ملتا ہے کہ جس کو قرآن وحدیث سے رشد وہدایت حاصل ہو جائے اسے کسی شیخ کی پیروی کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اگر اسی پر اکتفا کرلے تو کافی ہوگا اور صوفیہ کا یہ قول: مَنْ لَاشَيْخَ لَهُ فَالشَّيْطَانُ شَيْخُهُ (جس کا کوئی پیر نہیں اس کا پیر شیطان ہے) ان سالکین کے بارے میں ہے جو قرآن واحادیث کے لطائف سے محروم ہیں۔

میں کہتا ہوں ہاں کیوں نہیں! معاملہ ایسا ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ کسی شخص کو بغیر کسی مرشد کی پیروی کے شایان شان رشد وہدایت عطا فرمادے، بلکہ وہ تو اس بات پر بھی قادر ہے کہ قرآن وحدیث کے وسیلے کے بغیر ہی کسی کو اعلیٰ مقام تک پہنچادے۔ وہ مالک الملک ہے، اپنی ملکیت میں جیسے چاہے تصرف فرمائے۔ لیکن یہ نوادرات میں سے ہے، اگرچہ ممکن ہے اور خطرات سے بھی خالی نہیں ہے۔

دوسرے یہ کہ ایسا شخص دوسروں کا مرشد نہیں بن سکتا۔ اس کارگہِ حکمت میں کابراً عن کابرٍ یہی سلسلہ اور طریقہ چلا آرہا ہے کہ سب نے شیخ کامل کو اختیار کیا۔ شیخ کامل کی پیروی کے بغیر توحید یقینی، معرفت شہودی، علم باطن، علم احوال، مکاشفہ اور مشاہدہ جن کا تعلق حضوریٔ شیخ اور پیر کی تربیت سے ہے، اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتے جب تک کہ کسی ایسے شیخ کامل کی پیروی نہ کی جائے جو اس راہ سے واقف اور دیدہ ور ہو۔

اے عزیز! علم تصوف کوئی حسی چیز نہیں ہے کہ آیات واحادیث کے پڑھ لینے سے حاصل ہو جائے گا، جب تک بندہ راہ تصوف سے آشنا اور صاحب بصیرت شیخ کامل کی پیروی نہیں کرے گا اس وقت تک وہ اس مقصود کامل تک پہنچ نہ سکے گا، جہاں کاملین پہنچے ہیں۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

روشن تر از آفتاب باید راہی   تا بشناسد مزاج ہر سودائی

(سالک کو آفتاب سے بھی زیادہ روشن ہونا چاہیے تاکہ ہر عاشق کے مزاج کو وہ پہچان سکے۔)

مرشد کے بغیر چارہ نہیں

اس فقیر کے پیر دست گیر قدس سرہ نے فرمایا کہ شیخ الاسلام خواجہ نصیرالدین دہلوی کے عہد میں ایک بزرگ نے ترک دنیا کر کے عبادت الٰہی میں مشغولیت اختیار کر لی۔ عوارف المعارف اور مشکوٰۃ المصابیح کو اپنے ساتھ رکھ لیا اور دونوں کا مطالعہ کرنے لگا۔ جو کچھ اس کتاب میں لکھا تھا اس پر عمل کرتا یہاں تک کہ کچھ زمانہ گزر گیا، لیکن مقصود اصلی اور معرفت حقیقی تک اس کو رسائی نہیں حاصل ہو سکی۔ اس کے بعد اس بزرگ نے حضرت شیخ الاسلام خواجہ نصیرالدین قدس سرہ کی جانب توجہ کی۔ حضرت کی بارگاہ میں پہنچے اور یہ شعر پڑھا:

من کہ در کوے بتاں پا نہ نہادم ہرگز   چوں نہ دیدم رخ تو سر نہ نہادم ہرگز

(میں ہرگز حسینوں کی گلی میں قدم نہیں رکھوں گا، جب تک تیرے رخ زیبا کا دیدار نہیں کرلوں سر نہیں رکھوں گا۔)

پھر وہ مرید ہو گئے اور قطب جہاں کی اقتدا اور پیروی میں لگ گئے۔ چند روز میں ہی شیخ الاسلام نے آں بزرگ کو ذکر خفی کے مقام تک پہنچا کر واصلین و مقربین کے زمرے میں شامل کرا دیا۔

خواجہ ابو علی دقاق فرماتے ہیں: ہر وہ درخت جو خودرو ہوگا، اس میں پتیاں تو ہوں گی لیکن اس میں پھل نہیں آئے گا اور اگر پھل آیا بھی تو نہایت بدمزہ ہوگا۔ ایسے ہی وہ سالک جس کا کوئی پیر اور استاد نہ ہو، وہ ہوا پرست ہے۔ اسے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

شیخ کا قلب تجلیات ربانی کا آئینہ ہے

رئیس درویشاں، محتسب عارفاں شیخ قوام الدین لکھنوی قدس سرہ فرماتے ہیں: شیخ کا دل صیقل شدہ آئینے کی طرح ہے جس پر حضرت رب العزت کی جانب سے فیض اترتا ہے۔ وہ آئینہ، ذات وصفات اور اسماو افعال الٰہیہ کی تجلیوں سے چمک اٹھتا ہے اور ہر لمحہ نازل ہونے والے غیبی لطائف سے آراستہ ہو جاتا ہے۔ جب مرید صادق، کامل ارادت کے ساتھ اپنے دل کے آبگینے کو ایسے آئینے کے سامنے کرتا ہے تو شیخ کے آئینۂ دل سے مرید کے آئینۂ دل پر تجلی کا انعکاس ہوتا ہے اور اس طرح بغیر کسی کسب اور بغیر کسی عمل کے، غیریت کی کدورت سے پاک اور طبیعت کی آلودگیوں سے صاف مرید کے آئینۂ دل پر ان تمام معنوی کمالات کا فیضان ہو جاتا ہے اور مرید کی استعداد کے مطابق ایک لمحے میں اس کو وہ معنوی کمالات حاصل ہو جاتے ہیں جو طویل عرصے کی ریاضت و مجاہدے سے بھی حاصل نہیں ہوتے۔ اس چیز کو طالب علم ایک مثال کے ذریعے ہی سمجھ سکتا ہے۔

دو نقاشوں کا واقعہ

رشف النصائح میں شیخ الشیوخ نے فرمایا ہے کہ دو نقاش ایک بادشاہ کی خدمت میں حاضر

ہوئے۔ ان میں ایک ہندوستانی تھا اور دوسرا چینی۔ دونوں نے نقاشی کا دعوی کیا اور نقاشی میں کمال رکھنے کے تعلق سے ایک دوسرے پر برتری کا اظہار کیا۔ بادشاہ کے حکم سے دونوں نقاشوں کو ایک کمرے میں بند کر دیا گیا اور دونوں کے بیچ ایک پردہ ڈال دیا گیا۔ چینی نقاش رنگا رنگ نقاشی میں مشغول ہو گیا اور ہندوستانی نقاش صرف اس دیوار کی صفائی میں مشغول ہو گیا جو چینی نقاش کی نقش شدہ دیوار کے بالمقابل تھی۔ ایک طویل مدت اور بڑی مشقت کے بعد جب وہ دونوں نقاشی سے فارغ ہو گئے تو بادشاہ کو خبر کی گئی کہ اب نقاشی کو دیکھنے کا وقت آ گیا ہے۔ بادشاہ نے اپنا مبارک قدم اس کمرے کے اندر ڈالا اور درمیان سے پردہ اٹھانے کا حکم دیا۔ جب پردہ اٹھا دیا گیا تو چینی نقاش کے تمام نقوش اس ہندوستانی نقاش کی دیوار پر منعکس ہو کر زیادہ صاف اور زیادہ لطیف معلوم ہونے لگے۔ یہ دیکھ کر بادشاہ نے ہندوستانی نقاش کو زیادہ خلعت و انعام سے نوازا۔

صرف کتب تصوف کا مطالعہ نا کافی ہے

یہ ذہن نشین کر لو کہ تزکیہ و استعداد سے آراستہ مرید کے دل پر شیخ کے دل سے کمالات الٰہیہ کا اسی طرح انعکاس ہوتا ہے۔ یہ سب کتابوں کے مطالعے سے ہاتھ نہیں آتا۔ جس کا کوئی مرشد برحق نہیں ہے، اگر وہ صوفیہ کی کتابوں کے مطالعے میں مشغول ہو گیا اور اسی پر قناعت کر لی، تو وہ اس شخص کی طرح ہے جو علم کی تلاش و جستجو میں ہے لیکن کسی ماہر حکیم کی شاگردی کے بغیر ہی وہ یقین رکھے ہوئے ہے کہ وہ غلطی کا شکار نہیں ہوگا، جب کہ نہ وہ مرض پہچانتا ہے اور نہ دوا کی مقدار و کیفیت سے واقف ہے۔ ایسے حکیم کے ہاتھوں بیمار صحت یاب ہونے کے بجائے ہلاک ہو جائے گا۔

اس عالم حکمت میں پیر سے گریز کی کوئی راہ نہیں۔ وہ لوگ نادان ہیں جو کہتے ہیں کہ پیر کی کیا ضرورت ہے، کتاب و سنت پر عمل کافی ہے۔ کتاب و سنت کے ذریعے نفس کا علاج ہر شخص نہیں کر سکتا اور نہ نفس کے امراض کو پہچان سکتا ہے، اگر چہ کلام الٰہی انواع و اقسام کی حکمتوں سے پر ہے، لیکن ایک حکیم کے سوا دوسرا کوئی نہیں جان سکتا کہ کون سی دوا کس مرض کے لائق ہے۔

اے عزیز! بعض مریدین ابرار کا مقام رکھتے ہیں، بعض مقربین کا، بعض اپنے آپ پر ظلم کرنے والے ہیں اور بعض مریدی کے دائرے سے باہر ہیں، اگر چہ اپنے گمان فاسد میں وہ خود کو خلیفہ اور شیخ سمجھے ہوئے ہیں۔ اس لیے جب تک کسی ایسے شیخ کامل کی صحبت نہ اختیار کی جائے جو اللہ کا خاص ولی ہو، جو فانی فی اللہ، قائم باللہ اور ظاہر باسماء و صفات اللہ ہو، محض کتابوں کے مطالعے سے یہ معنوی کمالات حاصل نہیں ہو سکتے۔

اے عزیز! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: (یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ ابْتَغُوْٓا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ) (المائدۃ: ۳۵) (اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کی جانب وسیلہ تلاش کرو) اور فقیروں

کا تقرب ہی وسیلہ ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: سِيْرُوْا سَبَقَ الْمُفَرِّدُوْنَ (۱) (جلدی چلو! اصحاب تفرید (۲) سبقت لے گئے۔)

اللہ کی جانب سیر کرنے والوں کے لیے ایک مرشد کی ضرورت ہے جو ارشاد و رہنمائی کا کام انجام دے اور یہ واضح بات ہے کہ بغیر رہبر کے راہ چلنا ممکن نہیں ہے۔ اسی لیے شب معراج میں سدرۃ المنتہیٰ تک جبریل علیہ السلام رسول کریم ﷺ کے رہبر تھے۔ آگے ایک دوسرا فرشتہ رفرف رہ نما بنا اور جب رفرف بھی اپنے مقام پر ٹھہر گیا تو تائید الٰہی آپ کی رہبر بنی۔ پھر واسطہ ختم ہو گیا اور قاب قوسین کے قرب تک پہنچ گئے۔

فضیلت فقر

اے جواں مرد! جب جبریل علیہ السلام بارگاہ رب العزت سے خزانوں کی چابیاں لے کر نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں آئے اور کہا کہ کوئی حساب و کتاب اور نقصان نہیں ہوگا، اسے آپ قبول فرمالیں تو آپ ﷺ کو تردد ہوا کہ قبول کریں یا نہ کریں۔ اس وقت آپ نے حضرت جبریل کی طرف دیکھا، جبریل نے زمین کی طرف دیکھا، تب نبی کریم ﷺ نے غنا کے بجائے فقر کو اختیار کر لیا اور فرمایا: اخْتَرْتُ أَنْ أَكُوْنَ نَبِيًّا فَقِيْرًا، أَجُوْعُ يَوْمًا وَأَشْبَعُ يَوْمًا (۳) (میں نے اس بات کو اختیار کیا کہ میں صاحب فقر نبی بن کر رہوں، ایک روز بھوکا رہوں اور ایک روز شکم سیر۔)

محققین فرماتے ہیں کہ حضرت جبریل، نبی کریم ﷺ کے معلم (۴) ہیں؛ کیوں کہ آپ نے ان کی تعلیم سے ہی فقر کو اختیار کیا اور زمین کی طرف دیکھنے سے اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ تواضع و خاکساری اختیار کی جائے۔ اس لیے کہ مال داری غرور اور سرکشی کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ اسی لیے حضرت جبریل نے عاجزی و فروتنی اور رب تعالیٰ کے محتاج رہنے کی طرف اشارہ کیا۔

اسی روایت کے سبب بزرگوں نے فرمایا ہے کہ مرید کی شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ وہ اشارے کو سمجھے، جس طرح نبی کریم ﷺ نے حضرت جبریل کے اشارے کو سمجھ لیا۔

امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے استاذ رسول کریم ﷺ تھے۔ انہوں نے بھی فقر کو اختیار کیا اور ان کے پاس جو کچھ تھا سب اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت

---

(۱) صحیح مسلم، تاب الذکر والدعاء والتوبہ والاستغفار، باب الحث علی ذکر اللہ تعالی (۴ / ۲۰۶۲، ح: ۲۶۷۶)

(۲) کثرت سے اللہ کو یاد کرنے والے

(۳) طبرانی/معجم الاوسط (۱/ ۱۸۹، ح: ۵۹۷) ہیثمی/مجمع الزوائد (۹/ ۱۲۵)

(۴) یعنی واسطہ و وسیلہ

میں ڈال دیا۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دریافت فرمایا: اپنے اہل وعیال کے لیے کیا چھوڑا؟ حضرت ابوبکر صدیق نے جواب دیا: ان کے لیے میں نے اللہ اور اس کے رسول کو چھوڑا ہے۔(۱)

یہی وجہ ہے کہ اکثر اولیائے محمدی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی میں جاہ وحشم ، مال و دولت کو قبول نہیں کیا اور جنھوں نے قبول کیا ہے ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا کی برکت سے قوت سلیمانی حاصل تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **مَامِنْ نَبِیٍّ إِلاّ وَ لَهُ نَظِیْرٌ فِي أُمَّتِیْ** (۲) ہر نبی کی نسبت ولایت رکھنے والے افراد میری امت میں ہوں گے۔بعض کم ہمت لوگ اپنی کم علمی کی وجہ سے سلیمانی نسبت رکھنے والے ان اولیائے کرام کو جو عطیات لیتے دیتے ہوئے بھی ان عطیات کی خواہش سے دور ہوتے ہیں، حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور تمام اولیائے محمدی کی نعمتیں پانے سے محروم رہ جاتے ہیں۔

اے کم علم! یہ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عزت افزائی ہے کہ ان کی امت کے اولیا گذشتہ امت کے انبیاے کرام کی طرح حق تعالیٰ کی کائنات میں تصرف فرماتے ہیں، مثلاً: وہ اذن الٰہی سے مردوں کو زندہ کرتے ہیں، مادرزاد اندھوں اور برص والوں کو شفا دیتے ہیں اور اللہ کی ملک میں تصرف کرتے ہیں۔

وَلِذٰلِکَ قَالُوْا: مَنْ لَاشَیْخَ لَهُ فَالشَّیْطَانُ شَیْخُهُ،وَالشَّیْخُ یَدُلُّهُ عَلَی المُجَاهَدَةِوَ الزُّهْدِ وَ التَّقْوٰی

اسی لیے صوفیہ نے فرمایا ہے کہ جس کا کوئی شیخ نہیں اس کا شیخ شیطان ہے۔

مرید کی تدریجی تربیت

شیخ، مرید سالک کی رہنمائی مجاہدے اور زہد وتقویٰ کی طرف کرتا ہے۔صوفیہ نے فرمایا ہے کہ اگر مرید مبتدی جاہل ہو تو شیخ کو چاہیے کہ اس کو پہلے شرعی احکام مثلاً طہارت اور نماز وروزہ سکھائے اور سیکھنے کا حکم دے۔اس کے بعد اسے رب تعالیٰ کی جانب رجوع کا طریقہ سکھائے اور اس کے لیے وہ راہ سلوک تجویز کرے جس کا طے کرنا اس کے لیے آسان ہو، یعنی جو بھی حکم دے اس کی استعداد وقابلیت کو مدنظر رکھتے ہوئے لطف ونرمی کے ساتھ حکم دے۔اگر اس کے ساتھ حرام مال کی آمیزش دیکھے تو اس کو ترک کرنے کا حکم دے اور اسے خود سے دور کردے۔

---

(۱) احمد بن حنبل/ فضائل الصحابہ، فضائل عمر بن الخطاب رضي اللہ عنہ (۱/ ۳۶۰، ح: ۵۲۷) ابن عساکر/ تاریخ دمشق، حرف العین (۳۰/ ۶۳)

(۲) معجم ابن الاعرابي (۱/ ۳۰۱، رقم: ۵۷۶)، ابن عساکر/ تاریخ دمشق (۶۶/ ۱۹۰)

مرید کے لیے بہترین چیز یہ ہے کہ اس کا کھانا، پینا اور اس کا لباس پاک وصاف ہو یعنی جو کھانا کھائے، جو پانی پیے اور جو کپڑا پہنے وہ حلال اور پاک ہو اور جو فرائض مثلاً روزہ، نماز، حج اور زکوٰۃ واجب ہونے کے بعد اس نے ترک کیے ہوں ان کی حتی الوسع ادائیگی کا حکم دے اور اگر مرید کا کسی سے کوئی معاملہ ہو تو اس سے کہے کہ صاحب معاملہ کو راضی کر لے۔ اس لیے کہ یہ جماعت اس بات کی قائل ہے کہ جس نے صاحب معاملہ کو راضی نہیں کیا اس کے لیے اس راہ طریقت کا کوئی معاملہ نہیں کھلے گا اور اگر مرید کے پاس ضرورت سے زیادہ مال پائے تو اسے لے کر اللہ کی راہ میں خرچ کر دے۔ ضرورت، حاجت اور حقوق کے درمیان فرق بعد میں معلوم ہو جائے گا۔

اس کے بعد شیخ مرید کو اس کے نفس سے واقف کرائے اور ریاضت کے ذریعے اس کے نفس کی تادیب کرے، تاکہ اس کے دل میں نفس کی جو محبت ہو وہ نکل جائے، ہوائے نفس کی مخالفت کا حکم دے، آرزوؤں کے حصول سے اس کو باز رکھے اور ہر طرح کی مشقتوں کا اس کو عادی بنادے۔ بزرگوں نے یہاں تک فرمایا ہے: **أَسَاسُ الْكُفْرِ قِيَامُكَ عَلٰى مُرَادِ نَفْسِكَ** کفر کی اساس و بنیاد یہ ہے کہ تم اپنے نفس کی ہر مراد پوری کرو۔

مرید کو تمام تلخیاں چکھائے، اوراد و وظائف اور نفلی روزوں کی پابندی کرائے، کیے ہوئے گناہوں پر پشیمانی کا احساس دلائے اور شرک و بت پرستی والی جو عادتیں ہیں، ان تمام عادتوں سے اس کو باہر نکالے، مثلاً یہ کہ اس کو کھردرے کپڑوں کی خواہش ہو یا نرم کپڑوں کی، اس طرح کی تمام عادتوں سے اس کو نجات دلائے اور اس کے خلاف حکم دے اور اگر مرید کو کھانے کی جانب رغبت رکھنے والا پائے تو کم کھانا اس کے لیے لازمی قرار دے دے اور مرید کو یہ حکم دے کہ لذیذ کھانے لا کر دوسروں کے سامنے لے جائے اور خود نہ کھائے اور اگر نیند میں رغبت رکھنے والا پائے تو اسے شب بیداری کی عادت ڈلوائے اور حکم دے کہ جب تک نیند کا غلبہ نہ ہو، نہ سوئے اور جہاں تک ہو سکے نیند کو دفع کرنے کی کوشش کرے اور اگر اسے زیادہ غصہ والا پائے تو حلم و بردباری اور سکوت و خاموشی کا حکم دے اور کسی بداخلاق کو اس پر مسلط کر دے، تاکہ اسے بردباری کی عادت پڑ جائے اور اگر اسے کپڑا اور بدن کی لطافت میں رغبت رکھنے والا پائے تو اس کو گھر اور ناپاک جگہوں کی جاروب کشی کا حکم دے، مطبخ اور دھوئیں والی جگہوں کو صاف کرائے اور نرمی اور مہربانی کے ساتھ اسی طرح کی دوسری چیزوں کا حکم دے جس میں اس کے نفس کی مخالفت کا پہلو ہو۔

عارف کامل جو اس راہ سے گزر چکا ہوتا ہے، اس کے سوا کوئی بھی شخص نفس کی مخالفت کرنے والی چیزوں سے واقف نہیں ہوتا۔ اسی لیے بزرگوں نے فرمایا ہے کہ عارفان الٰہی دلوں کے طبیب ہوتے ہیں۔ جب طبیب خود ہی بیماری کے اسباب سے ناواقف ہوگا تو وہ اپنے علاج کے ذریعے بیمار کو

ہلاک کردے گا؛ کیوں کہ وہ اس کے مرض سے ناواقف ہوگا، خطرات سے آگاہ نہیں ہوگا اور بیماری کے خلاف دوا دے گا؛ کیوں کہ ہر بیمار کی الگ دوا ہوتی ہے، ہر جنون کا الگ معجون ہوتا ہے اور ہر مریض کے خواص بھی مختلف ہوتے ہیں، جسے ماہر اطبا ہی جانتے ہیں، جاہل اطبا اس سے واقف نہیں ہوتے۔

علم بہر کیف ضروری ہے

وَ كَيْفَ مَا كَانَ لَا بُدَّ لَهُ مِنْ سِرَاجِ الْعِلْمِ وَ مِشْعَلَتِهِ كَيْ لَا يَتَخَبَّطَ فِي الطَّرِيْقِ فَيَخْرُجَ شَاطِحًا غَالِطًا، فَإِنَّ بِنُوْرِ الْعِلْمِ ضِيَاءَ الْقَلْبِ وَ بِذَهَابِهِ عَمَاهُ، قَالَ اللهُ تَعَالٰى: (وَ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَ اَضَلُّ سَبِيْلًا) (الاسراء:۷۲)

بہر کیف! مرید طالب کے لے چراغ علم اور مشعل علم کے بغیر کوئی چارہ نہیں، تا کہ وہ راستے میں ادھر ادھر ہاتھ پاؤں نہ مارے اور راہ سلوک میں راستہ سے بھٹک نہ جائے اور پھر ایسا نہ ہو کہ وہ بے معنیٰ باتیں کرنے لگے اور غلط روی کا شکار ہو جائے۔ اس لیے یقینی طور پر سالک کے لیے علم ضروری ہے؛ کیوں کہ نور علم سے ہی دل کو روشنی ملتی ہے۔ علم ہدایت کی طرف لے جاتا ہے۔ حق و باطل، خیر و شر اور الہام و وسوسہ کے مابین فرق کرنے کی صلاحیت عطا کرتا ہے اور علم سے محرومی کی وجہ سے دل کور چشم ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ جہالت وہ چیز ہے جو گم رہی کی طرف لے جاتی ہے اور حق و باطل، خیر و شر اور الہام و وسوسہ کے مابین فرق کرنے کی قوت سلب کر لیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جو شخص اس دنیا میں اندھا ہے، جس کے پاس علم و ہدایت نہیں ہے، وہ آخرت میں بھی کور چشم اور گمراہ ترین ہوگا۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

آں کس کہ راہ یافت بدنیا و رہ گرفت
بر پل صراط نیک خراماں رود شتاب
واں کس کہ راہ کرد غلط اندریں سرائے
در آخرت نیابد او راہِ ہیچ باب

(۱) جس کو اس دنیا میں راہ مل گئی اور وہ اس راہ پر گام زن ہو گیا، وہ پل صراط پر بھی خراماں خراماں گزر جائے گا۔

(۲) اور جس شخص نے اس دنیا میں راہ کھو دی، اسے آخرت میں کسی دروازے تک پہنچنے کی راہ نہیں ملے گی۔

حضرت ابو علی سے منقول ہے کہ علم؛ جہالت کی موت کے بعد دل کی زندگی ہے اور ظلمت کفر کے زوال کے بعد چشم یقین کی روشنی ہے۔ جس شخص کے دل میں معرفت کی زندگی نہیں ہے

اس کو جہالت کی موت آچکی ہے اور جو شخص علم شریعت سے ناواقف ہے وہ نادانی میں پڑا ہوا بیمار ہے۔ کافروں کا دل مردہ ہے؛ کیوں کہ وہ رب تعالیٰ کی معرفت سے محروم ہیں اور غافلوں کا دل بیمار ہے؛ کیوں کہ وہ احکام سے ناواقف ہیں۔

اے عزیز! بعض صوفیہ نے فرمایا ہے کہ سالک کو عالم ہونا چاہیے، اگر عالم نہ ہو تو کسی صالح عالم اور شیخ کامل کی صحبت میں رہے، اگر اس کے پاس علم نہیں ہوگا تو شیخ کی صحبت کافی ہوگی، البتہ مصنف رسالہ مکیہ علامہ قطب الدین دمشقی کے کلام سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ شیخ کی صحبت میں ہو یا نہ ہو، علم بہر حال ضروری ہے۔ یہی بات میرے نزدیک بھی درست ہے۔ تم نے سنا ہوگا، کہا جاتا ہے: روزی بھی ہونی چاہیے اور نیکوں کی خوشبو بھی ہونی چاہیے۔(۱)

بے علم سالک شیخ کے لیے بھی باعث رنج ہے

اے عزیز! بے علم سالک اگرچہ محبت شیخ میں کامل ہو، جب چند روز تک ہر مسئلے اور ہر واقعے میں سوال کرے گا تو اپنے شیخ کو تکلیف پہنچائے گا، بشریت بہر حال باقی ہے، کیا تعجب کہ کسی وقت اس کا شیخ اس سے آزردہ ہو جائے، بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شیخ پر کوئی خاص حالت طاری ہو اور بے علم کو چوں کہ ہر وقت سوال کی حاجت ہوتی ہے لہٰذا وہ آئے گا اور شیخ کی حالت سے بے خبر ہو کر نامناسب مقام پر سوال کر کے اسے زحمت دے گا، ایسے میں کوئی تعجب نہیں کہ مرید کے سوال سے شیخ کو وہ تکلیف پہنچے جس کا ازالہ کوئی نہ کر سکے۔ اس لیے یقینی طور پر پہلے سالک تحصیل علم کرے پھر راہ سلوک میں قدم رکھے اور شیخ کامل کی صحبت اختیار کرے۔

مشائخ اہل علم گزرے ہیں

قَالَ أَبُوعَلِيٍ الرُّوْذبَارِیُ: كَانَ أُسْتَاذِیُ فِي التَّصَوُّفِ: الجُنَيْدُ، وَكَانَ أُسْتَاذِیُ فِي الفِقْهِ: أَبُو العَبَّاسِ بْنُ سُرَيْجٍ، وَكَانَ أُسْتَاذِیُ فِي النَّحْوِ وَاللُّغَةِ: الثَّعْلَبُ، وَكَانَ أُسْتَاذِي فِي حَدِيْثِ رَسُولِ اللهِ ﷺ: إِبْرَاهِيْمُ الحَرْبِيُ، وَلَا بُدَّ مِنْ ذٰلِکَ فِي اسْتِكْمَالِ النَّفْسِ۔

شیخ قطب الدین دمشقی قدس سرہٗ اپنے موقف پر دلیل پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مشائخ کبار اہل علم گزرے ہیں۔ وہ تمام علوم وفنون میں کامل رہے ہیں۔ شیخ ابوعلی روذباری نے فرمایا ہے کہ علم تصوف میں میرے استاد حضرت جنید بغدادی تھے، علم فقہ میں میرے استاذ شیخ ابوالعباس بن سریج، نحو ولغت میں امام ثعلب اور علم حدیث میں امام ابراہیم حربی تھے۔ اس سے

---

(۱) ''روزی باشد و بوی نیک بود''

معلوم ہوا کہ کمال نفس حاصل کرنے کے لیے ان علوم کی تحصیل کے بغیر سالک کے لیے کوئی چارہ نہیں ہے۔ان علوم سے آراستہ ہونے کے بعد ہی سالک مودب ومہذب ہوگا۔

میرے عزیز! غور کرو! تمام بڑے مشائخ اہل علم گزرے ہیں۔تصوف، تفسیر، حدیث، فقہ، نحو، صرف، لغت، معانی، بیان، بدیع اور کلام بلکہ علم منطق اور دیگر فنون میں بھی کامل گزرے ہیں۔

لوگ بیان کرتے ہیں کہ جس روز حضرت نظام الدین اولیا کا وصال ہوا، آپ کے سرہانے چند کتابیں رکھی ہوئی تھیں جن کا تعلق علم کلام سے تھا۔تعجب ہے کہ بعض جاہل صوفیہ تن آسانی کے لیے کہتے ہیں کہ علم کی کوئی ضرورت نہیں۔بعض لوگ کہتے ہیں کہ علم سلوک حاصل کرنا چاہیے، بقیہ دوسرے علوم محض قیل وقال ہیں۔(۱)

○○○

---

(۱) شیخ قطب الدین دمشقی قدس سرہ (۷۸۰ھ/ ۱۳۷۸ء) کی تصنیف الرسالۃ المکیہ کی شرح مخدوم شیخ سعدالدین خیرآبادی قدس سرہ (۹۲۲ھ/ ۱۵۱۶ء) نے مجمع السلوک والفوائد کے نام سے کی ہے، جس کا ترجمہ مولانا ضیاء الرحمٰن علیمی نے کیا ہے۔شاہ صفی اکیڈمی، خانقاہ عارفیہ، سید سراواں، الہ آباد نے ۲۰۱۶ء میں تحقیق وتخریج کے ساتھ اسے شائع کیا ہے۔(۱/ ۳۵۴-۳۶۲)

تحقیق و تنقید

تحریر: شیخ اسامہ محمود ازہری
ترجمہ: محمد شاہد رضا نجمی

محدثین کی سنیت اور صوفیت: ایک تحقیقی مطالعہ

[فاضل محقق علامہ شیخ اسامہ سید محمود ازہری کا شمار جامعہ ازہر کے ذی علم اور ممتاز اساتذہ میں ہوتا ہے۔ دہشت گردی اور شدت پسندی کے خلاف آپ کی کتاب **الحق المبین فی الرد علی من تلاعب بالدین** دنیا بھر میں مقبول ہوئی۔ سال گذشتہ ۲۵ اگست ۲۰۱۶ء کو گروزنی، چیچنیا میں منعقد بین الاقوامی اہل سنت کانفرنس میں آپ بھی دیگر شیوخ ازہر کے ساتھ شریک تھے۔ آپ نے اس میں اپنا وقیع مقالہ **عقیدۃ المحدثین و صلتھم بالتصوف** کے عنوان سے پیش کیا۔ اس مقالے کی اہمیت اور عالم گیریت کے پیش نظر اس کا اردو ترجمہ ہدیۂ قارئین ہے۔ یہ مقالہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ محدثین کے عقیدے اور ان کی سنیت سے متعلق ہے، جب کہ دوسرا حصہ تصوف اور اہل تصوف کے ساتھ ان کے تعلق اور والہانہ پن کے حوالے سے ہے۔ اس پورے مقالے کا مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ محدثین اہل سنت ہیں، اہل ضلال نہیں ہیں۔ نہ تو وہ عقیدے کے معاملے میں تشبیہ و تجسیم کے قائل ہیں اور نہ ہی تصوف دشمنی پر آمادہ ہیں، جیسا کہ ایک مخصوص حلقے میں شعوری طور پر اس خیال کی اشاعت کی کوششیں جاری ہیں۔ مترجم]

محدثین کے عقائد اور ان کی سنیت

"**لوامع الانوار البھیۃ وسواطع الاسرار الاثریۃ**" میں امام سفارینی کا یہ قول مذکور ہے کہ اہل سنت وجماعت اشاعرہ، ماتریدیہ اور محدثین ہیں۔ "**اتحاف السادۃ المتقین**" میں حافظ مرتضیٰ زبیدی کا قول ہے کہ اہلِ سنت وجماعت محدثین، صوفیہ، اشاعرہ اور ماتریدیہ میں منحصر

ہیں۔ امام آمدی، عضد الدین ایجی اور دیگر ائمہ کا بھی یہی موقف ہے۔ لیکن اس موقف میں غور وخوض اور فکر و تامل کی ضرورت ہے۔

ان کے علاوہ خود محدثین نے اپنی سندوں سے ''عقیدۂ اہلِ حدیث'' کے عنوان سے عقائد کی مستقل کتابیں اور رسائل تحریر کی ہیں۔ جیسے امام ابوبکر اسماعیلی کی ''**اعتقاد ائمۃ اھل الحدیث**''، حافظ ابوعثمان صابونی کی ''**اعتقاد السلف اصحاب الحدیث**''، امام ابوالقاسم لالکائی کی ''**شرح اعتقاد اھل السنۃ و الجماعۃ**'' اور ابوالفضل تمیمی اصفہانی کی ''**الحجۃ فی بیان المحجۃ**''۔ ان کے علاوہ کچھ ایسی کتابیں بھی ہیں جنھیں بعض محدثین نے اعتقادی مباحث پر مرتب کیا ہے۔ جیسے ابن خزیمہ کی ''**التوحید**''، ابویعلیٰ فراء کی ''**ابطال التاویلات**'' وغیرہ۔

بعض لوگوں کی طرف سے علما کی ان عبارتوں اور محدثین کی ان تالیفات سے چند شبہات پیدا کیے گئے:

(۱) ان عبارتوں اور تالیفات سے استدلال کر کے یہ وہم پیدا کرنے کی کوشش کی گئی کہ عقائد میں محدثین کا ایک خاص منہج ہے۔

(۲) اس پر بھی بہت زور صرف کیا گیا کہ اہل سنت و جماعت کے اعتقادات دو مختلف عقیدوں پر مشتمل ہیں۔ ایک تو اشاعرہ و ماتریدیہ کے عقائد ہیں اور دوسرے محدثین کے خاص عقائد۔ الگ الگ عقائد کے حامل ان دونوں جماعتوں کو ہی اہلِ سنت و جماعت کے نام سے جانا جاتا ہے۔

(۳) پھر عقیدۂ تشبیہ و تجسیم کو محدثین کے عقائد میں شامل کر کے یہ وہم بھی پیدا کیا گیا کہ محدثین ان غلط عقائد کے حامل تھے۔

(۴) اخیر میں یہ باور کرایا گیا کہ اہلِ سنت و جماعت کا اطلاق محدثین کے ان موہوم تجسیمی عقائد پر ہی ہوتا ہے اور اشاعرہ و ماتریدیہ اہلِ سنت سے خارج ہیں۔ اس طرح حقائق میں تبدیلی کر کے اشاعرہ و ماتریدیہ کو فرقہ ضالہ میں شمار کر دیا گیا۔

دراصل اس طرح کی حرکتوں کا مقصد یہ ہے کہ اہلِ سنت و جماعت کی اصطلاح پر تدریجاً قبضہ کر لیا جائے تا کہ محدثین کے عقائد میں عقیدۂ تشبیہ و تجسیم کو داخل کر دیا جائے۔ پھر آہستہ آہستہ اس اصطلاح کے دائرے کو اتنا تنگ کر دیا جائے کہ اشاعرہ و ماتریدیہ اس سے خارج ہو جائیں اور یہ اصطلاح انھیں محدثین کے عقیدے کے ساتھ خاص ہو جائے۔

ہم چاہتے ہیں کہ اس مقالے میں پوری امانت داری کے ساتھ محدثین کے عقائد کی حقیقت منکشف کر دی جائے اور باریک بینی کے ساتھ جمہور محدثین کے موقف کی وضاحت کر دی

جائے تا کہ کسی فریب اور وہم کے ذریعے کسی محدث کی جانب کوئی غلط عقیدہ منسوب نہ کیا جائے اور نہ یہ باور کرایا جائے کہ وہ ایسا عقیدہ رکھتا ہے۔

طویل غور وخوض کے بعد یہی درست معلوم ہوتا ہے کہ محدثین کے عقائد بعینہا وہی ہیں جو حضراتِ اشاعرہ وماتریدیہ کے عقائد ہیں اور جمہور محدثین وحفاظ بھی انھی عقائد کے حامل ہیں۔ محدثین کا کوئی خاص عقیدہ نہیں ہے اور ان کی جانب تشبیہ وتجسیم کی نسبت فحش خطا ہے۔

حدیث کی جن کتابوں اور رسائل سے محدثین کے لیے کسی خاص عقیدے کا وہم ہوتا ہے، ان کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم ان کتابوں اور رسائل کی ہے جن میں وہی عقائد مذکور ہیں جو اشاعرہ کے ہیں، البتہ محدثین نے ان کی ترتیب عقائد کی عام کتابوں سے الگ رکھی ہے اور ایمان واعتقاد کے اصولی مباحث کو جمع کرنے میں ایک خاص منہج اختیار کیا ہے، لیکن محدثین کی تصریحات اور اشارات اس حوالے سے موجود ہیں کہ متشابہ احادیث وآثار تفویض یا تاویل پر محمول ہیں۔ اس لیے ان کتابوں سے محدثین کے لیے کسی خاص عقیدے کا ثبوت نہیں ملتا، بلکہ ان عقائد کے تمام ابواب کی ترتیب میں ان کے ایک خاص طریقے اور منہج کا ثبوت ملتا ہے جو حضراتِ اشاعرہ کے طرزِ فہم کے مطابق ہے۔

دوسری قسم کی کتابیں بابِ عقائد میں محدثین کے تفردات پر دلالت کرتی ہیں اور ان کی طرف تشبیہ وتجسیم کی نسبت کا گمان پیدا کرتی ہیں۔ یہی وہ کتابیں ہیں جن پر اعتراض واشکال ہے اور یہی وہ عقائد ہیں جنھیں اہلِ سنت وجماعت کا حصہ بنانے کی کوشش کی جارہی ہے تا کہ اس بات کی راہ ہموار ہو جائے کہ اہلِ سنت وجماعت کی اصطلاح گروہِ محدثین میں منحصر ہے اور اشاعرہ وماتریدیہ اس سے خارج ہیں۔

لہٰذا ضروری ہے کہ اس طرح کی کتابوں کے مشمولات پر تحقیقی نظر ڈالی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ بعد میں علمائے امت نے کس طرح ان متشابہ احادیث کو سمجھا ہے اور ان کی فہم کے لیے کون سا مضبوط دقیق علمی میزان ومعیار متعین کیا ہے۔

میں یہاں امام ابن خزیمہ کی ''التوحید'' سے صرف ایک مثال پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ ابنِ خزیمہ فرماتے ہیں:

> ''جو اللہ رب العزت کے عرش پر مستوی ہونے کا اقرار نہ کرے وہ کافر اور حلال الدم ہے، اس کا مال مالِ غنیمت ہے۔''

حافظ ذہبی نے تشبیہ وتجسیم کا وہم پیدا کرنے والی احادیث کے تعلق سے ابن خزیمہ کے اس موقف پر ضروری تعاقب کیا ہے۔

"سیر اعلام النبلاء" میں فرماتے ہیں:

حق ہونے کے باوجود ابن خزیمہ کے کلام میں نقص ہے۔ متاخرین علما اسے برداشت نہیں کرسکتے۔ توحید کے تعلق سے ان کی ایک بڑی کتاب ہے۔ اس میں انھوں نے بھی حدیث صورت کی تاویل کی ہے، تو جس نے بعض صفات کی تاویل کی ہے اسے آپ معذور جانیے۔ اسلاف نے تاویل میں غور وخوض نہیں کیا، بلکہ آیات پر ایمان لائے، اس سے آگے بڑھنے کے بجائے ٹھہر گئے اور حقیقی علم اللہ عز وجل اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سپرد کردیا۔ اگر صحتِ ایمان اور اتباعِ حق کی کوشش کے باوجود اجتہاد میں خطا کرنے والے ہر شخص کو ہم مباح الدم اور بدعتی قرار دیں تو بہت کم ہی ائمہ اس سے محفوظ رہ پائیں گے۔ اللہ رب العزت تمام لوگوں پر اپنے احسان وکرم کے ذریعے رحم فرمائے۔(۱)

امام ابن خزیمہ کے اجتہاد اور ان کے مسلک پر امام ذہبی کا یہ تعاقب اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ محدثین کا عقیدہ صرف ابنِ خزیمہ کی کتاب سے ماخوذ نہیں مانا جائے گا، بلکہ محدثین کی تمام کتابوں کا مجموعی اعتبار ضروری ہے۔ تاکہ ہم ان کی کتابوں سے محدثین کے مقبول ومعروف عقائد معلوم کرسکیں۔ غور وخوض اور تحقیق وتدقیق سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ ان کے عقائد بھی اشاعرہ کے قواعد کے مطابق ہیں۔

حجۃ الاسلام ابو حامد غزالی نے "الصفات" نامی کتاب پر اور جو بھی کتابیں منہج کے لحاظ سے ابنِ خزیمہ کی کتاب "التوحید" کی طرح ہیں ان پر ایک نہایت ہی اصولی تعاقب کیا ہے۔ آپ نے اپنے اس تعاقب میں کتاب میں موجود اصول ومنہج کی خطا پر تنبیہ فرمائی ہے۔

آپ نے "الجام العوام" میں فرمایا:

"وہ لوگ توفیق سے محروم ہوگئے جنھوں نے متشابہ احادیث جمع کرنے کے لیے خاص طور سے کتاب تصنیف کی، ہر عضو کے حوالے سے ایک باب قائم کیا اور کہا: "باب فی اثبات الراس، باب فی الید" وغیرہ اور اس کا نام "کتاب الصفات" رکھا۔ دراصل یہ متفرق کلمات ہیں جو حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے متفرق اوقات میں مختلف قرائن کی موجودگی میں صادر ہوئے ہیں، ان قرائن سے ان احادیث کی صحیح اور درست فہم حاصل ہوتی ہے۔ جب انسانی صورت وخلقت کے انداز میں ان

---

(۱) سیر اعلام النبلاء، ۱۴/ ۳۷۳

احادیث کو ایک ساتھ ذکر کیا گیا تو وہ متفرق حدیثیں دفعتاً اس طرح سامنے آئیں کہ ظاہری مفہوم کو مؤکد کرنے اور تشبیہ کا وہم پیدا کرنے کا ایک بڑا وسیلہ بن گئیں۔''

آگے چل کر انھوں نے فرمایا:

بلکہ کسی حدیث کا ایک لفظ جو مختلف معانی کا احتمال رکھتا ہے، اگر اس سے ایک ہی طرح کا دوسرا، تیسرا، چوتھا لفظ متصل ہو جائے تو وہ سارے الفاظ ایک ساتھ مل کر ایک خاص معنیٰ پیدا کر دیتے ہیں اور الگ الگ ان الفاظ اور ان جملوں کے سیاق سے پیدا ہونے والے معانی کا احتمال کمزور پڑ جاتا ہے۔

پھر انھوں نے فرمایا:

''اس وجہ سے ان متفرق احادیث کا جمع کرنا جائز نہیں ہے۔(۱)

بعد میں امام غزالی نے اپنی کتاب میں اس کی توضیح کی ہے کہ ان نصوص میں وارد نسبتوں کی تفہیم کے لیے درست منہج کی بنیاد چند اصول وقواعد پر ہے۔ ایک یہ کہ متفرق احادیث کو جمع نہ کیا جائے اور جو ایک ساتھ ہیں ان کو الگ الگ نہ کیا جائے۔ تاکہ ان نسبتوں میں سے ہر ایک کے اطلاق کو ان کے قرائن کے ساتھ باقی رکھا جائے جن سے ان نصوص کی فہم میں مدد ملتی ہے، ساتھ ہی فہمِ نصوص کے دوسرے اصول وقواعد بھی مستحضر ہوں۔ فہم واستنباط کے حوالے سے بیان کیا گیا یہ منہج محدثین کے ان قدیم اصول کے مطابق ہے، جن کا ذکر مختلف الحدیث کے باب میں موجود ہے۔ یہ اصول ان حدیثی فنون میں سے ہیں جن میں علومِ حدیث کے ساتھ اصولِ فقہ کا امتزاج بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان نصوص کی فہم؛ فقہ واصول میں گہری نظر پر موقوف ہے؛ کیوں کہ محدث ان احادیث کی اسنادی بحثوں کے ساتھ ساتھ ان کے متون، ان کی ترکیبی کیفیت، ان کے عام وخاص کا ادراک اور الفاظ کے مدلولات کی تنقیح میں غور وفکر کرتا ہے۔ اس سلسلے میں امام سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بہت دقیق النظر اور صاحبِ توفیق تھے۔

''الفیۃ الحدیث'' میں فرماتے ہیں:

فھو مھم، وجمیع الفرق	فی الدین تضطر له فحقق
وانما یصلح فیه من کمل	فقھا واصلا وحدیثا واعتمل

۱۔ یہ بات اہم ہے، دین میں سارے فرقے اس پر مجبور ہیں۔ آپ اس کی تحقیق کیجیے۔
۲۔ اس کے لائق وہی ہے جو فقہ وحدیث میں کامل ہو اور غور وفکر کرے۔

---

(۱) الجام العوام عن علم الکلام ص: ۱۷، المطبعۃ المیمنیۃ، مصر، ۱۳۰۹ھ

اس شعر میں ''واعتمل'' ایک مضبوط لفظ ہے؛ کیوں کہ وہ فی نفسہٖ علوم کو باہم مخلوط کر کے انھیں مؤثر بنانے کی جانب اشارہ کرتا ہے، تاکہ اس کے ذریعے عالم کو تفقہ کا ملکہ حاصل ہو جائے اور وہ اپنے احکام بصیرت کے ساتھ صادر کر سکے۔(۱)

یہ وہی بات ہے جس کا ذکر امام غزالی علیہ الرحمہ نے **شفاء العلیل** میں یوں کیا ہے:

''احادیثِ متشابہ پر مشتمل کتابوں کی جانب رجوع سے قبل ضروری ہے کہ فقہا کی نظر واستدلال کی اساس، مباحثے میں ان کی فکر ونظر کے وسائل وآلات کی بلندیوں کا علم ہو اور ساتھ ان کے فن کی مشق بھی ہو، یوں ہی اصولیین کے کلام اور اس علم کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں کا احاطہ ہو، استدلال کے طریقے سے واقفیت ہو اور اہلِ زمانہ کی تصنیفات کا خوب تجربہ اور اس کی تدریب ہو۔''(۲)

یہی پاکیزہ اور نفیس تعبیر امام غزالی علیہ الرحمہ کے علاوہ امام زرکشی علیہ الرحمہ نے بھی استعمال فرمائی ہے۔ ''**البحر المحیط**'' میں فرماتے ہیں:

''حصولِ ملکہ کے لیے محض کسی چیز کا جان لینا کافی نہیں ہے، بلکہ بلا واسطہ اس کی مشق بھی ضروری ہے۔ دلائل اور استنباطِ مسائل کا ملکہ حاصل کرنے کے لیے اقوالِ علما اور ان کی کتابوں کے مشمولات کی مشق بھی ناگزیر ہے۔''(۳)

یہاں میں اس بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ وحی مقدس سمجھنے اور اعتقاد، فقہ واصولِ فقہ وغیرہ کے ابواب میں مذکور علوم کے استنباط میں امت مسلمہ کا یہی قدیم مسلک ومنہج ہے؛ کیوں کہ نص کا ثبوت پہلا مرحلہ ہے، اس کے بعد استنباط کے کئی دقیق مراحل ہیں۔ محدثین کی بعض کتابیں وہ ہیں جن میں درست عقائد موجود نہیں ہیں، جمع نصوص واحادیث کے علاوہ ان کتابوں کا اور کوئی فائدہ نہیں ہے، ان کتابوں میں احادیث متشابہ کی فہم اور ان کے الفاظ کو صحیح مناسب معانی پر محمول کرنے کے اصولی طریقے بھی مذکور نہیں ہیں۔ میں نے اپنی کتاب ''**مشکاۃ الاصولیین والفقہاء**'' میں بڑی تفصیل کے ساتھ اس کی توضیح وتشریح کر دی ہے۔ اس بحث کا وہاں مطالعہ کریں۔

جب ہم بقیہ محدثین کا تجزیہ کرتے ہیں تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ جمہور محدثین اشاعرہ اور

---

(۱) مختلف الحدیث کی بحث کے لیے مطالعہ کریں النکت ر ص:۲۸۵، الشذ الفیاح من علوم ابن الصلاح ر ۲/۱۷۴، نزہۃ النظر ر ص:۶۷، فتح المغیث للسخاوی ر ۴/۶۵، تدریب الراوی ر ۱/۱۷۶، اصول الحدیث لعجاج الخطیب ص:۲۸۳

(۲) شفاء العلیل فی بیان الشبہ والمخیل ومسالک التعلیل ر ص:۴، تحقیق حمد الکبیسی، مطبعۃ الارشاد، بغداد، ۱۳۹۰ھ-۱۹۷۱ء

(۳) البحر المحیط ر ۸/۲۶۶، دار الکتبی، مصر، ۱۴۲۴ھ-۲۰۰۵ء

ماتریدیہ ہی ہیں۔ جیسے امام دارِقطنی، امامِ حاکم صاحبِ مستدرک، امام حافظ بیہقی اور آپ کی دو عظیم کتاب ''الاسماء والصفات'' اور کتاب ''الاعتقاد'' جو محدثین کے لیے اس سلسلے میں قابلِ فخر ہے۔ یوں ہی خطیب بغدادی، حافظ ابوالقاسم ابن عساکر اور آپ کی کتاب ''تبیین کذب المفتری فیما نسب الی الاشعری'' حضراتِ اشاعرہ کے لیے قابلِ فخر اور محدثین کے عقائد پر اہم کتابوں میں سے ہے۔ امامِ خطابی، حافظ ابونعیم اصبہانی، سمعانی، ابن قطان، قاضی عیاض، ابن صلاح، حافظ منذری، امام محی الدین نووی، حافظ نورالدین ہیثمی، حافظ مزی، شیخ الاسلام امیر المومنین فی الحدیث ابن حجر عسقلانی، حافظ ابن منیر، ابن بطال، صحیحین کے عام شارحین، سنن کے عام شارحین، حافظ عراقی اور ان کے صاحب زادے ولی الدین ابوزرعہ، ابن جماعہ، بدرالدین عینی، حافظ صلاح الدین علائی، امام ابن ملقن، شیخ الاسلام ابن دقیق العید، ان کے شاگرد حافظ ذہبی، حافظ ابن ناصرالدین دمشقی، حافظ ابن کثیر، ابن زملکانی، حافظ زیلعی، حافظ جلال الدین سیوطی، ابن علان، حافظ شمس الدین سخاوی، عبدالروف مناوی، ملا علی قاری، بیقونی، عبدالحی لکنوی، حافظ محمد مرتضیٰ زبیدی، محدث اکبر بدرالدین حسنی، محمد بن جعفر کتانی، مسندالدنیا محمد عبدالحی کتانی۔ اسی طرح دیوبند اور دیگر ہندوستانی مدارس کے محدثین، جیسے انور شاہ کشمیری، مختلف زمانوں میں ازہر شریف کے محدثین اور ہمارے شیوخ کا طبقہ جنھیں ہم نے پایا ہے۔ مختلف زمانوں میں مراکش کے محدثین، اسی طرح شنقیط، جزائر، مالی، سوڈان، حضرموت، شام، عراق، ملایو، قوقاز وغیرہ کے مختلف بڑے مدارس کے محدثین اور اہلِ اسناد جنھوں نے مسلمانوں کے علم و دین کی حفاظت کی۔

اگر میں ان میں سے ہر ایک کا علمائے اشاعرہ کی تعظیم کے حوالے سے علاحدہ علاحدہ ذکر کروں تو گفتگو بہت طویل ہو جائے گی۔ یہاں بطورِ مثال اشاعرہ کے امام ابوبکر باقلانی کے تعلق سے صرف امام دارِقطنی کی تعریف و توصیف کا تذکرہ کافی ہے۔ ابوذر ہروی کہتے ہیں کہ قاضی ابوبکر سے میری پہلی ملاقات اس طرح ہوئی کہ میں شیخ ابوالحسن دارقطنی کے ساتھ بغداد کی ایک گلی سے گزر رہا تھا۔ اچانک آپ کی ملاقات ایک نوجوان سے ہوئی۔ آپ نے سلام کیا اور اس سے لپٹ گئے۔ شیخ ابوالحسن نے اس نوجوان کی ایسی تعظیم و توقیر کی اور اس کے حق میں ایسی دعائیں کیں کہ میں تعجب میں پڑ گیا۔ میں نے دریافت کیا کہ یہ کون ہیں؟ فرمایا: یہ ابوبکر بن طیب ہیں۔ اللہ رب العزت نے ان کے ذریعے اہلِ سنت کی مدد کی اور اہلِ بدعت کا خاتمہ فرمایا۔(۱)

مختلف زمانے کے یہ اساطین حدیث سب کے سب حضراتِ اشاعرہ و ماتریدیہ کے

---

(۱) ترتیب المدارک وتقریب المسالک ۲/ ۲۰۹، دارالکتب العلمیہ، بیروت، لبنان، ۱۴۱۸ھ-۱۹۹۸ء، تحقیق: محمد سالم ہاشم

عقائد پر تھے۔ اگر میں سبھی کی عبارتیں جمع کروں تو گفتگو دراز ہو جائے گی۔ یہ باتیں اس قدر مشہور ہیں کہ ان کے لیے اب کسی دلیل کی حاجت ہی نہیں ہے۔ ان تمام حضرات کے عقائد حضراتِ اشاعرہ وماتریدیہ کے ہی عقائد ہیں۔ لہذا یہ درست نہیں ہے کہ ہم محدثین کے لیے کوئی خاص عقیدہ مانیں، چہ جائے کہ ان کے عقائد میں عقیدہ تشبیہ وتجسیم کو شامل کریں، پھر اہلِ سنت وجماعت کے تحت بعض محدثین کے تجسیمی عقائد کو داخل کر کے اہلِ سنت وجماعت کو ان عقائد پر محصور مانیں اور اشاعرہ کو اس سے خارج گردانیں۔

بعد میں ان ائمہ محدثین کے ساتھ مختلف علوم سے تعلق رکھنے والے ائمہ ہدایت اور اہلِ حق کا اتفاق رہا۔ غزالی، رازی، بیضاوی، امام تاج الدین سبکی، ابن حاجب اور اخیر میں دسیوں ائمہ اصول ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ یوں ہی امام عضد، سعد تفتازانی، اصفہانی، فخر الدین رازی، ابوبکر باقلانی، اسفرایینی وامام الحرمین جوینی جیسے علما بھی ان سے متفق رہے۔ ان تمام محدثین، اصولیین، متکلمین وعلمائے بیان وغیرہ نے ابوابِ عقائد میں نصوص کی دلالتوں کی توضیح میں ایک دوسرے کی مدد کی، مقصود یہ تھا کہ اہلِ اسلام کے عقائد کی خدمت کر سکیں، اصولِ اعتقاد کے سلسلے میں تحقیق کے اولین فرضِ منصبی کو انجام دے سکیں اور ان اعلیٰ مقاصد کی خدمت کے لیے علوم نقلیہ وعقلیہ اور دیگر مباحث کا استعمال کر سکیں۔ یہ محدثین، اصولیین اور متکلمین آپس میں ایک دوسرے کی غلطیوں کی تصحیح کرتے ہیں، بعض بعض کی مدد کرتے ہیں اور ابوابِ اعتقاد میں انحرافی صورتوں سے مسلمانوں کو بچانے کے لیے تمام لوگ اتفاق رکھتے ہیں۔ غالباً اسی باہمی تعاون کا ایک نمونہ وہ ہے جس کا ہم نے ابھی ذکر کیا کہ امیر المومنین فی الحدیث ابوالحسن دارقطنی نے امام باقلانی سے ملاقات کی تو انھیں سلام کیا اور ان سے لپٹ گئے۔ ابوذر ہروی نے کہا کہ میں شیخ ابوالحسن کو ان کی تعظیم وتوقیر اور ان کے لیے اس طرح دعا کرتے ہوئے دیکھ کر تعجب میں پڑ گیا۔ میں نے دریافت کیا کہ یہ کون ہیں؟ فرمایا: یہ ابوبکر بن طیب ہیں۔ اللہ رب العزت نے ان کے ذریعے اہلِ سنت کی مدد فرمائی اور اہلِ بدعت کا خاتمہ فرمایا۔

اس طرح اسلامی علوم باہم متحد ہو گئے، بعض نے بعض کی کوششوں کو آگے بڑھایا۔ محدثین نے الگ سے کوئی ایسا عقیدہ نہیں اپنایا جو صرف انھیں کے ساتھ مختص ہو، نہ ہی متکلمین نے ایسا کیا، بلکہ سارے حضرات بکمال وتمام علومِ شریعت کی ترویج وترقی میں لگے رہے۔ ان گروہوں سے جو لوگ الگ ہوئے ان کے موقف کی خطا پر تنبیہ اور ان کی باتوں پر علمی طور سے باریک بینی کے ساتھ بحث ونظر کے لیے اس امت میں جاری علم وتنقید کی تحریک ہر زمانے میں کام کرتی رہی اور اس کے ذریعے مسلمانوں کے عقائد کو تمام انحرافات سے محفوظ کیا جاتا رہا۔

اب ''ید'' اور ''وجہ'' جیسی متشابہ آیات واحادیث کے معانی کی تفویض کے سلسلے میں بعض محدثین کی عبارتیں آپ کی خدمت میں پیش کی جارہی ہیں جوان آثار واحادیث کی فہم میں محدثین کے منہج کی وضاحت کرتی ہیں، ان احادیث کو ''**اعتقاد اهلِ الحديث**'' کے نام سے بعض محدثین نے جمع تو کردیا ہے، لیکن ان نصوص وآثار کے سمجھنے کے اصول وقواعد کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔آنے والی عبارتوں کا مآل یہ نکلتا ہے کہ محدثین اشاعرہ وماتریدیہ کے منہج پر ہیں، صفاتِ متشابہات کے حوالے سے تفویض وتاویل کا مسلک رکھتے ہیں اور حقیقت وہ نہیں ہے جس کا بعض معاصرین محدثین کی طرف تشبیہ وتجسیم کی نسبت کرکے اظہار کرتے ہیں۔ اللہ رب العزت ان کے چہروں کو روشن فرمائے۔

(۱) امام شعبی: سفارینی نے ''**الدرةالمضية**'' میں نقل کیا ہے کہ جب آپ سے ''استوا'' کے بارے سوال کیا گیا تو فرمایا:

''**هٰذا من متشابه القرأن ولانتعرض لمعناه۔**'' یہ قرآن کے متشابہات میں سے ہے، ہم ان کے معانی میں غور وخوض نہیں کرتے ہیں۔

ابن عطیہ نے ''**المحرر الوجيز**'' میں فرمایا:

''**وقال الشعبي وجماعةغيره:هٰذا من متشابه القرأن يومن به ولايعرض لمعناه۔**''(۱) امام شعبی اور ایک جماعت کا کہنا ہے کہ یہ قرآن کے متشابہات میں سے ہے، اس پر ایمان رکھا جائے گا اور اس کے معنیٰ میں غور وخوض نہیں کیا جائے گا۔

امام کرمی نے بھی اسے ''**اقاويل الثقات**'' میں ذکر کیا ہے۔

(۲) امام ابوعبداللہ محمد بن ادریس شافعی: ابن تیمیہ نے ''**مجموع الفتاوىٰ**'' میں ذکر کیا ہے کہ امام شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

''**أمنت بالله وبما جاء عن الله على مراد الله، وأمنت برسول الله وبما جاء عن رسول الله على مراد رسول الله۔**'' میں اللہ پر ایمان لایا اور اس کی جانب سے نازل شدہ آیات کے تعلق سے اسی کی مراد پر ایمان لایا۔ میں اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر ایمان لایا اور آپ سے مروی احادیث کے تعلق سے آپ کی مراد پر ایمان لایا۔

---

(۱) المحرر الوجیز ۳/۷/۴

ابن تیمیہ نے کہا کہ امام شافعی کا قول حق پر مبنی ہے۔ ہر مسلمان پر اس کا اعتقاد واجب ہے۔ جو یہ اعتقاد رکھے اور اس کی طرف سے اس کے برعکس کسی چیز کا صدور نہ ہو تو وہ دنیا و آخرت میں سلامتی کی راہ چلنے والا ہے۔(۱)

(۳) امام ابو عبید قاسم بن سلام: امام خطابی نے "**معالم السنن**" میں ذکر کیا ہے کہ ابو عبیدہ قاسم بن سلام، جو اکابر اہلِ علم میں سے ہیں، فرماتے ہیں:

"**نحن نروی ھٰذہ الاحادیث و لا نریغ لھا المعانی۔**" ہم صرف احادیث بیان کرتے ہیں، ان کے معانی کی تحقیق میں نہیں لگتے۔

خطابی کہتے ہیں کہ ہمارے لیے زیادہ مناسب یہی ہے کہ ہم ان چیزوں میں آگے بڑھنے کی کوشش نہ کریں جن سے ہمارے اسلاف پیچھے ہٹ گئے، حالاں کہ علم، زمانہ اور عمر سب میں وہ ہم سے بڑھ کر تھے۔(۲)

"**معالم السنن**" میں یہ بھی فرمایا:

"علمائے سلف اور ائمہ فقہا کا مذہب یہ ہے کہ وہ ان احادیث کو ان کے ظواہر پر محمول کرتے ہیں، ان کے معانی تلاش نہیں کرتے اور نہ ہی اپنے علم سے ان کی تاویل کرتے ہیں، اپنے علم کو ان کے ادراک سے قاصر جانتے ہیں۔"(۳)

(۴) امام احمد بن حنبل: ابنِ قدامہ نے "**لمعة الاعتقاد**" میں آپ سے نقل کیا ہے:

"**و ما اشبہ ھٰذہ الاحادیث نومن بھا و نصدق بھا و لا کیف و لا معنیٰ۔**"(۴)

اس طرح کی حدیثوں پر ایمان رکھتے ہیں، ان کی تصدیق کرتے ہیں، لیکن ان کی کیفیت و معنیٰ کی تلاش و جستجو میں نہیں لگتے۔

اسی بات کو ابنِ قدامہ نے اپنی کتاب "**ذم التاویل**"(۵) میں خلال سے بھی نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"مجھے علی بن عیسیٰ نے خبر دی کہ امام ابن حنبل نے ان سے بیان کیا، خلال فرماتے

---

(۱) مجموع الفتاویٰ/۶/۳۵۴

(۲) الاسماء والصفات، باب ماذکر فی القدم والرجل

(۳) معالم السنن/۴/۳۵۴

(۴) لمعة الاعتقاد ص: ۳۵

(۵) ذم التاویل ص: ۲۲

ہیں کہ میں نے ابوعبداللہ سے ان احادیث کے بارے میں پوچھا جن میں یہ مروی ہے کہ:''ان اللہ تبارک و تعالیٰ ینزل کل لیلۃالی السماء الدنیا و ان اللہ یری و ان اللہ یضع قدمہ۔'' اللہ رب العزت ہر رات آسمانِ دنیا کی جانب نزول فرماتا ہے، اسے دیکھتا ہے اوراس پر اپنے قدم بھی رکھتا ہے۔''

ابوعبداللہ نے فرمایا:''ہم ان احادیث پر ایمان لاتے ہیں، ان کی تصدیق کرتے ہیں، کیفیت و معنیٰ نہیں جانتے، نہ ہم ان میں سے کسی چیز کی تردید کرتے ہیں۔ہم جانتے ہیں کہ جو اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم لائے ہیں وہ حق ہے، بشرطے کہ وہ صحیح سندوں سے مروی ہو۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول کو رد نہیں کرتے۔ اپنی جو صفت اللہ نے خود بیان کی ہے اور جو صفت اس کی رسول اعظم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بیان کی ہے، اس سے زیادہ اس کو کسی صفت سے موصوف نہ کیا جائے۔ ''لیس کمثلہٖ شی وھو السمیع البصیر'' (الشوریٰ:۱۱) واصفین اس کی کسی صفت کی کنہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ہم قرآن وحدیث سے تجاوز نہیں کرتے ہیں۔ ہم وہی کہتے ہیں جو رب نے فرمایا، وہی صفت بیان کرتے ہیں جو رب نے بیان فرمائی، ہم اس سے تجاوز نہیں کرتے۔ ہم پورے قرآن، محکمات ومتشابہات پر ایمان رکھتے ہیں اور کسی بھی نقص کے پیشِ نظر اس کی کوئی بھی صفت اس سے زائل نہیں مانتے ہیں۔''

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالیٰ سے ان کی وفات سے ایک دن قبل احادیثِ صفات کے بارے میں پوچھا گیا۔تو فرمایا: یہ حدیثیں اسی طرح ہیں جس طرح مروی ہیں، ان پر ایمان رکھا جائے گا، ان میں سے کسی کو رد نہیں کیا جائے گا جب کہ صحیح سندوں سے مروی ہوں۔ اللہ رب العزت نے اپنا وصف جس طرح بغیر حد وغایت کے بیان فرمایا ہے، اس سے زیادہ اس کے لیے کوئی صفت نہیں بیان کی جائے گی۔ ''لیس کمثلہٖ شئی وھو السمیع البصیر''۔ جو ان احادیث کے معانی پر کلام کرے وہ بدعتی ہے۔''(۱)

(۵) امام ابوالحسن علی بن اسماعیل اشعری:''الابانۃ'' میں فرماتے ہیں:

''ہمارا قول وہی ہے جس کا ہم اقرار کرتے ہیں، ہمارا دین کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو مضبوطی سے تھامنا ہے۔ جو کچھ حضراتِ صحابہ، تابعین اور ائمہ حدیث سے مروی ہے ہم اس کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں اور جو ابوعبداللہ احمد بن حنبل فرمایا کرتے تھے اسے بھی سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔

---

(۱) اعتقاد الامام المبجل، ابن حنبل (ذیل طبقات الحنابلۃ) ۱/۳۰۷، دار المعرفۃ، تحقیق: محمد حامد الفقی

اللہ رب العزت ان کا چہرہ روشن فرمائے اور ان کے درجات بلند کرے۔‘‘
پھر امام اشعری کچھ گفتگو کرنے کے بعد فرماتے ہیں:
’’اللہ رب العزت عرش پر اسی طرح مستوی ہے جس طرح اس نے ذکر کیا ہے اور اسی معنیٰ کے اعتبار سے مستوی ہے جو اس نے مراد لیا ہے، ایسا استوا جو مسّ واستقرار، تمکن وحلول اور انتقال سے پاک ہے۔ عرش اسے نہیں اٹھا سکتا، بلکہ عرش اور حاملانِ عرش سبھی اس کے لطفِ قدرت سے باقی ہیں، اس کے قبضے میں ہیں، وہ عرش اور تحت الثریٰ تک موجود ہر شی سے بلند وبالا ہے، وہ ایسی بلندی کا مالک ہے کہ اس کی وجہ سے عرش وفلک سے اس کی قربت میں اضافہ نہیں ہوتا، بلکہ وہ عرش سے بھی بلند وبالا ہے، جیسا کہ وہ تحت الثریٰ سے درجوں بلند ہے، اس کے باوجود وہ ہر موجود سے قریب ہے، بندے کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے اور ہر چیز پر نظر رکھنے والا ہے۔‘‘(۱)

(۶) امام ابوجعفر طحاوی: ’’العقیدۃ الطحاویۃ‘‘ کے متن میں فرماتے ہیں:
’’جو کچھ رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حدیث صحیح سے ثابت ہے وہ اسی طرح ہے جس طرح حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا اور اسی معنیٰ پر ہے جو انھوں نے مراد لیا۔ ہم اپنی آرا سے اس میں تاویل نہیں کریں گے، نہ ہی اپنی خواہش سے اپنے وہم کو دخل اندازی کرنے دیں گے؛ کیوں کہ دین میں وہی شخص محفوظ رہے گا جو اپنا معاملہ اللہ عزوجل اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سپرد کردے اور مشتبہ چیزوں کا علم اللہ رب العزت کی جانب پھیر دے۔ ہم کہتے ہیں: اللہ رب العزت ان چیزوں کو جاننے والا ہے جو ہم پر مشتبہ ہیں۔‘‘(۲)

(۷) عبدالباقی مواہبی حنبلی: ’’العین والاثر فی عقائد اھل الاثر‘‘ میں فرماتے ہیں:
’’استوا کے بارے میں ابوعلی حسین بن فضل بجلی کا جواب مشہور ہے کہ آپ نے فرمایا: ہم غیب کی وہی خبریں جانتے ہیں جو ہمارے لیے منکشف کی گئی ہیں اور اللہ رب العزت نے ہمیں یہ بتا دیا ہے کہ وہ عرش پر مستوی ہے، لیکن اس نے کیفیتِ استوا کی خبر نہیں دی۔ جو یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ رب العزت عرش یا کسی دوسری مخلوق کا محتاج ہے، یا یہ کہ اس نے عرش پر اسی طرح استوا کیا ہے جیسے کہ مخلوق کرسی پر کرتی

---

(۱) الابانۃ عن اصول الدیانۃ ر ۰۷، تحقیق: دکتورہ فوقیہ حسین محمود، دارالانصار، قاہرہ

(۲) متن العقیدۃ الطحاویۃ رص: ۱۳، ۱۴، دار ابن حزم، بیروت، لبنان، ۱۹۹۵ء

ہےتو وہ گم راہ و بدعتی ہے۔ اللہ رب العزت تو اس وقت بھی موجود تھا جب نہ زمان تھا، نہ مکان اور اب بھی ویسے ہی ہے جیسے وہ پہلے تھا۔'' (۱)

(۸) امام ابو عمر ابن عبد البر: ''التمھید'' میں فرماتے ہیں:

''ہم نے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ابن شہاب از حمید بن عبد الرحمٰن کے باب میں متعدد حدیثیں نقل کی ہیں کہ ''قل ھو اللہ احد'' تہائی قرآن کے برابر ہے۔ اس کی تشریح میں ہم نے وہاں ایسی گفتگو کر دی ہے جو شافی اور کافی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے یہ قول ثابت ہے۔ ہم وہی کہتے ہیں جو آپ سے ثابت ہے، اس سے تجاوز نہیں کرتے، جن معانی سے ہم ناواقف ہیں انھیں ان کے سپرد کرتے ہیں، ہم نے جو جانا انھی سے جانا، وہ اللہ رب العزت کی مراد واضح فرمانے والے ہیں، باوجود اس کے قرآن ہمارے نزدیک اللہ رب العزت کا کلام اور اس کی صفت ہے، مخلوق نہیں ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ کس طرح سورۂ اخلاص ثلثِ قرآن کے برابر ہے۔ اللہ رب العزت اپنے بندوں پر جس طرح چاہتا ہے فضل فرماتا ہے۔'' (۲)

(۹) امام محی الدین نووی: ''شرحِ صحیح مسلم'' میں فرماتے ہیں:

جان لیجیے! آیات و احادیثِ صفات کے بارے میں اہلِ علم کے دو قول ہیں: ایک جو بیشتر یا سارے اسلاف کا ہے، وہ یہ کہ ان کے معانی پر گفتگو نہیں کی جائے گی، بلکہ یہ کہا جائے گا کہ ہم پر واجب ہے کہ ان پر ایمان لائیں اور یہ اعتقاد رکھیں کہ ان احادیث کے معانی اللہ رب العزت کی عظمت و جلالت کے مناسب ہیں۔ ہمارا یہ جازم عقیدہ ہے کہ اللہ رب العزت کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہ تجسیم، انتقال، کسی جہت میں ہونے اور مخلوق کی تمام صفات سے پاک ہے۔ یہی قول متکلمین کی ایک جماعت کا ہے اور محققین کی ایک جماعت نے بھی اسے اختیار کیا ہے اور یہی مذہب اسلم ہے۔ (۳)

(۱۰) امام حافظ مجتہد تقی الدین ابن دقیق العید ابو الفتح محمد بن علی قشیری: حافظ ابن حجر نے

---

(۱) العین والاثر فی عقائد اھل الاثر ص: ۶۰، دار المامون للتراث، بیروت، ۱۴۰۷ھ-۱۹۸۷ء

(۲) التمہید ۱۹/۲۳۱

(۳) شرح الامام النووی علی صحیح مسلم ۳/۲۱

"فتح الباری" میں فرمایا:

"**وقال ابن دقيق العيد في العقيدة: نقول في الصفات المشكلة انها حق وصدق على المعنى الذي اراده الله۔ الخ**"۔(۱) ابن دقیق العید "**العقیدة**" میں فرماتے ہیں: صفاتِ متشابہ کے تعلق سے ہمارا مذہب یہ ہے کہ وہ حق ہیں اور انھیں معانی پر محمول ہیں جو اللہ رب العزت نے مراد لیے ہیں۔

(۱۱) حافظ ابوعبداللہ شمس الدین ذہبی: یہ سب سے زیادہ اس پر زور دینے والوں میں سے ہیں کہ درست مذہب سلفِ امت کا ہے کہ آیاتِ صفات کے معانی حق سبحانہ وتعالیٰ کے سپرد کردیے جائیں۔ آپ ہمیشہ اسی کو ثابت فرماتے رہے اور اسی کی تنبیہ کرتے رہے۔ ان کی عبارتیں خود اس لائق ہیں کہ انھیں الگ سے ذکر کیا جائے۔ "سیر اعلام النبلاء" میں فرماتے ہیں:

آیاتِ صفات اور اس باب کی حدیثوں کے حوالے سے ہمارا موقف یہ ہے کہ ان کا اقرار کرکے گزر جایا جائے اور ان کے معانی کو اللہ عزوجل اور رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حوالے کردیا جائے۔(۲)

ابنِ خزیمہ فرماتے ہیں:

"جو اس کا اقرار نہ کرے کہ اللہ رب العزت ساتوں آسمان سے بلند عرش پر مستوی ہے وہ کافر اور حلال الدم ہے، اس کا مال مالِ غنیمت ہے۔"

اس پر تعاقب کرتے ہوئے امام ذہبی نے "سیر اعلام النبلاء" میں فرمایا:

"جو کتاب اللہ اور احادیثِ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تصدیق کرتے ہوئے اس کا اقرار کرے، اس پر ایمان لائے اور اس کا معنیٰ اللہ عزوجل اور رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سپرد کردے، اس کی تاویل میں غور وخوض نہ کرے تو وہ مسلم و متبع ہے۔ اور جو اس کا انکار کرے، کتاب وسنت سے اس کا ثبوت نہ جانے تو وہ کوتاہی کرنے والا ہے، اللہ رب العزت اسے معاف فرمائے گا؛ کیوں کہ صفاتِ متشابہ کے سلسلے میں منقول تمام احادیث کو یاد کرنا ہر مسلمان پر واجب نہیں ہے۔ جو علم کے بعد بھی اس کا انکار کرے، سلف صالح کی راہ سے ہٹ جائے اور نص کے تعلق سے اپنی عقل کا استعمال کرے تو اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ ہم گم رہی

---

(۱) فتح الباری/ ۱۳/ ۳۸۳

(۲) سیر اعلام النبلاء/ ۸/ ۹۳

اور ہوا پرستی سے اللہ رب العزت کی پناہ طلب کرتے ہیں۔

ابنِ خزیمہ کا یہ کلام گرچہ برحق ہے، لیکن اس میں نقص ہے۔ متاخرین علما اس کو برداشت نہیں کر سکتے۔ توحید کے تعلق سے ان کی ایک بڑی کتاب ہے، اس میں حدیث صورۃ کی تاویل کی گئی ہے۔ لہذا جس نے بعض صفات کی تاویل کی ہے اسے بھی معذور جاننا چاہیے۔ اسلافِ کرام نے تاویل میں غور وخوض نہیں کیا بلکہ ایمان لائے اور اسے کافی جانا اور حقیقی معنیٰ کا علم اللہ عز وجل اور رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سپرد کر دیا۔ اگر صحتِ ایمان اور اتباع حق کی کوشش کے باوجود اجتہاد میں خطا کرنے والے ہر شخص کو ہم مباح الدم اور بدعتی قرار دیں تو بہت کم ہی ائمہ اس سے محفوظ رہ پائیں گے۔ اللہ رب العزت اپنے احسان وکرم سے ہم پر رحم فرمائے۔'' (۱)

میں کہتا ہوں: دیکھیے یہ امام ذہبی کا موقف ہے۔ وہ تفویضِ معنیٰ کا حکم دیتے ہیں اور صفات کی تاویل کرنے والوں کو معذور جانتے ہیں۔ معلوم ہونا چاہیے کہ جنھوں نے تاویل کی ہے وہ عوام کی فہم کی حفاظت اور تشبیہ کی غلاظت میں پڑنے سے ان کو بچانے کے لیے کی ہے۔ خلاصہ یہ کہ تاویل ایک ضرورت ہے اور قدرِ ضرورت تک ہی اسے محدود رکھا جائے گا۔

حافظ ذہبی کا قول کہ ابن خزیمہ کا کلام برحق ہے لیکن اس میں نقص ہے، یہ اپنی جگہ درست ہے۔ یہ حق ہے کہ ان متشابہ آیات کے اطلاقات کا ثبوت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے ہے، اس کا انکار نص معصوم کی تکذیب ہے اور یہ کفر ہے۔ لیکن جو ان کلمات کو ثابت مانے وہ یا تو ان کے معانی اللہ رب العزت کے سپرد کر دے جیسا کہ امام ذہبی نے صراحت کی ہے، یا پھر مناسب معنیٰ بیان کر کے ان کی اس طرح تاویل کرے کہ کلامِ عرب میں اس کی گنجائش ہو اور ہر جگہ مناسبِ حال معنیٰ کا اعتبار کیا جائے۔

معاصرین میں سے بعض وہ ہیں جو ثبوتِ نص کی وجہ سے ان پر ایمان کو واجب کہتے ہیں، مگر کیفیتِ فہم کے معاملے میں التباس کا شکار ہیں۔ اللہ رب العزت نے اس میں وسعت رکھی ہے، جیسا کہ امام ذہبی وغیرہ کے کلام میں آپ دیکھ چکے ہیں۔ اس لیے آپ ثبوتِ نص اور فہمِ نص کے درمیان فرق کیجیے، ثبوت ودلالت کے درمیان اختلاف کو پہچانیے، فہم اور استنباط کے معتبر طرق ووسائل کا پہلے احاطہ کیجیے اور اس کی معرفت حاصل کیجیے پھر معانی کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ اللہ ہی اس کی توفیق دینے والا ہے۔

---

(۱) سیر اعلام النبلاء، ۱۴/ ۳۷۳

یہ بات گزر چکی ہے کہ ان کلمات کے اطلاق کا ثبوت اور ان کے معانی کا ادراک دونوں کے درمیان فرق کی صراحت امام ابن قدامہ نے کی ہے۔

"لمعة الاعتقاد" میں فرماتے ہیں:

"جو متشابہ الفاظ ہیں ان کو لفظی طور پر ثابت مانا جائے اور معنیٰ کے در پے ہونے سے بچا جائے۔ ہم معنیٰ کے علم کو اس کے قائل کی طرف لوٹا دیں گے، اس کی ذمہ داری ناقل پر رکھیں گے اور "راسخین فی العلم" کے طریقے کا اتباع کریں گے جن کی اللہ رب العزت نے اپنی کتاب میں تعریف کی ہے اور انھیں "راسخین فی العلم" قرار دیا ہے۔"(۱)

حافظ ذہبی نے بھی "سیر اعلام النبلاء" میں حدیث نزول پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:

"اگر کوئی اس کے حق ہونے کا اعتراف کرے، لیکن کہے کہ میں اس کے معانی میں غور وخوض نہیں کروں گا تو اس نے اچھا کیا اور اگر آیات پر ایمان لائے اور تمام یا بعض کی تاویل کرے تو یہی معروف طریقہ ہے۔"(۲)

امام ذہبی نے "سیر اعلام النبلاء" میں فرمایا:

"اللہ رب العزت کی وہی صفت بیان کی جائے جو اس نے بیان کی ہے یا جس کا اس نے اپنے رسولوں کو علم دیا ہے، بغیر کسی مثال و کیفیت کے اس پر ایمان رکھا جائے اور اس معنیٰ کا اعتقاد رکھا جائے جو اس کی مراد ہے۔ "**لیس کمثلہٖ شئ وھو السمیع البصیر**"۔"(۳)

(۱۲) امام ابوحیان اندلسی: "البحر المحیط" میں فرماتے ہیں:

"لفظ اتیان دراصل ایک جہت سے دوسری جہت کی جانب منتقل ہونے کا نام ہے اور اللہ رب العزت کی طرف اس کی نسبت محال ہے۔ ابو صالح حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ یہ ان مخفی باتوں میں سے ہے جن کی تفسیر نہیں کی جائے گی۔ سلف اس طرح کی چیزوں پر ایمان لاتے تھے اور ان کے معانیٰ اللہ

---

(۱) لمعۃ الاعتقاد رص:۳۱۔ اسے ابن قیم نے "اجتماع الجیوش الاسلامیۃ رص:۱۱۶" میں نقل کیا ہے۔

(۲) سیر اعلام النبلاء ر ۱۴ر ۳۹۶

(۳) سیر اعلام النبلاء ر ۱۶ر ۹۷

رب العزت کے سپرد کر دیا کرتے تھے۔‘‘(۱)

(۱۳) حافظ ابن رجب حنبلی: اپنے رسالے ’’**فضل علم السلف علی الخلف**‘‘میں فرماتے ہیں:

’’درست بات وہی ہے جس پر اسلاف عمل پیرا رہے ہیں کہ آیات واحادیث صفات کو بغیر کسی تفسیر وتکییف وتمثیل کے ویسے ہی رکھا جائے گا جس طرح منقول ہیں اور وہاں سے آگے گزر جایا جائے گا۔ کسی سے اس کے برخلاف ثابت نہیں ہے، خصوصا امام احمد سے۔ نہ ان کے معانی میں غور وخوض کیا جائے گا اور نہ ان کی مثال بیان کی جائے گی۔(۲)

(۱۴) حافظ عراقی: ’’وجہ‘‘ پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

’’کتاب وسنت میں اللہ کے لیے دوسری صفتوں اور نسبتوں کی طرح وجہ کا ذکر کئی بار آیا ہے۔ اس میں دو مذہب مشہور ہیں۔ ایک یہ کہ بغیر کسی کیفیت کے انھیں ان کے ظواہر پر محمول کریں گے، ہم ان پر ایمان لائیں گے اور ان کے معانی کا علم اللہ رب العزت کے سپرد کر دیں گے۔ ساتھ ہی ہمارا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ اللہ رب العزت کی مثل کوئی چیز نہیں اور اس کی صفتیں مخلوق کی صفتوں کے مشابہ نہیں۔ دوسرا یہ کہ ایسے مناسب معنی سے ان کی تاویل کی جائے گی جو ذاتِ باری تعالٰی کی عظمت وشان کے لائق ہے۔ چناں چہ ’’وجہ‘‘ سے ’’ذات‘‘ مراد لیا جائے گا۔‘‘(۳)

(۱۵) امام حافظ جلال عبدالرحمٰن بن ابی بکر سیوطی: ’’**الاتقان**‘‘ میں فرماتے ہیں:

’’جمہور اہلِ سنت کا مذہب، جن میں سلف اور محدثین بھی شامل ہیں، یہ ہے کہ ان آیتوں پر ایمان رکھا جائے گا اور ان کے مراد ومعانی کو اللہ رب العزت کے سپرد کر دیا جائے گا۔‘‘(۴)

(۱۶) ملا علی قاری: ’’**مرقاۃ المفاتیح**‘‘ میں فرماتے ہیں:

’’اس میں سلف کا مذہب یہ ہے کہ ان آیتوں کے ظواہر سے اللہ رب العزت کو

---

(۱) البحر المحیط/۲/۱۳۳

(۲) فضل علم السلف علی الخلف/ص:۴۵

(۳) طرح التثریب/۳/۱۰۷

(۴) الاتقان فی علوم القرآن/۲/۱۴

منزہ مان کران کا علم اسی کے سپرد کر دیا جائے۔یہی مذہب اسلم ہے۔ایسا اس لیے کہ مبادا حق تعالیٰ کی مراد کے خلاف کوئی معنیٰ نہ ہو جائے۔ اللہ رب العزت کے قول ''و ما یعلم تاویله الا اللہ'' میں کلمہ جلالت پر جمہور کے وقف کرنے اور اسے وقفِ لازم ماننے سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔کلمہ جلالت پر وصل کرنے کی صورت میں ایک فاسد معنیٰ کا وہم پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام اعظم علیہ الرحمہ نے فرمایا:

''**تاویل الید بالقدرۃ یؤدی التعطیل ماأثبته تعالیٰ لنفسه، وانما الذی ینبغی الایمان بما ذکرہ اللہ تعالیٰ من ذٰلک ونحوہ علی ماارادہ، ولا یشتغل بتاویله، فنقول: له ید علی ما أرادہ لا کید المخلوقین۔**'' ید کی تاویل قدرت سے کرنے کی صورت میں اس صفت کی نفی لازم آتی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے ثابت فرمایا ہے، مناسب یہ ہے کہ اس طرح کے نصوص کے تعلق سے یہ اقرار کیا جائے کہ جو اللہ کی مراد ہے ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کی تاویل میں نہیں پڑتے اور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لیے ایسا ید ہے جو اس کی مراد ہے، لیکن وہ ہاتھ مخلوق کی طرح نہیں ہے۔

اس حوالے سے متاخرین علما کا مذہب یہ ہے کہ اللہ رب العزت کے شایانِ شان اس کی تاویل کی جائے گی اور اسے جسم وجہت اور ان کے لوازمات سے منزہ مانا جائے گا، کیوں کہ وقف ''**الراسخون فی العلم**'' پر ہے۔حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرمایا کرتے تھے: ''**انا اعلم تاویله وانا من الراسخین فی العلم۔**'' میں اس کی تاویل جانتا ہوں اور میں ''راسخین فی العلم'' میں سے ہوں۔

علما نے فرمایا ہے کہ یہ موقف اعلم واحکم ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اس موقف کے لیے زیادہ علم وحکمت کی ضرورت ہے، تاکہ ان نصوص کی تاویل نص کے سیاق کے مطابق ہو۔ یہ معنیٰ نہیں ہے کہ متاخرین کا مذہب علم کے اعتبار سے زیادہ ہے۔ دونوں مذہب تنزیہ کے عقیدے پر متفق ہیں، اختلاف صرف اس میں ہے کہ اولیٰ کیا ہے، تفویض ہے یا تاویل؟

یہ بھی ممکن ہے کہ سلف وخلف کے اس اختلاف کو اختلافِ زمانی پر محمول کیا جائے۔ سلف کے زمانے میں تفویض ہی اولیٰ تھا؛ کیوں کہ ان کے سینے کدورت سے پاک تھے اور ان کے زمانے میں بدعات کا ظہور نہیں ہوا تھا۔ اور خلف کے زمانے

میں تاویل اولیٰ ہے؛ کیوں کہ آج عوام الناس کی تعداد زیادہ ہے، لوگ وہی چیزیں قبول کرتے ہیں جو ان کی سمجھ میں آسکیں اور مخلوق کے درمیان بدعات کا ظہور بھی کثرت سے ہے۔ اللہ ہی حقیقی مراد کو جاننے والا ہے۔(۱)

تصوف اور اہل تصوف کے ساتھ محدثین کا تعلق

[تصوف اور اہل تصوف کے ساتھ محدثین کا گہرا تعلق رہا ہے۔ یہ ایک بڑی غلط فہمی ہے کہ محدثین کو تصوف سے الگ یا مخالف تصور کرلیا جائے۔ صوفیانہ افکار واعمال اور صوفیہ کے ساتھ محدثین کا تعلق ہمیشہ مثبت بنیادوں پر استوار رہا ہے۔ وہ خود اپنے آپ میں جلیل القدر صوفی رہے ہیں، یا علی الاقل محب صوفیہ اور منہج اہل تصوف کے حامی وموید رہے ہیں۔ اس بات کو ہم مختلف ذیلی عناوین کے تحت ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مترجم]

(الف) مادحینِ تصوف محدثین:-

تصوف کی مدح، اہلِ تصوف کی عظمت، سیر الی اللہ کے حوالے سے ان کی بلند ہمتوں اور عمدہ احوال کی تعریف وتوصیف میں محدثین کی کثیر عبارتیں موجود ہیں۔

(۱) امام ابوعبداللہ محمد بن ادریس شافعی: فرماتے ہیں:

"**صحبت الصوفیةفما انتفعت منهم الا بکلمتین، سمعتهم یقولون:الوقت کالسیف فان قطعته والا قطعک، ونفسک ان لم تشغلها بالحق والا شغلتک بالباطل۔**" میں صوفیہ کی صحبت میں رہا، مجھے ان سے دو چیزیں حاصل ہوئیں۔ ایک یہ کہ وقت تلوار کی طرح ہے اگر تم اسے نہیں کاٹو گے تو وہ تمھیں کاٹ دے گا۔ دوسری یہ کہ اگر تم اپنے نفس کو اچھی چیزوں میں مشغول نہیں رکھو گے تو وہ تمھیں غلط چیزوں میں مشغول کردے گا۔

ابن قیم نے "مدار ج السالکین" میں اسے نقل کیا ہے اور ان الفاظ میں اس پر گفتگو کی ہے:

''میں کہتا ہوں کہ یہ دو کلمے نہایت ہی نفع بخش اور جامع ہیں اور قائل کی اعلیٰ ہمتی اور دانش مندی پر بہت زیادہ دلالت کرنے والے ہیں۔ جماعتِ صوفیہ کے حوالے سے امام شافعی کے یہ کلمات تعریف وتوصیف کے لیے کافی ہیں۔''(۲)

(۲) امام ابوعبداللہ حاکم نیشاپوری: وہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ذکر

---

(۱) مرقاۃ المفاتیح ر ۱ ر ۱۴۴

(۲) مدارج السالکین ر ۳ ر ۱۲۹، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۳۹۳ھ-۱۹۷۳ء، تحقیق: محمد حامد الفقی

کرتے ہیں۔ حضرت ابنِ مسعود نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

"یوم کلم اللہ موسیٰ کان علیہ جبۃ صوف، وسراویل صوف، وکمہ صوف، وکساء صوف، ونعلان من جلد حمار غیر ذکی۔" جس دن اللہ رب العزت نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا اس دن آپ اون کا جبہ اور پاجامہ پہنے ہوئے تھے، آستین اور چادر بھی اونی ہی تھی اور نعلین گدھے کے ایسے چمڑے سے بنے ہوئے تھے جس کی دباغت نہیں ہوئی تھی۔ شیخین بخاری و مسلم کا اس پر اتفاق ہے کہ سعید بن منصور کی حدیث سے استدلال درست ہے۔ یہ حمید بن قیس اعرج نہیں ہیں۔ امام بخاری نے "التاریخ" میں ذکر کیا ہے کہ حمید بن علی اعرج کوفی منکر الحدیث ہے اور عبداللہ بن حارث نجرانی قابلِ حجت ہیں۔ امام مسلم نے تنہا خلف بن خلیفہ کی روایت سے استدلال کیا ہے۔ تصوف کے تعلق سے یہ ایک بڑی حدیث ہے۔ ان حضرات نے اس کی تخریج نہیں کی ہے۔ اسماعیل بن عیاش کی روایت میں اس کا شاہد بھی موجود ہے۔(۱)

مستدرک میں یہ بھی فرمایا:

''ہم سے شیخ ابومحمد جعفر بن محمد بن نصیر خلدی نے حدیث بیان کی، ان سے ابواحمد جریری نے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت سہل بن عبداللہ تستری کو فرماتے ہوئے سنا: **لما بعث اللہ عز وجل النبی -صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم- کان فی الدنیا سبعۃ اصناف من الناس: الملوک والمزارعون واصحاب المواشی والتجار والصناع والاجراء والضعفاء والفقراء، لم یامر احدا منھم ان ینتقل مما ھو فیہ، ولکن امرھم بالعلم والیقین والتقویٰ والتوکل فی جمیع ما کانوا فیہ۔قال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ: وینبغی للعاقل ان یقول: ما ینبغی لی بعد علمی بانی عبدک ان ارجو واؤمل غیرک ولا اتوھم علیک اذ خلقتنی وصورتنی عبدا لک ان تکلنی الی نفسی او تولی اموری غیرک۔** جب اللہ رب العزت نے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دنیا میں مبعوث کیا تو اس وقت سات قسم کے لوگ دنیا میں آباد تھے۔ بادشاہ، کھیتی کرنے والے، جانور پالنے والے، تاجرین، دست کاران، مزدور، کمزور اور فقرا۔

---

(۱) المستدرک علی الصحیحین ۱/۸۱

آپ نے کسی کو بھی اپنا پیشہ بدلنے کا حکم نہیں دیا، بلکہ پیشے سے وابستگی کے ساتھ علم، یقین، تقویٰ اور توکل اختیار کرنے کا حکم دیا۔

سہل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

ایک صاحبِ عقل کے لیے یہ کہنا مناسب ہے: یہ جان لینے کے بعد کہ میں تیرا بندہ ہوں میرے لیے تیرے علاوہ کسی اور سے امید رکھنا مناسب نہیں ہے، نہ ہی اس وہم میں مبتلا ہونا مناسب ہے کہ تو مجھے اور میرے معاملات کو اپنے علاوہ کسی اور کے سپرد کر دے گا؛ کیوں کہ تو نے مجھے پیدا کیا ہے اور حسین صورت سے نوازا ہے۔

امام حاکم فرماتے ہیں:

''اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس جماعت کی توصیف فرمائی ہے جسے اللہ رب العزت نے چند صفات کی بنا پر دوسری جماعتوں سے ممتاز فرمایا ہے۔ جس شخص میں وہ صفتیں پائیں جائیں وہی اسمِ تصوف کا مستحق ہے۔''(۱)

محدثین میں سے حافظ ابونعیم اصفہانی نے اس حوالے سے سب سے تفصیلی گفتگو کی ہے۔ انھوں نے ''حلیۃ الاولیاء'' کی تالیف فرمائی۔ اس میں اعیانِ امت کے حالات ذکر کیے اور ہر ایک کے تذکرے میں جو تصوف کا رنگ تھا اسے ظاہر کیا، یہاں تک کہ ہر ایک کے تذکرے کے ساتھ ان کی نورانیت اور ربّانیت کی طرف اشارہ بھی کیا، پھر تصوف کی تعریف میں ہر شخصیت کے ایسے اقوال پیش کیے جو ان کے حال کی غمازی کرتے ہیں۔ یہی دقتِ نظری کتاب ''الحلیۃ'' کی کنجی ہے۔ اسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے امام سیدی احمد زروق ''قواعد التصوف'' میں فرماتے ہیں: تصوف میں اختلاف اسی وجہ سے ہے۔ حافظ ابونعیم نے ''الحلیۃ'' میں مذکور حضرات کے ذکر کے وقت ان کے حال کے مناسب ان کا کوئی قول یہ کہتے ہوئے ذکر کر دیا ہے کہ ''وقیل ان التصوف کذا''۔ اس سے اشارہ ملا کہ جسے صدقِ توجہ حاصل ہے اسے تصوف سے حصہ بھی حاصل ہے اور ہر ایک کا تصوف اس کی صدقِ توجہ ہے۔(۲)

(۳) حافظ ابوالفضل محمد بن طاہر قیسرانی: آپ نے ''صفۃ التصوف'' نامی کتاب تالیف فرمائی۔ یہ کتاب طبع ہو چکی ہے۔ اس میں آپ نے مختلف زمانوں میں مختلف امور کے حوالے سے صوفیہ کا مسلک ذکر کیا ہے اور سنت سے ان کے ہر فعل کی اصل؛ سند کے ساتھ بیان

---

(۱) المستدرک علی الصحیحین ر ۳ ر ۱۸

(۲) قواعد التصوف رص: ۱۴، دار البیروتی، سوریا، ۱۴۲۴ھ - ۲۰۰۴ء، تحقیق: محمود بیروتی

کرنے کی کوشش کی ہے۔(۱)

(۴) محدث فقیہ ابوبکر بن عربی اشبیلی مالکی صاحب "عارضۃ الاحوذی": آپ نے "سراج المریدین" نامی کتاب تالیف کی۔ اس کتاب کو بعض لوگ محدثین کا تصوف گمان کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ سیدی احمد زروق نے "قواعد التصوف" میں فرمایا: "**وللمحدث تصوف حام حوله ابن العربی فی سراجه۔**" (۲) محدثین کا ایک نمایاں رنگِ تصوف ہے جس کا ذکر ابن عربی نے اپنی کتاب "سراج المریدین" میں کیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ تصوف کے حوالے سے محدثین کے نزدیک بنیادی قاعدہ حافظ ذہبی کا وہ قول ہے جو "سیر اعلام النبلاء" میں مذکور ہے کہ جب عالم تصوف سے نا آشنا ہو تو وہ بے روح ہے، جیسا کہ صوفی جب سنت سے ناواقف ہو تو وہ گم راہ ہے۔(۳)

(ب) نبی کریم ﷺ سے والہانہ محبت

"حافظ ذہبی "سیر اعلام النبلاء" میں فرماتے ہیں:

امام محمد نے فرمایا کہ میں نے حضرت عبیدہ سے کہا: "**ان عندنا من شعر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیه وسلم شیئا من قبل انس بن مالک! فقال: لأن یکون عندی منه شعرة احب الی من کل صفراء وبیضاء علی ظهر الارض۔**"

ہمیں حضرت انس بن مالک کے طریق سے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے کچھ موئے مبارک ملے ہیں۔ اس پر حضرتِ عبیدہ نے فرمایا: مجھے آپ کا موئے مبارک روئے زمین پر موجود ہر قسم کے سیم وزر سے زیادہ محبوب ہے۔

میں کہتا ہوں: حضرت عبیدہ کا یہ قول ان کے کمالِ محبت کی دلیل ہے کہ وہ لوگوں کے سونے چاندی پر نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے موئے مبارک کو فضیلت دیتے تھے۔ سرکار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وفات کے پچاس برس بعد عبیدہ اس طرح کی بات فرما رہے ہیں۔ اگر ہمیں درست وثابت ذرائع سے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا کوئی بال شریف، نعلین کا ٹکڑا، ناخن کا تراشا، مستعمل برتن کا کوئی

---

(۱) کتاب صفۃ التصوف کی اشاعت دار المنتخب العربی، للدراسات والنشر والتوزیع، بیروت، لبنان ۱۴۱۶ھ-۱۹۹۵ء میں غادۃ المقدم عدرۃ کی تحقیق کے ساتھ ہوئی

(۲) قواعد التصوف/ص: ۱۴

(۳) سیر اعلام النبلاء/ ۱۵/ ۴۱۰

حصہ مل جائے تو ہم اپنے وقت میں کیا کہیں گے!
اگر کوئی مال دار اپنے مال کا ایک بڑا حصہ کسی ایسی ہی نعمت کے حصول میں خرچ کر دے، تو کیا تم اسے فضول خرچ یا بے وقوف گمان کرو گے؟ ہر گز نہیں! تم اپنا مال اس مسجد کی زیارت کے لیے جو آپ کے دست اقدس سے بنائی گئی ہے خرچ کرو اور ان کے شہر میں ان کے حجرے کے پاس کھڑے ہو کر ان پر سلام بھیجنے کے لیے مال صرف کرو، احد پہاڑ پر نظریں جما کر لذت حاصل کرو اور اس سے والہانہ محبت کرو؛ کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس سے محبت فرمایا کرتے تھے، ان کے روضے اور قیام گاہ پر نگاہ ڈال کر اپنی آنکھوں کو سرور بخشو؛ کیوں کہ تم اس وقت تک مومن کامل نہیں ہو سکتے جب تک کہ آقائے کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تمھارے نزدیک تمھاری جان، اولاد، اموال اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جائیں۔ اس معظم و محتشم پتھر کا بوسہ لو جو جنت سے نازل ہوا، اپنا منھ اس جگہ پر رکھو جسے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے چوما ہے۔ اللہ رب العزت نے تمھیں جس نعمت سے نوازا ہے اس میں برکتیں عطا فرمائے گا، اس سے بڑھ کر تمھارے لیے اور کوئی چیز فخر کی بات نہیں ہے۔ پھر اگر ہمیں اس لکڑی کو بوسہ دینے کا موقع مل جائے جس سے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حجر اسود کی طرف اشارہ فرمایا تھا، تو ہمارے لیے درست ہے کہ ہم اس لکڑی کا بوسہ لیں اور اس کی تعظیم کے لیے اس کے پاس جمع ہو جائیں۔ لیکن ہم بالیقین جانتے ہیں کہ حجر اسود کو چومنا، لکڑی اور نعلین چومنے سے زیادہ افضل وارفع ہے۔
حضرت ثابت بنانی جب حضرت انس بن مالک کو دیکھتے تو آپ کا ہاتھ پکڑ کر چوم لیتے اور فرماتے: "**ید مسّت ید رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ و سلم۔**" یہ وہ مقدس ہاتھ ہے جو نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دست مبارک سے مسّ ہوا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ جب ایسے ہاتھوں کو چومنے کا ہمیں موقع نہ مل سکا تو وہ مقدس حجرِ اسود زمین پر اللہ کے دست غیب کی مانند ہے، اسے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لبہائے مبارکہ نے چوما ہے۔ چناں چہ جب تم حج نہ کر سکو تو حاجیوں کے آنے کے بعد کسی حاجی کے منھ کا بوسہ لے لو اور کہو: یہ ایسا منھ ہے جس نے اس پتھر کا بوسہ لیا ہے جسے میرے مقدس نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے چوما ہے۔(۱)

---

(۱) سیر اعلام النبلاء، ۴/۴۲

حافظ ذہبی ''سیر اعلام النبلاء'' میں مزید فرماتے ہیں:

''جو حجرہ مقدسہ کے پاس ذلیل وخوار ہوکر، ظاہری وباطنی احترام وتواضع کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر درود پڑھتے ہوئے کھڑا ہوتو اس کے لیے مبارک بادی ہے، اس نے اچھی طرح زیارت کی اور خوب عاجزی اور محبت کا اظہار کیا اور اس انسان سے زائد عبادت انجام دی جو اپنے وطن میں رہتے ہوئے یا نماز میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر درود پڑھے؛ کیوں کہ زائر کے لیے زیارت اور درود دونوں کا اجر ہے، جب کہ دوسرے شہروں میں درود پڑھنے والے کے لیے صرف درود کا اجر ہے۔

جو آپ پر ایک مرتبہ درود پڑھے اللہ رب العزت اس پر دس رحمتیں نازل فرمائے گا، لیکن جس نے آپ کی زیارت کی اور آدابِ زیارت کا لحاظ نہ کیا یا قبر کو سجدہ کیا یا اور کوئی غیر مشروع عمل کیا تو اس نے اچھے اور برے دونوں کام انجام دیے، ایسے شخص کو نرمی اور محبت سے بتایا جائے اور اللہ غفور ورحیم ہے۔

باخدا! کسی مسلم کو اضطراب، آہ وفغاں، دیوار بوسی، بہ کثرت گریہ زاری کی کیفیت اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے جب کہ وہ اللہ عزوجل اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے محبت کرنے والا ہو۔ لہٰذا محبت ہی معیار ہے اور اہلِ جنت اور اہلِ جہنم کے درمیان خطِ امتیاز ہے۔

ان کے قبر کی زیارت تمام نیکیوں سے افضل ہے۔ انبیا واولیا کے قبور کی طرف سفر کرنے کے حوالے سے اگر ہم یہ مان لیں کہ اس کی اجازت نہیں ہے؛ کیوں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا فرمان **''لاتشدوا الرحال الا الی ثلاثۃ مساجد''** عام ہے، پھر بھی نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف سفر مسجدِ نبوی کی طرف سفر کو مستلزم ہے اور یہ بلانزاع مشروع ہے، اس لیے کہ آپ کے حجرہ مبارکہ تک رسائی اسی صورت میں ہوگی جب کہ مسجد میں دخول ہوجائے۔ تو چاہیے کہ زائر تحیت المسجد سے آغاز کرے، پھر صاحبِ مسجد پر سلام وتحیّت پیش کرے۔ رزقنا اللہ وایاکم ذٰلک آمین!''(۱)

امام ذہبی نے **''معجم الشیوخ''** میں اپنی سند سے نقل فرمایا:

''ان ابن عمر کان یکرہ مس قبر النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔'' حضرت

---

(۱) سیر اعلام النبلاء، ۴/ ۴۸۵

عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی قبر شریف چھونے کو ایک ناپسندیدہ عمل تصور کرتے تھے۔

میں (حافظ ذہبی) کہتا ہوں کہ وہ قبر کو چھونا اس لیے ناپسند کرتے تھے؛ کیوں کہ وہ اسے بے ادبی خیال کرتے تھے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے قبر نبوی شریف چھونے اور چومنے کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ قول ان سے ان کے صاحب زادے عبداللہ بن احمد نے روایت کیا ہے۔

اگر کہا جائے کہ پھر صحابہ نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ جواب دیا جائے گا کیوں کہ انھوں نے تو سرکار دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو حیاتِ ظاہری میں دیکھا، آپ کی صحبتِ ظاہری سے فیض یاب ہوئے، آپ کے دستِ اقدس کا بوسہ لیا، آپ کے غسالۂ وضو کو حاصل کرنے کے لیے ایسا لگتا کہ وہ آپس میں قتال کر بیٹھیں گے، حج اکبر کے دن انھوں نے آپ کے موہائے مبارکہ آپس میں تقسیم کر لیے، آپ کے آب بینی ولعاب مبارک زمین پر نہ گرنے پاتے، بلکہ کوئی نہ کوئی ہاتھ میں لے لیتا اور اسے اپنے چہرے پر مل لیتا۔ ہمیں جب اس طرح کے اعلیٰ مواقع میسر نہیں آئے تو ہم ان کی قبر مبارک کی تعظیم واستلام اور اس کا بوسہ لینے کے لیے ہی گر پڑے۔

کیا آپ نہیں دیکھتے کہ حضرت ثابت بنانی نے کیا کیا! آپ حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ کا ہاتھ چومتے، اسے اپنے چہرے سے مس کرتے اور فرماتے تھے: ”**ید مست ید رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔**“ یہ وہ مبارک ہاتھ ہے جو رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دست اقدس سے مس ہوا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے فرطِ محبت ہی ان امور کی محرک ہے؛ کیوں کہ اسی چیز کا ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم اللہ عزوجل اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اپنی جان، اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبت کریں، اپنے اموال، جنت اور اس کی حوروں سے بھی زیادہ۔“ (۱)

پھر امام ذہبی نے یہاں تک فرمایا:

”آپ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی فرطِ محبت نہیں دیکھ رہے

---

(۱) معجم الشیوخ (المعجم الکبیر) ۱/ ۷۳، مکتبۃ الصدیق، الطائف، المملکۃ العربیۃ السعودیۃ، ۱۴۰۸ھ-۱۹۸۸ء، تحقیق: ڈاکٹر محمد حبیب ہیلہ

ہیں! انھوں نے عرض کی: "الا نسجد لک؟" اگر آپ انھیں سجدے کی اجازت دیتے تو وہ سجدۂ تعظیم وتوقیر بجالاتے، نہ کہ سجدہ عبادت، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے انھیں کیا تھا۔ ایسا ہی قول اس مسلمان کے تعلق سے بھی ہے جو رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی قبر شریف کو بطورِ تعظیم سجدہ کرے کہ اس کی اصلا تکفیر نہیں کی جائے گی، وہ صرف گنہ گار ہوگا۔ اسے بتایا جائے گا کہ یہ ممنوع ہے۔ اسی طرح قبر مبارک کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا بھی معاملہ ہے۔"

(ج) اہلِ بیت سے تعلق اور صالحین سے تبرک

(۱)۔ حافظ خطیب بغدادی "**تاریخِ بغداد**" میں اپنی سند سے ابو علی خلال کا یہ قول نقل فرماتے ہیں:

"**ماھمنی امر فقصدت قبر موسیٰ بن جعفر فتوسلت بہ الا سھل اللہ تعالیٰ لی مااحب**۔" (۱) مجھے جب بھی کوئی معاملہ درپیش ہوا تو میں حضرت موسیٰ بن جعفر کی قبر پر حاضر ہوا اور ان کے وسیلے سے اللہ رب العزت کی بارگاہ میں دعا کی، تو اللہ رب العزت نے میرے اس معاملے کو آسان فرما دیا۔

(۲)۔ امام حافظ ابو حاتم محمد بن حبان تمیمی بستی "**کتاب الثقات**" میں امام علی بن موسیٰ رضا بن جعفر صادق بن محمد باقر بن علی زین العابدین بن حسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے تذکرے میں فرماتے ہیں:

"آپ کی قبر سناباذ میں خلیفہ ہارون رشید کے بغل میں ہے، یہ نوقان سے باہر کا علاقہ ہے، زیارت کے لیے مشہور ہے، میں نے کئی دفعہ اس کی زیارت کی ہے۔ طوس میں قیام کے دوران مجھے جب بھی کوئی پریشانی لاحق ہوئی تو میں نے حضرت علی بن موسیٰ رضا صلوات اللہ علی جدہ وعلیہ کی قبر پر حاضر ہو کر اللہ تعالیٰ سے نجات کی دعا کی، تو اللہ رب العزت نے میری دعا قبول فرمائی اور مجھے اس پریشانی سے نجات بخشی۔ اس چیز کا میں نے کثرت سے تجربہ کیا ہے اور اسے ویسے ہی پایا ہے۔ اللہ رب العزت ہمیں نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور اہلِ بیت کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی الفت ومودت میں موت عطا فرمائے۔" (۲)

---

(۱) تاریخ بغداد ۱/۴۴۲، دار الغرب الاسلامی، بیروت، لبنان، ۱۴۲۲ھ-۲۰۰۱ء، تحقیق: ڈاکٹر بشار عواد معروف۔ ابن جوزی نے اپنی سند سے "المنتظم ۹/۸۹" میں اسے ذکر کیا ہے

(۲) الثقات ۸/۴۵۷، دائرۃ المعارف العثمانیۃ، الھند، ۱۳۹۳ھ-۱۹۷۳ء

(۳)۔ امام حافظ ابونصر بن ماکولا ”الاکمال فی رفع الارتیاب، عن المو تلف والمختلف فی الاسماء والکنی والالقاب“ میں فرماتے ہیں:

”فھو ابو علی بن بیان الزاھد، من اھل دیر العاقول، له کرامات، وقبره فی ظاھرھا یتبرک به، وقد زرته۔“ (۱) ابوعلی بن بیان زاہد ”دیر عاقول“ کے باشندے ہیں۔ صاحبِ کرامات ہیں، ان کی قبر سے برکت حاصل کی جاتی ہے، میں نے بھی اس کی زیارت کی ہے۔

(د) تصوف سے تعلق رکھنے والے اکابر محدثین

(۱) امام ابوعبداللہ فراوی: امام نووی ”شرح صحیح مسلم“ میں فرماتے ہیں: ابوعبداللہ فراوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فقہ واصول وغیرہ کے ماہر امام تھے، اسانیدِ صحیحہ عالیہ سے ان سے کثیر روایتیں مروی ہیں، اکنافِ عالم سے طلبہ ان کے پاس سفر کر کے آتے۔ قرب وبعد کے علاقوں اور شہروں میں ان سے خوب روایتیں پھیلیں۔ یہاں تک کہ علما نے فرمایا: ”للفراوی الف راوی“۔ فراوی کے ہزار روای ہیں۔ آپ کو ”فقیہ الحرم“ بھی کہا جاتا تھا؛ کیوں کہ آپ نے مکہ مکرمہ میں خوب علم کی اشاعت کی۔ امام حافظ ابوالقاسم دمشقی معروف ابن عساکر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے آپ کا ذکر کیا ہے اور وہ آپ کی شایانِ شان تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ پھر امام ابوالحسین سے امام عبدالغافر نے روایت کی کہ انھوں نے ان کا ذکر کیا اور فرمایا: ”ھو فقیه الحرم البارع فی الفقه والاصول، الحافظ للقواعد، نشا بین الصوفیة فی حجورھم ووصل الیه برکات انفاسھم۔“ (۲) فراوی فقیہِ حرم، فقہ واصول کے ماہر، قواعدِ فن کے حافظ ہیں، صوفیہ کی آغوش میں پرورش پائی اور ان کی برکتوں سے بہرہ ور ہوئے۔

یہاں میں آپ کو متنبہ کردوں کہ ہم امام فراوی کے حوالے سے گفتگو کر رہے ہیں اور امام نووی نے ابن عساکر از عبدالغافر بن اسماعیل بن عبدالغافر فارسی، ادیب، امام، محدث بن محدث بن محدث، ”ذیل تاریخِ نیسابور“ جیسی کئی کتابوں کے مولف، (۳) سے آپ کی تعریف نقل کی

---

(۱) الاکمال ۱/۳۶۷، دائرۃ المعارف العثمانیۃ، الھند، ۱۳۸۳ھ- ۱۹۶۳ء، تحقیق: عبدالرحمٰن بن یحییٰ معلمی یمانی

(۲) شرح النووی علی صحیح مسلم ۱/۷

(۳) جیسا کہ امام نووی نے شرح صحیح مسلم ۱/۹ میں ذکر کیا ہے

ہے کہ آپ نے صوفیہ کی آغوشِ تربیت میں نشو ونما پائی۔ یہ تمام حضرات محدثین وحفاظ ہیں۔ یہ تصوف اور صوفیہ کے حوالے سے ان کی تعظیم وتوقیر کی مثال ہے۔

(۲) حافظ ابواحمد محمد بن عیسیٰ نیشاپوری جلودی: امام نووی فرماتے ہیں:

''امام حاکم ابوعبداللہ نے فرمایا: ابواحمد جلودی شیخ صالح تھے، زاہد اور بڑے عبادت گزار صوفیہ میں سے تھے۔ محققین اکابر مشائخ کی آپ نے صحبت پائی، کتابوں کے نسخے تیار کر کے روزی حاصل کرتے، ابوبکر بن خزیمہ اور ان کے متقدمین علما سے روایتیں سنیں۔ حضرت سفیان ثوری کے مذہب پر عامل تھے۔ آپ کی وفات سہ شنبہ ۲۴/ ذی الحجہ ۳۶۸ھ میں اسّی برس کی عمر میں ہوئی۔ امام حاکم نے فرمایا: ان کی وفات سے صحیح مسلم کا سماع ختم ہوگیا۔ جس نے ان کے بعد ابراہیم بن محمد بن سفیان وغیرہ سے حدیث بیان کی وہ ثقہ نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔'' (۱)

یہ امام جلودی محدث، صوفی، زاہد ہیں، ان پر امام مسلم بن حجاج کی صحیح کا مدار ہے۔ ان کا تصوف ان کے لیے باعثِ برکت اور حصولِ نور کا سبب تھا، عیب ونقص کا ذریعہ نہیں تھا۔

(۳) حافظ امام مجود علامہ شیخ الحرم ابوذر عبد بن احمد بن محمد بن عبداللہ بن غفیر بن محمد: یہ اپنے شہر میں ابن سماک سے معروف ہیں، انصاری خراسانی ہروی مالکی ہیں۔ امام ذہبی فرماتے ہیں:

''صاحب التصانیف وراوی الصحیح عن الثلاثة المستملی والحموی والکشمیهنی۔'' ابوذر کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور مستملی، حموی، **کشمیهنی** تینوں سے صحیح کے راوی ہیں۔

یہاں تک کہ فرمایا:

''قال عبدالغافر بن اسماعیل فی ''تاریخ نیسابور'': کان ابوذر زاهدا، ورعا، عالما، سخیا، لایدخر شیئا وصار من کبار مشیخة الحرم مشارا الیه فی التصوف خرج علی الصحیحین تخریجا حسنا وکان حافظا کثیر الشیوخ۔'' (۲) امام عبدالغافر بن اسماعیل نے ''تاریخ نیشاپور'' میں فرمایا کہ ابوذر زاہد، متقی، عالم اور سخی تھے، اپنے پاس کوئی چیز جمع کر کے نہ رکھتے، اکابر مشائخِ حرم میں آپ کا شمار ہوتا ہے، تصوف کے حوالے سے مرجعِ خلائق تھے،

---

(۱) شرح النووی علی صحیح مسلم ۱/۱۷

(۲) سیر اعلام النبلاء ۱۷/ ۵۵۹

صحیحین بخاری و مسلم کی عمدہ تخریج بھی فرمائی ہے، آپ حافظِ احادیث اور کثیر مشائخ سے سماع رکھتے تھے۔

(ہ) قبروں کے پاس درس و مطالعۂ حدیث

امام حافظ ابوعمرو بن صلاح "**صیانۃ صحیح مسلم**" میں ضبطِ راوی کے تعلق سے اختلافات ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"وہ میرے نزدیک اصل سے منتخب نسخے کے مطابق درست ہے، اس میں ہمارے شیخ ابوالحسن طوسی کے سماع کا تذکرہ ہے اور اس نسخے پر ان کے شیخ فراوی کی تحریر بھی ہے، اس میں امام مسلم کی قبر کے پاس ان سے صحیح مسلم پڑھنے کا ذکر ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔" (۱)

"**المقدمۃ**" میں انھوں نے یہ بھی فرمایا:

"جب میں نے نیشا پور میں شیخ مسند ابوالحسن المؤید بن محمد بن علی مقری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے پاس حدیث پڑھی تو انھوں نے مجھے خبر دی کہ میں نے ایک مرتبہ امام مسلم بن حجاج کی قبر کے پاس حدیث پڑھی ہے، پھر انھوں نے یہ سند بیان فرمائی: **اخبرنا فقیہ الحرم ابوعبد اللہ محمد بن فضل الفراوی عند قبر مسلم۔** آخرِ سند تک۔" (۲)

یہ محدثین و حفاظ ہیں جو حدیث کی بڑی کتابیں ان کے مولفین حفاظ و محدثین کی قبروں کے پاس پڑھا کرتے، اس پر فخر کرتے اور یہ بات پوشیدہ نہ رکھتے، بلکہ اسے اپنی کتابوں میں تحریر کرتے اور اسانیدِ روایت سے مزین کرتے۔

(و) میلادِ نبوی کے موضوع پر تالیفات

حفاظ اور ناقدینِ حدیث کی ایک کثیر تعداد نے مولدِ نبوی کے تعلق سے کتابیں تالیف کی ہیں۔ ان میں سے چند کے اسما درج ذیل ہیں:

(۱) حافظ ابوالخطاب عمر بن دحیہ کلبی اندلسی: میلادِ نبوی پر آپ کی ایک عظیم کتاب ہے، جس کا نام "**الدر المنظم فی المولد المعظم**" ہے۔ اس کتاب میں اندلس اور مراقش کی بڑی بڑی شخصیتوں کی اسانید عالیہ اور روایات موجود ہیں۔ لیکن اسے آپ مکمل نہیں کر سکے، اس کی

---

(۱) صیانۃ صحیح مسلم من الاخلال والغلط وحمایتہٗ من الاسقاط والسقط ص: ۱۲۶، دار الغرب الاسلامی، بیروت، ۱۴۰۸ھ

(۲) مقدمۃ ابن الصلاح ص ۲۰۴

تکمیل آپ کے صاحب زادے محدث محمد بن احمد سلطان سبتہ ابوالقاسم عزفی نے کی۔ حافظ ابن حجر نے اس کتاب کے تعلق سے اپنی سند بیان کی ہے۔ مسند الدنیا سید عبدالحی کتانی نے فرمایا: اگر طوالت کا خوف نہ ہوتا تو میں ضرور ان کی کتاب سے بطورِ نمونہ ایک فصل ذکر کرتا تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ میلادِ نبوی کے تعلق سے متأخرین کی کتابوں میں چھٹی اور ساتویں صدی کے مؤلفین کی کتابوں کی صرف تھوڑی سی جھلک ملتی ہے۔

(۲) حافظ ابن کثیر: آپ "**التفسیر**، "**البدایة والنهایة**" کے مؤلف اور ابن تیمیہ کے شاگرد ہیں۔ سید عبدالحی کتانی فرماتے ہیں:

یہ بہت تعجب کی بات ہے کہ ابن تیمیہ کے اصحاب بھی میلاد پر کتابیں لکھنے والوں کی فہرست میں شامل ہیں۔

(۳) حافظ زین الدین عراقی: آپ کی کتاب کا نام "**المورد الهنی فی المولد السنیٔ**" ہے۔ یہ ایک جلد میں شائع ہو چکی ہے۔

(۴) حافظ نورالدین ہیثمی: آپ "**مجمع الزوائد**" کے مؤلف ہیں۔ ان کی میلاد پر ایک بڑی کتاب ہے۔ اس پر شیخ حجاز بن عبدالمطلب عدوی کا حاشیہ ہے، جو کہ تیرھویں صدی ہجری کے علما میں سے ہیں۔

(۵) حافظ شمس ابن جزری: ان کی دو کتابیں ہیں: "**التعریف بالمولد الشریف**" اور اس کا اختصار "**عرف التعریف فی المولد الشریف**" کے نام سے آپ نے تیار کیا ہے۔

(۶) حافظ ابن ناصر الدین دمشقی: آپ کی کتاب "**جامع الآثار فی مولد النبی المختار**" ہے۔ یہ بھی شائع ہو چکی ہے۔

(۷) حافظ ابن حجر عسقلانی: ان کی بھی میلاد پر ایک کتاب ہے، جس کا ذکر علامہ شیخ محمد بن علی شنوانی نے "**الدرر السنية**" میں کیا ہے۔

(۸) حافظ جلال الدین سیوطی: میلاد پر آپ کی کتاب "**حسن المقصد فی عمل المولد**" ہے۔ ان کے علاوہ کثیر حفاظ ومحدثین اور صاحبانِ آثار ہیں جن کی تعداد سو سے زائد ہے۔ مسند الدنیا سید محمد عبدالحی کتانی نے ان تمام کا ذکر "**التآلیف المولدية فی التعریف بما افرد بالتصنیف فی المولد الشریف**" نامی ایک کتاب میں کیا ہے اور اس میں انھوں نے کافی محنت کی ہے۔(۱)

---

(۱) التآلیف المولدیۃ، دارالحدیث الکتانیۃ، طنجۃ، المملکۃ المغربیۃ، ۱۴۳۲ھ-۲۰۱۱ء

(ز) نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے توسل

امیر المومنین فی الحدیث امام احمد بن حنبل نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے توسل کے قائل تھے۔ ابن تیمیہ نے "مجموع الفتاویٰ" میں اسے ذکر کیا ہے اور کہا ہے:

"ولذلک قال احمد فی منسکه الذی کتبه للمروذی صاحبه انه یتوسل بالنبی فی دعائه۔" (۱) یہی وجہ ہے کہ امام احمد نے مناسکِ احمد للمروزی میں فرمایا ہے کہ وہ دعا میں نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے توسل کیا کرتے تھے۔

بعد میں حضراتِ حنابلہ نے اس کی تصریح کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے توسل مستحب ہے۔ ابن مفلح نے "الفروع" میں کہا ہے:

"ویجوز التوسل بصالح وقیل یستحب۔ قال احمد فی منسکه الذی للمروذی انه یتوسل بالنبی صلی اللہ تعالیٰ علیه وسلم فی دعائه وجزم به فی المستوعب وغیره۔" (۲) صالحین سے توسل جائز ہے اور ایک قول کے مطابق مستحب بھی ہے۔ امام احمد نے مناسکِ احمد للمروزی میں فرمایا ہے کہ وہ دعا میں نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے توسل کیا کرتے تھے۔ مستوعب وغیرہ میں بھی اسی پر جزم کیا گیا ہے۔

اسی موقف پر اکابر حفاظ اور ناقدینِ حدیث کی ایک بڑی تعداد ہے۔ یہاں تک کہ امیر المومنین فی الحدیث حافظ ابن حجر عسقلانی نے اپنے دیوان میں فرمایا ہے:

یاسیدی یارسول اللہ قد شرفت
قصائدی بمدیح فیک قد وصفا

اے میرے آقا! اے اللہ کے رسول! (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) آپ کی مدحت سرائی سے میرے قصیدے کو شرف حاصل ہو گیا۔

مدحتک الیوم ارجو الفضل منک غدا
من الشفاعة فالحظنی بها طرفا

آج میں نے آپ کی ثنا خوانی کی ہے، کل بہ روزِ قیامت شفاعت کی صورت میں آپ کے فضل وکرم کا امیدوار ہوں، میری طرف نظرِ رحمت فرمایئے گا۔

---

(۱) مجموع الفتاویٰ ۱/۱۴۰

(۲) الفروع ۲/۱۲۷

اجزت کعبا فحاز الرفع من قدم
علی الرؤوس ونال البشر والتحفا

آپ نے حضرت کعب کو چادر عنایت فرمائی تو ان کا مرتبہ اس قدر بڑھا کہ ان کے قدم لوگوں کے سروں پر پہنچ گئے اور انھیں بشارتیں وتحائف حاصل ہوئے۔

وقد الفت قیامی فی المدیح الی
ان قال من لام قد ابصرته الفا

میں آپ کی مدحت سرائی میں اس قدر مشغول ہو گیا کہ ملامت کرنے والوں نے کہا کہ میں آپ کی محبت میں جنون ووارفتگی کا شکار ہو گیا ہوں۔

بباب جودک عبد مذنب کلف
یا احسن الناس وجها مشرقا وقفا

آپ کے بابِ سخاوت پر ایک خطا کار وعصیاں شعار کھڑا ہے۔ اے وہ ذات جس کا چہرہ حسن میں سارے لوگوں سے بڑھ کر ہے اور جس کا سر سب سے بلند ہے۔

بکم توسل یرجو العفو عن زلل
من خوفه جفنه الهامی لقد ذرفا

یہ غلام آپ ہی کے وسیلے کا طالب اور ان گناہوں کی بخشش کا خواست گار ہے، جن کے خوف سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔

وان یکن نسبة یعزیٰ الی حجر
فطالما فاض عذبا طیبا وصفا[۱]

اگر چہ اس کی نسبت حجر کی طرف ہے، لیکن اس سے بھی کبھی کبھی صاف ستھرا شیریں چشمہ پھوٹ پڑتا ہے۔

یہ بھی انھی کے اشعار ہیں:

وارسله اللہ المهیمن رحمة
فلیس له فی المرسلین مماثل

اللہ رب العزت نے انھیں سراپا مہربان بنا کر بھیجا، سارے رسولوں میں ان کا کوئی ہم پلہ نہیں۔

فما تبلغ الاشعار فیه ومدحه
به ناطق نص الکتاب وناقل

---

(۱) دیوان الحافظ ابن حجر ص: ۱۶، المکتبۃ العربیۃ، حیدر آباد، الہند، ۱۳۸۱ھ - ۱۹۶۲ء

میرے اشعار ان کی مدحت سرائی نہیں کر سکتے، ان کی مدحت تو کتاب اللہ کی آیتیں کر رہی ہیں۔

نعم ان فی کعب وحسان اسوة
وغیرهما، فلیهن من هو فاضل

ہاں! کعب، حسان وغیرہ کی ذات میں ہمارے لیے اعلیٰ نمونہ ہے تو ہر صاحبِ فضل وکمال کو چاہیے کہ ان کی بارگاہ میں اپنے آپ کو کم تر ظاہر کرے۔

فهات فان یسعدک بالمدح مِقوَل
فانک فی ظل السعادة قائل

ان کی تعریف کیجیے، اگر ان کی مدحت سرائی میں کوئی ایک جملہ بھی نکل جائے، تو یہ تمھارے لیے سعادت مندی کی بات ہے۔

ولی ان توسلت الهناء بمدحه
لانی مستجد هناک وسائل(۱)

اگر میں آپ کی مدحت کے ذریعے مسرت وشادمانی طلب کروں؛ تو ضرور میں سوال کرنے اور مراد پانے والا ہوں گا۔

(ح) محدثین کی دعائیں

جو ابوعبدالرحمٰن سلمی کی کتاب ”الفتوۃ“ کا مطالعہ کرے گا اور عاصیوں کے ساتھ صوفیہ کی عفو ودرگزر اور ان کی شفقت کے مظاہر دیکھے گا تو اسے حیران کن باتیں ملیں گی۔ دراصل جو صوفیہ کا منہج ہے وہی حفاظ وناقدین محدثین کا بھی مسلک ہے۔

حافظ خطیب بغدادی ”تاریخ بغداد“ میں فرماتے ہیں:

”مجھے ازہری نے خبر دی، وہ فرماتے ہیں کہ مجھے احمد بن ابراہیم بن شاذان نے خبر دی، ان سے ابوعیسیٰ عبدالرحمٰن بن زاذان بن یزید بن مخلد رزاز نے – قطیعۃ بنی جدار – میں حدیث بیان کی۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں شہر میں بابِ خراسان کے پاس تھا، ہم نے امام احمد بن حنبل کی موجودگی میں وہاں بیٹھ کر نماز پڑھی۔ میں نے انھیں فرماتے ہوئے سنا: ”**اللهم من کان علی غیر هدی او علیٰ رای، وهو یظن انه علی الحق، فرده الی الحق، حتی لا یضل من هٰذه الامة احد۔**“(۲)

---

(۱) دیوان الحافظ ابن حجر، ص: ۲۲

(۲) تاریخ بغداد، ۱۰/ ۲۸۷، حافظ ابن عساکر نے خطیب کی سند سے ”تاریخ دمشق ۵/ ۳۲۰“ میں اسے ذکر کیا ہے اور حافظ مزی نے بھی ”تہذیب الکمال ۱/ ۴۶۴“ میں خطیب کی سند سے بیان کیا ہے۔

اے اللہ! اس امت کا اگر کوئی فرد حق پر نہ ہو یا کسی رائے پر قائم ہو اور حق پر ہونے کا گمان رکھتا ہو تو اسے حق کی طرف لوٹا دے تا کہ اس امت کا کوئی فرد گم راہ نہ ہونے پائے۔

بلکہ حالتِ سجدہ میں امام احمد دعا کیا کرتے تھے:

”**اللهم من كان من هٰذه الامة على غير الحق، وهو يظن انه على الحق، فرده الى الحق، ليكون من اهل الحق۔**“ اے اللہ! اگر اس امت کا کوئی فرد حق پر نہ ہو اور وہ اپنے آپ کو حق پر گمان رکھتا ہو تو اسے حق کی طرف لوٹا دے تا کہ وہ اہلِ حق سے ہو جائے۔ نیز کہا کرتے تھے: ”**اللهم ان قبلت عن عصاة امة محمد -صلى الله تعالىٰ عليه وسلم- فداءً فاجعلني فداهم**“۔

اے اللہ! اگر تو امتِ محمدیہ کے گنہ گاروں کی طرف سے کوئی فدیہ قبول فرمائے تو مجھے ہی ان کے فدیے میں قبول فرما لے۔

اسے ابویعلیٰ نے ”ذیل طبقات الحنابلة“ میں نقل کیا ہے۔(۱)

بلا قیل وقال محدثین وحفاظ تصوف اور صالحین سے محبت اور تعلقِ خاطر رکھتے ہیں۔ انھیں ان سے کوئی کینہ اور تعصب نہیں ہے۔ ان سب کے عقائد محفوظ اور صاف ہیں۔ وہ عقائد میں صاحبانِ بصیرت وتحقیق ہیں، خطا ونقص نے ان کی جانب بالقصد راہ نہیں پائی۔ اللہ رب العزت کے حق میں کیا محال ہے، کیا جائز ہے، کیا واجب ہے اس بارے میں وہ دقتِ نظر رکھتے ہیں۔ نہ وہ شرک وکفر کے بھنور میں پھنسے اور نہ ان کے قدم ڈگمگائے۔ بلکہ وحی شرعی کے اشارات، مفاہیم، ظاہر وخفی مدلولات کو سمجھتے ہیں۔ پھر صاف وشفاف تصوف کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ دوسروں سے زیادہ بدعت، دین میں زیادتی اور شرعی حدود سے تجاوز کو ناپسند کرتے ہیں۔

حرف اختتام

اخیر میں عرض ہے کہ نہایت ہی عجلت میں لکھی گئی یہ ابتدائی تحریر ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ مزید تحقیق وتفتیش کے بعد میں اس پر تفصیلی گفتگو کروں گا۔ تا کہ معاملہ صاف وشفاف ہو جائے اور نتیجتاً اس حوالے سے محدثین کی اتنی بڑی جماعت کا موقف سامنے آ جائے کہ کسی کے لیے اس میں شک کی گنجائش نہ رہے کہ بابِ عقائد میں محدثین کا منہج درست ہے اور چند حضرات کے علاوہ

---

(۱) ذیل طبقات الحنابلة ۱/۳۰۷، دار المعرفة، تحقیق: محمد حامد فقی، یہ ابن کثیر کی ”البدایة والنھایة ۱۰/۳۲۹، مکتبة المعارف، بیروت“ میں بھی مذکور ہے۔

جمہور محدثین حضراتِ اشاعرہ وماتریدیہ کے عقائد پر ہیں۔ وہ صاف وشفاف تصوف کی جانب اپنی نسبت کرتے ہیں، اس کی عظمتِ شان بیان کرتے ہیں اور ہر طرح کی آمیزش اور کدورتوں سے تصوف کو پاک کرنے کے لیے تحقیق وتدقیق کرتے ہیں۔ واللہ تعالیٰ من وراء القصد وصلی اللہ تعالیٰ علی سیدنا محمد وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ وسلم۔

OOO

غلام مصطفیٰ ازہری

قبول حدیث میں مسلک اعتدال کی تحقیق اور صوفیہ کے معیار و منہاج کی تفہیم و توضیح

اسلامی علوم وفنون مختلف حصوں میں بٹے ہوئے ہیں، ہر فن کے ماہرین الگ الگ ہیں، ان علوم وفنون کا جامع شخص ہی صحیح معنوں میں دین کا مقتدی اور پیشوا ہے۔ یہ علوم؛ حدیث، فقہ، عقیدہ اور احسان وسلوک ہیں۔

چنانچہ جو شخص علم حدیث نہیں جانتا وہ شریعت کے چشمۂ اول سے دور ہے، وہ قرآن نہیں سمجھ سکتا، کیونکہ قرآن کی تفہیم وتفسیر حدیث پر موقوف ہے۔

اسی طرح جس کے اندر فقہ شریعت اور فہم سنت نہیں ہے وہ مسائل فقہ کا حافظ تو بسا اوقات ہوسکتا ہے لیکن قانون شریعت کا محافظ نہیں ہوسکتا، مقاصد شریعت پر نظر نہ ہونے کی وجہ سے پامالی شریعت کا مرتکب بھی ہوسکتا ہے۔

اور اگر وہ عقائد اسلام، معتقدات اہل سنت، شعار مذہب اور شعار مشرب کے درمیان تمیز نہیں کرسکتا تو ایسا شخص خود بے دینی، گمرہی اور فسق میں مبتلا ہوگا لیکن وہ دوسروں کو کافر و مرتد، یا گمراہ سمجھے گا۔ (العیاذ باللہ)

یوں ہی جو شخص مہلکات باطنہ جیسے حسد وجلن، تکبر وانانیت یا عجب وریا میں گرفتار ہے وہ دین کا دشمن ہے، قرآن ابھی تک اس کے حلق کے نیچے نہیں اترا، وہ کیسے دین کا رہنما بن سکتا ہے؟ اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے:

وَ لَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَ اتَّبَعَ هَوٰىهُ وَ كَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (کہف:۲۸)

جس کا دل میرے ذکر سے غافل ہے اس کو اپنا پیشوا نہ بناؤ، وہ تو ابھی تک خود اپنے

نفس کی پیروی میں گرفتار ہے جس کا انجام کار ہلاکت ہے۔

اسی لیے جو اِن چاروں علوم کا جامع نہیں، وہ اقتدا کے لائق نہیں، ہاں! کچھ لوگ اپنی خدمات یا دلچسپی کی وجہ سے کسی ایک فن میں مشہور ہو جاتے ہیں، اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اس خاص فن کے علاوہ دوسرے علوم اسلامیہ سے غافل یا نابلد ہیں۔

صوفیہ صافیہ جو عرفان کے اعلی منصب پر فائز ہوتے ہیں، عین شریعت کبری سے بلا واسطہ فیض پاتے ہیں، تمام علوم وفنون کی حقیقت ان پر کھل جاتی ہے، اسی لیے ہر فن میں ان کا اپنا منہج ہوتا ہے۔ عام طور سے جس فن میں وہ گفتگو کرتے ہیں، اس فن کی زبان وقواعد کا پاس ولحاظ رکھتے ہیں لیکن کبھی کبھی اس فن کے ماہرین کے خلاف بھی اپنے لیے خاص منہج وطریقہ اختیار کرتے ہیں۔

سادات صوفیہ کا قبول حدیث، محدثین کے قواعد پر

قواعد حدیث، مصطلح حدیث اور علم جرح وتعدیل پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں، یہ علم اسی امت کا شرف وامتیاز بھی ہے، اسی علم اور ان ہی قواعد کی بنیاد پر عام طور سے حدیث کو صحیح یا ضعیف قرار دیا جاتا ہے، صوفیہ نے بھی عموما ان ہی قواعد کے مطابق حدیثیں قبول کی ہیں۔ چنانچہ قطب ربانی، امام شعرانی فرماتے ہیں:

> رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے ایک عام وعدہ لیا گیا کہ ہم روایت حدیث میں جرأت نہیں کریں گے، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث روایت کرتے وقت تحقیق کریں گے، لہٰذا جو روایت ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہوگی اُسے بیان نہیں کریں گے۔

اس کے بعد انھوں نے اپنے شیخ سیدی علی الخواص علیہ الرحمہ کا یہ قول نقل کیا ہے:

> کسی فقیہ کے لیے مناسب نہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی ایسی حدیث روایت کرے جس میں کوئی ایسی علامت نہ پائی جائے جس سے حدیث رسول ہونا معلوم ہو۔ خواہ یہ نقل کے طریقے سے ہو، یا یہ کہ بیداری کی حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا گیا ہو اور حضور نے یہ فرمایا ہو کہ یہ میرا کلام ہے۔
>
> لیکن اس کی ضرورت نقل وسند میں ضعف ہونے کی صورت میں ہے، ہاں! اگر محدثین کے طریقے پر حدیث صحیح ہے اور محدثین نے اس کی تحسین بھی کی ہے تو ایسی صورت میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔(۱)

عارف باللہ شیخ علی خواص قدس سرہ کے بیان سے واضح ہوا کہ حدیث کو صحیح یا ضعیف قرار

---

(۱) العہود المحمدیہ، قسم المناہی (ص: ۲۷۳)

دینے اور حدیث کے قبول یا رد کرنے میں بھی صرف بعض مقامات پر ہی سادات صوفیہ نے عام قواعد محدثین سے الگ منہج اختیار کیا ہے۔

اسی لیے ہم یہاں سے اپنی بحث کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں پہلے حصے میں ضعف و وضع کے ان قواعد پر ایک اجمالی تبصرہ پیش کیا جائے گا جو محدثین کے نزدیک معروف ہیں، جس سے یہ واضح ہو جائے گا کہ ان قواعد کے اطلاقات میں ہمیں کیا رویہ رکھنا چاہیے؟ تاکہ کوئی بھی حدیث کا محقق کسی روایت پر حکم لگانے میں جلدی نہ کرے۔ دوسرے حصے میں تصحیح حدیث میں صوفیہ کے اس خاص منہج کا ذکر ہوگا جس کو صرف چند محدثین نے تسلیم کیا ہے۔

تصحیح وتضعیف میں محدثین کا اختلاف

اصحاب جرح و تعدیل کے نزدیک جو اِس فن کے خواص ہیں، کوئی بھی قاعدہ مستحکم نہیں ہے۔ چنانچہ کسی قاعدے میں نظریات کا اختلاف ہے تو کسی قاعدے کو تسلیم کرنے، نہ کرنے میں اختلاف ہے، اسی طرح کسی قاعدہ پر اتفاق ہو بھی گیا تو اس کی تطبیق میں اختلاف اور اگر تطبیق کو سب نے تسلیم بھی کر لیا تو نتیجہ اخذ کرنے میں اختلاف، ان ہی اختلافات کی وجہ سے محدثین کو تین گروہ میں تقسیم کیا جاتا ہے:

متشدد: قبول حدیث میں سخت شرائط رکھنے والا، تھوڑی سی کمی یا ضعف کی وجہ سے حدیث کو رد کرنے والا۔

معتدل: بیچ کی راہ اختیار کرنے والا، حدیث کو قبول کرنے یا رد کرنے میں احتیاط سے کام لینے والا۔

متساہل: قبول حدیث میں انتہائی نرم رویہ اختیار کرنے والا، ہر طرح کی حدیث کو صحیح قرار دینے والا۔

جہاں ان تینوں جماعتوں کے درمیان قبول حدیث میں بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے وہیں اگر ان لوگوں نے کسی مسئلے میں اتفاق بھی کر لیا تو فقہا اس سے مسئلہ کے استنباط میں اختلاف کر لیتے ہیں۔

حدیث کے طالب علم پر یہ امر مخفی نہیں کہ اپنی تمام تر خوبیوں اور عظمتوں کے باوجود اس علم کا کوئی بھی قاعدہ محکم نہیں ہے، اسی لیے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ حدیث سند کے اعتبار سے صحت کے اعلی درجے پر فائز ہوتی ہے لیکن اس کا متن؛ قرآن کی محکم اور غیر مؤول آیت کے خلاف ہوتا ہے، جیسے تخلیق کائنات کے متعلق امام مسلم کی یہ حدیث جس کو انھوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، آپ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑا اور فرمایا:

خَلَقَ اللّٰهُ التُّرْبَةَ يَوْمَ السَّبْتِ، وَخَلَقَ فِيهَا الْجِبَالَ يَوْمَ الْأَحَدِ، وَخَلَقَ الشَّجَرَ يَوْمَ الِاثْنَيْنِ، وَخَلَقَ الْمَكْرُوهَ يَوْمَ الثُّلَاثَاءِ، وَخَلَقَ النُّورَ يَوْمَ الْأَرْبِعَاءِ، وَبَثَّ فِيهَا الدَّوَابَّ يَوْمَ الْخَمِيسِ، وَخَلَقَ آدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ بَعْدَ الْعَصْرِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ، فِي آخِرِ الْخَلْقِ، فِي آخِرِ سَاعَةٍ مِنْ سَاعَاتِ الْجُمُعَةِ، فِيمَا بَيْنَ الْعَصْرِ إِلَى اللَّيْلِ (۱)

اللہ تعالیٰ نے ہفتے کے دن مٹی کو پیدا کیا، اسی مٹی میں اتوار کو پہاڑ، پیر کو درخت، منگل کو ناپسندیدہ چیز اور بدھ کو نور پیدا کیا اور جمعرات کو زمین میں ہر طرح کے جانور پھیلا دیے، جمعہ کے دن عصر کے بعد سے رات تک کے درمیان آخری مخلوق حضرت آدم علیہ الصلاۃ والسلام کو پیدا فرمایا۔

علامہ ابن قیم نے مسلم کی اس حدیث پر اس طرح تبصرہ کیا ہے:

اس روایت کو مرفوع یعنی رسول کا قول قرار دینا غلط ہے، یہ تو یہودی عالم کعب احبار کا قول ہے جیسا کہ امام بخاری نے 'تاریخ کبیر' میں لکھا ہے، ان کے علاوہ دوسرے علما نے بھی اسی بات کو بیان کیا ہے اور یہ بات صحیح بھی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں یہ خبر دی ہے کہ اس نے آسمان وزمین اور اُن کے درمیان تمام چیزوں کو چھ دن میں پیدا فرمایا ہے، جب کہ یہ حدیث تخلیق کی مدت سات دن بتاتی ہے۔ (۲)

واضح رہے کہ اس حدیث کو کچھ لوگوں نے تاویل کر کے قبول بھی کیا ہے۔ اسی طرح بخاری میں فترت وحی والی حدیث بھی علما کے ایک طبقہ کے نزدیک قابل غور ہے جس میں آپ کے پہاڑ پر جانے اور اپنے آپ کو ہلاک کرنے کے ارادے کی بات کہی گئی ہے۔ اسی طرح ابن عباس کی تین طلاق والی حدیث پر سند صحیح کے باوجود بھی لوگوں نے کلام کیا ہے۔ نیز جمع قرآن اور ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ کی عمر شریف سے متعلق حدیث پر بھی بعض محققین نے اعتماد نہیں کیا ہے۔

کیا حدیث ضعیف قابل عمل نہیں ہے؟

ایک زمانہ تھا جب حدیثیں گڑھ کر لوگوں کو گمراہ کیا جاتا تھا لیکن آج حدیث کو ضعیف اور موضوع بتا کر گمراہ کیا جانے لگا ہے۔ آج ضعیف، ضعیف کا ورد اس طرح کیا جاتا ہے، گویا کہ حدیث ضعیف پر عمل کرنا سخت حرام اور گمراہی ہو، جب کہ سلف سے خلف تک فقہا و محدثین ضعیف

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب صفۃ القیامۃ والجنۃ والنار، باب ابتداء الخلق وخلق آدم علیہ السلام (۴/ ۲۱۴۹، ح: ۲۷۸۹)

(۲) المنار المنیف فی الصحیح والضعیف، فصل ۱۹ (ص: ۸۴، ۸۵)

احادیث پر عمل کرتے رہے ہیں بلکہ ایک رکعت نماز بھی حدیث ضعیف پر عمل کیے بغیر کسی بھی امام کے نزدیک پوری نہیں ہوسکتی۔

احکام میں احادیث ضعیفہ کے قبول کرنے یا نہ کرنے کے سلسلے میں فقہا و محدثین کے تین مذاہب بتائے جاتے ہیں:

ا۔ دوشرطوں کے ساتھ احکام میں احادیث ضعیفہ مطلق قابل عمل ہے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ ضعف شدید نہ ہو اور دوسری شرط یہ ہے کہ اس حدیث کے معارض اس سے قوی کوئی دوسری حدیث نہ ہو۔ اس کے قائلین ائمہ اربعہ ہیں۔

۲۔ احکام وغیر احکام کسی میں بھی احادیث ضعیفہ معتبر نہیں ہے۔ یہ مذہب قدیم محدثین میں امام بخاری و امام مسلم وغیرہ کا ہے، ابن تیمیہ، ابن قیم اور البانی وغیرہ بھی اسی کے قائل ہیں۔

۳۔ احادیث ضعیفہ، احکام یعنی حلال وحرام میں قابل حجت نہیں ہیں اور فضائل اعمال، ترغیب وترہیب اور سیر وشمائل میں قابل اعتنا ہیں۔ اس کے قائلین جمہور محدثین اور متاخرین فقہا ہیں۔

عصر حاضر میں ایک جماعت نے دوسرے قول کو شد و مد کے ساتھ اختیار کر رکھا ہے اور جمہور علمائے اسلام کے بالمقابل چند محدثین کے قول کو تمام عالم اسلام پر تھوپنے کی سعی نامشکور میں مبتلا ہے، آج کے اس جدید خارجی ذہنیت کا ماننا ہے کہ ضعیف اور موضوع میں کوئی فرق نہیں ہے، اس پر طرفہ یہ ہے کہ وہی احادیث صحیح یا قابل عمل ہیں جنھیں ہم نے صحیح قرار دیا ہے اور جسے ہم نے سلسلہ ضعیفہ میں شمار کر دیا ہے اس کی کوئی قیمت نہیں اگرچہ اصحاب جرح وتعدیل اور ائمہ محدثین نے اسے قبول کیا ہو۔

تیسرا مذہب ہی اصل مذہب ہے، پہلا مذہب ہے ہی نہیں، یہ ائمہ پر اتہام ہے، کیوں کہ ائمہ نے احکام میں اپنی اپنی شرطوں کے ساتھ مرسلات اور بلغات کو لیا ہے نہ کہ ہر طرح کی ضعیف حدیث کو احکام میں قبول کیا ہے، یہ اپنے زمانے کے اعتبار سے ان کا اپنا منہج تھا، اسی لیے ان کے متبعین ائمہ نے اپنے امام کے قبول کردہ احادیث کے علاوہ دوسری حدیثوں کو حلال وحرام کے باب میں قبول نہیں کیا ہے، اسی لیے یہ کہا جاتا ہے کہ اگر ہمارے پاس آتے آتے کوئی حدیث ضعیف ہوگئی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ائمہ کے پاس بھی یہ حدیث ضعیف ہی شکل میں پہنچی ہوگی۔

ماضی اور عصر حاضر کے بعض محققین کی یہ ایک عام عادت رہی ہے کہ کسی جزوی مسئلہ میں کسی امام کے ایک فتوے یا رائے کو اس کی طرف منسوب کر کے ایک قاعدہ کلیہ تشکیل دے دیتے ہیں اسی طرح کسی راوی کے روایت کردہ حدیث کو اسے اس کا مذہب شمار کر دیتے ہیں، حالاں کہ اس امام یا راوی کا مذہب جمہور کے ساتھ ہوتا ہے، کسی خاص بنیاد پر وہ فقیہ اس مسئلے میں الگ

موقف رکھتا ہے۔اسی لیے فقہا کے یہاں ایک قاعدہ ہے کہ لَازِمُ الْمَذْهَبِ لَيْسَ بِمَذْهَبٍ
دوسرا مذہب بھی امام مسلم کے علاوہ کسی محدث کے قول صریح سے ثابت نہیں ہوتا، خیال رہے کہ احتیاط اور تقوی کسی کا مذہب نہیں ہوتا۔ اگر امام بخاری کے نزدیک ضعیف حدیثیں بالکل مقبول نہیں تھیں جیسا کہ ابن تیمیہ اور ان کے ہم نواؤں کا ماننا ہے تو امام بخاری کا ''الادب المفرد'' لکھنے کا کیا مطلب ہوتا ہے جب کہ اس میں بہت ساری حدیثیں ضعیف ہیں۔

اسی طرح ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر احادیث ضعیفہ اور موضوعہ میں متقدمین کے یہاں کوئی فرق نہیں تھا تو ان کو قبول ورد کے اعتبار سے حدیث کی اتنی لمبی تقسیم کی کیا حاجت تھی؟ صرف مقبول اور غیر مقبول کے درمیان تقسیم کردینا کافی تھا۔ اصحاب جرح وتعدیل کی جانب سے رجال حدیث کو اتنے طبقات میں بانٹنے کا کیا مطلب ہوتا ہے؟

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ضعیف حدیث جمہور کے نزدیک باب فضائل اور ترغیب وترہیب میں معتبر ہے، حلال وحرام میں نہیں لیکن راسخون فی العلم درایت اور فہم خاص کی بنیاد پر احکام میں بھی ضعیف حدیث سے حجت قائم کرسکتے ہیں، کیوں کہ ضعف کے اندر صحت کی خوشبو پالینا، متشابہ کو محکم کی طرح جاننے سے آسان ہے جب کہ اللہ رب العزت فرماتا ہے:

هُوَ الَّذِيْ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ وَ مَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَ مَا يَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ (آل عمران: ۷)

وہی ہے جس نے تم پر کتاب نازل کی جس کی بعض آیتیں محکم ہیں، وہی اصل کتاب ہیں اور بعض متشابہ ہیں تو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہات کا اتباع کرتے ہیں تا کہ فتنہ برپا کریں اور اس کی تاویل ڈھونڈیں حالانکہ اس کی مراد اور صحیح تاویل اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جو لوگ علم میں پختہ اور کامل ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان لائے یہ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں اور نصیحت تو عقل مند ہی قبول کرتے ہیں۔

مفسرین کی ایک جماعت نے اس آیت کے ذیل میں کہا ہے کہ راسخین فی العلم کو متشابہات کا علم محکم کی طرح ہوتا ہے۔

کس حدیث کو موضوع کہا جاتا ہے؟

حدیث موضوع کے بارے میں بعض لوگ ایسے سخت واقع ہوئے ہیں کہ وہ کسی حدیث

کوموضوع اس طور پر قرار دیتے ہیں جیسے ان پر وحی نازل ہوئی ہو، ان کا کسی حدیث کوموضوع کہہ دینا ظنی نہیں قطعی ہوا اور اب ان کی اس تحقیق پر کسی کو تحقیق کا حق حاصل نہ ہو۔ جب کہ محدثین نے حدیث پر حکم وضع لگانے کے لیے بعض علامتیں بیان کی ہیں جیسے ● راوی کا جھوٹا ہونا، اس کا جھوٹا ہونا چاہے اس کے اقرار سے یا قرائن سے ثابت ہو، ● متن کے الفاظ ومعانی کا رکیک ہونا، ● روایت مذکور کا قرآن، سنت ثابتہ، تاریخی حقائق اور بداہت عقل کے خلاف ہونا، ● کسی بدعتی کا اپنی بدعت کی تائید میں روایت بیان کرنا۔

لیکن صرف ان علامات کی بنیاد پر کسی روایت کو موضوع قرار دینے میں خود محدثین اختلاف رکھتے ہیں یا پھر وہ ان علامات کی وجہ سے حکم وضع کو ظنی قرار دیتے ہیں قطعی نہیں، ذیل کے سطور میں اس کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔

جھوٹے راوی کے سبب حدیث کا موضوع ہونا

حدیث کی سند میں اگر کوئی راوی کذاب یا وضاع ہو تو عموماً ایسی حدیث کو بھی اکثر ناقدین موضوع کہہ دیتے ہیں۔ تحقیق یہ ہے کہ اس سلسلے میں محدثین مختلف فکر رکھتے ہیں۔

(۱) بعض علما اس طرف گئے ہیں کہ اگر حدیث کا متن عام اصول شرع کے خلاف نہ ہو تو اسے موضوع نہیں کہیں گے اگرچہ وضاع وکذاب راوی ہی پر اس حدیث کا مدار کیوں نہ ہو۔ کیوں کہ راوی خود اپنے اس بیان میں بھی جھوٹا ہو سکتا ہے جس میں اس نے کہا کہ یہ حدیثیں ہم نے خود گڑھی ہیں، اسی طرح کسی ایک حدیث میں جھوٹ بولنے یا عام گفتگو میں جھوٹ بولنے کی وجہ سے کسی راوی کو جھوٹا یا کذاب کہا جاتا ہے اور اس کی وجہ سے حدیث کو موضوع قرار دیا جاتا ہے جب کہ جھوٹا ہر حال میں جھوٹ نہیں بولتا بلکہ کبھی کبھی سچ بھی بولتا ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے شیطان کے بارے میں کہا: صَدَقَكَ وَهُوَ كَذُوبٌ (۱) اس نے تم سے سچ کہا اگرچہ وہ پکا جھوٹا ہے۔ یعنی شیطان تو ہمیشہ جھوٹ بولتا ہی ہے لیکن اس نے اس مرتبہ سچ بولا ہے۔ اسی طرح جھوٹا شخص چاہے وہ جتنا بڑا بھی جھوٹا ہو، پوری زندگی میں ہر بار وہ جھوٹ ہی بولے کوئی ضروری نہیں۔

داعی اسلام شیخ ابو سعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی دام ظلہ اس موقف کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

محدثین کا یہ موقف دراصل قرآن سے مستنبط ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا (حجرات:۶) اے ایمان والو! جب فاسق

---

(۱) بخاری، کتاب بدء الخلق، باب صفۃ ابلیس وجنودہ (۴/ ۱۲۳، ح: ۳۲۷۵)

تمھارے پاس کوئی خبر لائے تو اس کی تحقیق کر لو۔

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فاسق کی روایت مطلقاً رد نہیں کی جائے گی بلکہ اس کی روایت کی تحقیق کی جائے گی اور تحقیق کے بعد اگر اس روایت کی صداقت کا ثبوت مل جائے تو اس کو قبول کیا جائے گا۔ حدیث گڑھنا اور جھوٹ بولنا یہ دونوں فسق کے کام ہیں لہٰذا ایسے راویوں کی روایت بالکلیہ رد نہیں کی جائے گی بلکہ تبین و تحقیق کے بعد درست ثابت ہونے پر ان کو قبول کیا جائے گا۔

امام سخاوی کا بھی یہی موقف ہے کہ جھوٹے کی روایت اس وقت قبول کر لیں گے جب یہ تحقیق سے پتا چل جائے کہ اس کی روایت محکم آیات اور صحیح احادیث کے خلاف نہیں ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

محض کسی جھوٹے؛ بلکہ وضّاعِ حدیث کا کسی حدیث میں منفرد ہونا اگر چہ کسی متبحر اور دیدہ ور حافظِ حدیث کی تحقیق سے ثابت ہوا ہو، پھر بھی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ حدیث موضوع ہی ہو؛ بلکہ اس کے ساتھ کسی اور دلیل کا ہونا بھی ضروری ہے، جس کا ذکر (یعنی علامت وضع کا بیان) آگے آ رہا ہے۔ اسی لیے متاخرین علما کے لیے کسی حدیث پر موضوع کا حکم لگانا بہت دشوار ہے اور اگر انھوں نے کسی حدیث پر کوئی حکم لگا یا تو اس میں غور و فکر کی گنجائش باقی رہتی ہے، بر خلاف ان علمائے متقدمین کے جنھیں اللہ رب العزت نے علم حدیث میں تبحر اور وسعت نظر عطا فرمائی جیسے شعبہ، قطان ،مہدی یا ان جیسے دوسرے علما اور ان کے شاگرد مثلاً امام احمد، ابن مدینی، ابن معین، ابن راہویہ اور اس طبقے کے دیگر علما، پھر اسی طرح ان کے شاگرد جیسے بخاری (۲۵۶ھ)، مسلم (۲۶۱ھ)، ابوداود (۲۷۵ھ)، ترمذی (۲۷۹ھ)، نسائی (۳۰۳ھ) سے لے کر دار قطنی (۳۸۵ھ) اور بیہقی (۴۵۸ھ) کے زمانے تک کے علما، کیوں کہ بعد کے دور میں ان جیسے یا ان کے قریبی مرتبے کے علما نہیں آئے۔"(۱)

امام سخاوی کی اس عبارت سے واضح ہو گیا کہ پانچویں صدی کے بعد کے علما کا کسی حدیث پر حکم وضع لگانا آسان نہیں ہے اور ان کے لگائے ہوئے حکم کو آنکھ بند کر کے تسلیم کر لینا اندھی تقلید کے علاوہ کچھ نہیں۔

شیخ ابن تیمیہ نے بھی علامت پائے جانے ہی کے سبب حدیث کو موضوع قرار دینے کی طرف اشارہ کیا ہے:

---

(۱) فتح المغیث، باب الموضوع (۱/ ۲۵۵)

وَ كَمَا أَنَّ عَلَى الْحَدِيْثِ أَدِلَّةً يُعْلَمُ بِهَا أَنَّهُ صِدْقٌ وَ قَدْ يُقْطَعُ بِذٰلِكَ فَعَلَيْهِ أَدِلَّةٌ يُعْلَمُ بِهَا أَنَّهُ كَذِبٌ وَ يُقْطَعُ بِذٰلِكَ

جس طرح حدیث کے لیے کچھ ایسی علامتیں ہیں جن سے اس کے صحیح ہونے کا علم اور یقین ہوتا ہے اسی طرح کچھ ایسی علامتیں بھی ہیں جن سے اس کے جھوٹ ہونے کا علم اور یقین ہوتا ہے۔

اس کی شرح میں عصر حاضر کے ایک مشہور سلفی محدث محمد بن عمر بن سالم بازمول استاذ جامعہ ام القری لکھتے ہیں:

شیخ ابن تیمیہ نے اپنی اس عبارت سے حدیث کے ایک دوسرے قاعدے کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی ہے۔ اسے علما اس طرح بیان کرتے ہیں کہ حدیث پر کوئی بھی حکم لگانا صرف سند پر موقوف نہیں ہے بلکہ کچھ علامتیں اور نشانیاں ہیں جو حدیث کے وضع اور کذب پر دلالت کرتی ہیں، اسی لیے سند حدیث اور متن حدیث کے حکم میں فرق کیا جاتا ہے، چنانچہ جب کسی سند میں کوئی راوی کذاب یا وضاع ہو تو یہ کہنا چاہیے کہ یہ سند موضوع ہے، یہ نہیں کہنا چاہیے کہ یہ حدیث موضوع ہے، ہاں جب کہ سند میں وضاع راوی کے ساتھ متن میں بھی علامت وضع میں سے کوئی علامت پائی جائے تو یہ کہنا صحیح ہے کہ یہ حدیث موضوع ہے، صرف راوی کے کذاب یا وضاع ہونے کی وجہ سے حدیث کو موضوع کہنا درست نہیں ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس حدیث کی سند موضوع ہے۔(۱)

مثال سے وضاحت: مرغی پالنے کے سلسلے میں ایک حدیث مروی ہے:

أَمَرَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْأَغْنِيَاءَ بِاتِّخَاذِ الْغَنَمِ، وَأَمَرَ الْفُقَرَاءَ بِاتِّخَاذِ الدَّجَاجِ (۲)

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مال داروں کو بکری اور فقرا کو مرغی پالنے کا حکم دیا۔

اس حدیث کو حضرت ابو ہریرہ سے ابن ماجہ نے اپنی سنن میں ذکر کیا ہے جب کہ ابن عدی نے الکامل فی الضعفا میں اور عقیلی نے ضعفا میں اپنی اپنی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ ابن ماجہ اور ابن عدی کی سند میں علی بن عروہ دمشقی ہے اس کے بارے

---

(۱) مقدمہ أصول التفسیر، از ابن تیمیہ، مع شرحہ، از محمد بازمول

(۲) سنن ابن ماجہ، باب اتخاذ الماشیۃ، (۳/۴۰۵، ح:۲۳۰۷)

میں ابن حبان نے کہا کہ یہ حدیثیں وضع کرتا تھا جب کہ عقیلی کی سند میں غیاث بن ابراہیم ہے جسے محدثین نے **يَضَعُ الْحَدِيْثَ** (وہ حدیث وضع کرتا تھا) یا **مَتْرُوْكُ الْحَدِيْثِ** (محدثین نے اس سے حدیث لینا ترک کر دیا ہے۔) کہا ہے، اسی لیے ابن عدی نے کہا ہے کہ اس کی ساری حدیثیں موضوع کے مشابہ ہیں۔

راویان حدیث پر اس قدر کلام کے باوجود امام سخاوی نے ''المقاصد الحسنۃ'' میں اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔اسی طرح ملا علی قاری نے یہ کہا:

وَالظَّاهِرُ أَنَّ الْحَدِيْثَ ضَعِيْفٌ لَا مَوْضُوْعٌ (۱)

ظاہر یہ ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے موضوع نہیں۔

اس کی وجہ یہی ہے کہ مذکورہ بالا حدیث سند کے لحاظ سے موضوع ہونے کے باوجود اس کا متن قواعد شریعت کے خلاف نہیں اس لیے حدیث کو موضوع نہیں کہا جا سکتا بلکہ سند موضوع ہوگی اور حدیث پر ضعف کا ہی حکم لگایا جائے گا۔

(۲) ناقدین کی ایک دوسری جماعت راوی کے کذاب یا وضاع ہونے کے سبب حدیث کو موضوع قرار دیتی ہے، لیکن یہ ناقدین بھی یہ شرط ملحوظ رکھتے ہیں کہ راوی ایسا کذاب اور وضاع ہو جس سے عمداً نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بہتان وافترا کرنا ثابت ہو، اگر اس پر کذب ثابت نہ ہو بلکہ اس پر کذب کی تہمت ہو تو صرف اس تہمت کے سبب وہ حدیث موضوع نہیں ہوگی، پھر یہ بھی خیال رہے کہ راوی کا کذب ثابت ہونے کے بعد ناقدین اس حدیث کو موضوع ضرور کہتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے نزدیک یہ حکم وضع قطعی نہیں ہوتا محض ظنی ہوتا ہے کیوں کہ بڑا جھوٹا بھی کبھی سچ بولتا ہے۔

علامہ ابن حجر فرماتے ہیں:

> حدیث پر نقد یا تو راوی کے کذب کی وجہ سے ہوگا مثلاً اس نے عمداً وہ بات روایت کی جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں فرمائی تھی یا اس پر جھوٹ کی تہمت کی وجہ سے ہوگا۔ پہلی صورت یعنی راوی کے جھوٹے ہونے کی وجہ سے روایت کو موضوع کہیں گے لیکن یہ حکم وضع یقینی نہیں بلکہ بطور ظن غالب ہے کیونکہ بسا اوقات بڑا جھوٹا بھی سچ بولتا ہے، ہاں اللہ نے محدثین کو ایک خاص ملکہ عطا فرمایا ہے جس سے وہ جھوٹ اور سچ میں تمیز کر لیتے ہیں اور دوسری صورت یعنی راوی پر تہمت کذب کی وجہ سے

---

(۱) الاسرار المرفوعہ (ص:۳۳۸، ح:۱۲۸۲)

روایت کو متروک کہیں گے۔(۱)

متہم بالکذب کی روایت کردہ حدیث

مذکورہ تفصیلات سے یہ واضح ہوا کہ علمائے محدثین کی ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ صرف راوی کے کذاب یا وضاع ہونے کے سبب حدیث موضوع نہیں ہوتی جب کہ اکثریت اس طرف گئی ہے کہ اگر کسی حدیث کا راوی وضاع یا کذاب ہے تو اس کی روایت کردہ حدیث کو موضوع کہیں گے البتہ یہ حکم وضع ظنی ہوگا نہ کہ قطعی، یہاں ایک اور مسئلے کی وضاحت ضروری محسوس ہوتی ہے اور وہ یہ کہ متہم بالکذب یا متہم بالوضع کے کیا معنی ہیں؟ اور اس کی روایت کردہ حدیث کا کیا حکم ہے؟

محدثین کسی راوی کو متہم بالکذب یا متہم بالوضع دو حالتوں میں بولتے ہیں:

(۱) کسی راوی نے ایک ایسی حدیث روایت کی جو عام اصول دین اور قواعد شرع کے خلاف ہو اور اس سند میں کوئی دوسرا راوی ایسا نہ ہو جس پر کذب کی تہمت لگی ہو ایسے راوی کو متہم بالکذب یا متہم بالوضع سے موصوف کرتے ہیں۔

اس اعتبار سے جن احادیث میں راوی کو متہم بالکذب یا متہم بالوضع کہا گیا ہے ان میں سے اس کی صرف وہی احادیث موضوع قرار پائیں گی جو عام اصول دین اور قواعد شرع کے خلاف ہیں لیکن جو احادیث عام اصول دین اور قواعد شرع کے خلاف نہیں ان کو موضوع نہیں کہیں گے، اگر چہ ان کی سند میں کسی راوی کو عام اصول دین اور قواعد شرع کے خلاف کوئی حدیث روایت کرنے کی وجہ سے متہم بالکذب یا متہم بالوضع سے متصف کیا گیا ہو۔

(۲) کسی راوی سے عام گفتگو میں جھوٹ بولنا ثابت ہو لیکن حدیث روایت کرنے میں اس کا جھوٹ بولنا ثابت نہ ہو تو ایسے راوی کو بھی متہم بالکذب سے موصوف کرتے ہیں۔

متہم بالکذب کی روایت کو متروک کہتے ہیں جس کا شمار ضعیف حدیث کی آخری نوع میں ہوتا ہے۔

جائزہ

راوی کے جھوٹے ہونے کے سبب حدیث کو موضوع کہنے کے سلسلے میں علما کے ان دونوں نظریات پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ جن علما پر عمل میں احتیاط اور تفقہ کا غلبہ رہا، انھوں نے وضاع کی حدیث کو بھی اس شرط کے ساتھ کہ عام اصول دین اور قواعد شریعت کے خلاف نہ ہو، ضعیف قرار دے کر ترہیب وترغیب اور فضائل کے باب میں قبول کر لیا جب کہ وہ علما جن پر

---

(۱) ملخصا نزہۃ النظر شرح نخبۃ الفکر، بحث الطعن (ص:۲۱، ۲۲)

روایت میں احتیاط کا غلبہ رہا انھوں نے وضاع اور کذاب کی حدیث کو موضوع قرار دے کر رد کر دیا اگر چہ حدیث اصول شرع کے خلاف نہ ہو۔

پہلا گروہ فقہا اور صوفیہ کا ہے جن کی نظر اس بات پر ہوتی ہے کہ اپنے قیاس اور اپنی خواہش پر عمل کرنے کے بجائے اس قول پر عمل کیا جائے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا گیا ہے اگر چہ یہ نسبت ضعیف ہو۔

جب کہ دوسرا گروہ محتاط محدثین کا ہے جن کی نظر حدیث کو ہر طرح کے شک وریب سے پاک کرنے پر ہوتی ہے۔

ان اسباب کے علاوہ بھی دوسرے اسباب کی بنا پر روایت کو موضوع کہتے ہیں جن کی تفصیل علوم حدیث کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ موضوع قرار دینے کے یہی سب سے اہم اسباب تھے، جب ان کی وجہ سے حکم وضع قطعی نہیں ہو سکتا تو دوسرے اسباب کا کیا حال ہوگا؟

کیا حدیث موضوع کا بیان کرنا مطلقاً ناجائز وحرام ہے؟

جن احادیث کو اہل علم نے موضوع قرار دیا ہے، ان میں سند کے لحاظ سے بحث کی گنجائش ہونے کے باوجود مفہوم ومعنی کے اعتبار سے ان کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ جو عام قواعد شرع کے بالکل مخالف ہو۔

۲۔ جو شریعت کے موافق ومؤید ہو۔

۳۔ جو نہ موافق ہو نہ مخالف ہو بلکہ کسی امر مباح پر مشتمل ہو۔

موضوع بتائے بغیر پہلی قسم کا بیان کرنا اور کتابوں میں نقل کرنا سخت حرام ہے۔

دوسری اور تیسری قسم کی روایت کو بھی لکھنا یا بیان کرنا درست نہیں ہے مگر ایسی صورت میں جب کہ اس کے موضوع ہونے یا نہ ہونے میں محدثین کا اختلاف ہو یا بعض وہ روایتیں جن کو علما و مشائخ نے اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہو لیکن محدثین کو ان پر صرف اس لیے کلام ہے کہ انھیں یہ حدیثیں کتب حدیث میں نہیں ملیں، یا ملیں بھی تو ایسی سند سے جن کے کچھ راوی محدثین کے نزدیک مجہول (نامعلوم) ہوں، ان کے حالات، تراجم وطبقات کی موجودہ کتابوں میں درج نہ ہوں۔

ایسی روایتوں کو بیان کرنے والے پر کوئی حکم شرع وارد نہیں ہوتا، البتہ ایسی حدیثوں کی جگہ اگر صحیح یا حسن حدیث بیان کی جائے تو بہتر ہے، ہاں روایات صحیحہ کے ساتھ ساتھ اگر کوئی ان روایات ضعیفہ کو بھی بیان کرتا ہے تو چراغ پا ہونے کی ضرورت نہیں ہے، کیوں کہ

اولاً: اگر ان کے حکم وضع میں علمائے حدیث کا اختلاف ہے تو یہ اختلاف خود ان کے ضعیف ہونے کو بتاتا ہے، نہ کہ موضوع ہونے کو۔

ثانیاً: اگر محدثین نے وضع پر اتفاق کر بھی لیا تو دوسرے مفسرین، فقہا یا صوفیہ نے اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے کہ نہیں، اگر بیان کیا ہے تو ان کا بیان کرنا محدثین کی رائے کے ضعف کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس احتمال کو پیدا کرتا ہے کہ ممکن ہے کہ وہ حدیثیں سنداً صحیح نہ ہوں کشف اور تجربہ سے صحیح ہوں۔

ثالثاً: ایسی حدیثوں کا ضعیف ہونا تو یقینی ہے جب کہ ان پر حکم وضع ظنی ہے یقینی نہیں، اور عام قاعدہ ہے کہ **الیقین لا یزول بالشک۔**

تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ بہتر یہی ہے کہ جہاں تک ہو سکے ایسی ہی حدیثیں بیان کی جائیں جو محدثین کی نظر میں صحیح یا حسن ہوں۔

ایک سوال: یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو احادیث، الفاظ یا سند کے اعتبار سے موضوع ہوں اور ان کے معنی کی تائید قرآن یا سنت صحیحہ سے ہوتی ہو، کیا ان کا بیان کرنا بھی مطلقاً ناجائز ہے؟

جواب: علما کے ایک طبقے کے نزدیک یہ مطلقاً ناجائز نہیں ہے، کیوں کہ ممکن ہے کہ تقریب فہم کے لیے الفاظ موضوعہ کو بیان کیا گیا ہو، یعنی قائل نے حدیث کی روایت بالمعنی کر دی ہو، اس روایت کی سند اس لیے بیان نہیں کی کہ کسی بھی سند سے یہ الفاظ مروی نہیں ہیں۔

تمام محدثین کے نزدیک احادیث موضوعہ کا بیان کرنا بالعموم حرام و ناجائز ہی سمجھا جاتا ہے لیکن حدیث کی تخریج اور اس پر حکم لگانے والی کتابوں میں ایسے اشارے ملتے ہیں، جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جن احادیث کے الفاظ موضوع ہوں اور ان کی سند پر کلام بھی کیا گیا ہو، اگر ان کے معنی کی تائید قرآن یا سنت صحیحہ سے ہوتی ہو، تو ان کے بیان کرنے کی کچھ گنجائش باقی رہتی ہے۔ علامہ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

> حدیث موضوع کی روایت جائز ہے اگر یہ دو شرائط موجود ہوں، پہلی شرط یہ ہے کہ اس حدیث میں کوئی حکم شرعی نہ ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اس حدیث کی تائید اصول شرع (دین کے قواعد قطعیہ ثابتہ) سے ہوتی ہو۔ حدیث موضوع کی روایت کرنے کو ہمارا جائز کہنا جمہور علما کے خلاف ہے، کیوں کہ وہ لوگ اس کے عدم جواز پر متفق ہیں لیکن اس کا یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ ان کے یہاں بھی یہ شرطیں ملحوظ رہی ہوں گی۔(۱)

یہ بھی اس صورت میں کہ علمائے کبار اور ماہرین فن نے اپنی کتابوں میں اس کا استعمال بطور حدیث صیغۂ جزم کے ساتھ کیا ہو اور ناقدین حدیث نے اسے بالاتفاق موضوع قرار دیا ہو، کیوں کہ

---

(۱) الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (۵/ ۶۹۰)

اگر سند ومتن کے اعتبار سے بالاتفاق موضوع نہ ہوتواس کے بیان کی گنجائش پہلے ہی سے ہے۔

واضح رہے کہ دورتدوین کے بعد بالخصوص موجودہ زمانے میں حدیث کی روایت بالمعنی میری رائے کے مطابق درست نہیں ہے، کیوں کہ کتابیں ہر جگہ دستیاب ہیں اور انٹرنیٹ وغیرہ نے حدیث کی روایت کردہ الفاظ تک رسائی میں مزید آسانیاں پیدا کردی ہیں۔

چند مثالیں: سر دست یہاں چند ایسی مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن کی سند پر کلام کیا گیا ہے لیکن علما نے ان کے معنی کی تائید قرآن واحادیث صحیحہ سے کی ہے، جس سے ہمارے اس دعوے کو تقویت ملتی ہے کہ جن احادیث کے الفاظ موضوع ہوں اور حدیث کے راوی کو کذّاب کہا گیا ہو، لیکن ان کے معنی کی تائید قرآن یا سنت صحیحہ سے ہوتی ہو، تو اُن کے بیان کرنے کی کچھ گنجائش ہونی چاہیے۔

امام عبدالرحمن سخاوی کی تصحیح کردہ حدیث

حدیث: **رِیْقُ الْمُؤْمِنِ شِفَاءٌ** کے بارے میں امام سخاوی لکھتے ہیں:

اس کے معنی صحیح ہیں، صحیحین میں ہے کہ جب کسی شخص کو کوئی بیماری لاحق ہوتی، یا اسے کوئی زخم یا تکلیف پہنچتی، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی شہادت کی انگلی کو زمین پر رکھ کر اٹھاتے اور یہ دعا پڑھتے: **بِاسْمِ اللهِ، تُرْبَةُ أَرْضِنَا، بِرِيقَةِ بَعْضِنَا، يُشْفَى سَقِيمُنَا، بِإِذْنِ رَبِّنَا**۔ اس کے علاوہ دوسری حدیثیں بھی ہیں جو اس معنی سے قریب ہیں۔

اور رہی حدیث: **سُؤْرُ الْمُؤْمِنِ شِفَاءٌ** (مومن کے جوٹھے میں شفا ہے۔) جو زبان زد عام وخاص ہے اس کے معنی کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جسے دارقطنی نے اپنی کتاب **الأفراد** میں حضرت عبداللہ ابن عباس سے مرفوعاً نقل کیا ہے: **مِنَ التَّوَاضُعِ أَنْ يَّشْرَبَ الرَّجُلُ مِنْ سُؤْرِ أَخِيْهِ** آدمی کا اپنے بھائی کا جوٹھا پینا تواضع ہے۔(۱)

حدیث: **الدُّنْيَا مَزْرَعَةُ الآخِرَةِ**۔ (دنیا آخرت کی کھیتی ہے) کے بارے میں لکھتے ہیں:

میں نے اس حدیث کو نہیں پایا، اگرچہ امام غزالی قدس اللہ سرہ نے اسے احیاء العلوم میں نقل کیا ہے، دیلمی نے اپنی کتاب فردوس میں بغیر سند کے ابن عمر سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ دنیا آخرت کا پل ہے، تو اسے پار کرو اور آباد نہ کرو اور عقیلی کی **الضعفاء** اور ابن لال کی **مکارم الاخلاق** میں طارق بن اشیم سے مرفوعاً مروی ہے کہ اس شخص کی دنیا کتنی اچھی ہے جو دنیا کو آخرت کے لیے توشہ بنائے اور یہ حدیث حاکم کی 'مستدرک' میں بھی

---

(۱) المقاصد الحسنۃ (ص: ۳۷۳)

ہے اور انھوں نے اس کو صحیح قرار دیا ہے، لیکن ذہبی نے ان کا تعاقب کیا ہے کہ حدیث 'منکر' ہے کیونکہ اس حدیث کا راوی عبدالجبار مجہول شخص ہے۔(۱)

شیخ ابن تیمیہ کی تصحیح کردہ حدیث

شیخ ابن تیمیہ نے اپنی ایک رائے کی تائید میں ایک موضوع حدیث کا ذکر کیا ہے، اس کے موضوع ہونے کی تصریح بھی کی ہے، پھر بھی اس کے معنی کو صحیح قرار دیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ جس لفظ سے قرآن وحدیث کا معنی سمجھا جاتا ہو، وہ قرآن وحدیث ہی ہو، ایسا ضروری نہیں، لیکن یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مقام استدلال میں موضوع حدیث کا ذکر کرنا درست ہے؟ اگرچہ اس کے موضوع ہونے کی صراحت کردی جائے۔

شیخ ابن تیمیہ کا حدیث موضوع بیان کر کے لوگوں کو اس وہم میں ڈالنا تو مقصود نہیں ہے کہ ان کی رائے کی موافقت میں حدیث موجود ہے؟ دوسری طرف کیا یہاں یہ اشارہ نہیں ملتا کہ حدیث کے سنداً ضعیف یا موضوع ہونے کے باوجود اس کے بیان کی گنجائش باقی رہتی ہے؟ اگرچہ اس حدیث کے معنی صحیح ہوں۔

اشاعرہ وماتریدیہ کے برخلاف شیخ ابن تیمیہ کا ایک عقیدہ یہ ہے کہ اللہ عرش پر بذاتہٖ استوا فرما ہے اور وہ وہاں سے ہر رات آسمان اول پر بذات خود اترتا ہے۔ اس عنوان پر انھوں نے تفصیل سے بحث کی ہے، اسی ضمن میں یہ لکھا ہے:

> ''نعیم بن حماد، از جریر، از لیث، از بشر، از انس ایک حدیث مرفوع مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جب اللہ اپنے عرش سے اترنا چاہتا ہے تو بذات خود اترتا ہے۔ میں کہتا ہوں: ابوالقاسم اسمٰعیل تیمی حفاظ وغیرہ نے اس لفظ کو ضعیف قرار دیا ہے اور ابن جوزی نے اس کو اپنی کتاب 'موضوعات' میں ذکر کیا ہے لیکن ابوالقاسم نے کہا: حدیث ینزل کا معنی صحیح ہے۔ میں بھی اس کے معنی کو صحیح قرار دیتا ہوں، لیکن یہ حدیث مرفوعاً نبی کریم ﷺ سے ثابت نہیں ہے اور بارہا ایسا ہوتا ہے کہ کسی کلام کا معنی صحیح و درست ہو، اگرچہ وہ لفظ بنفسہ منقول یا ماثور نہ ہو، جیسے یہ کہا جائے کہ اللہ نے بذات خود آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اس نے بذات خود موسیٰ سے کلام کیا، وہ بذات خود عرش پر استوا فرما ہے اور اسی طرح اس کے دوسرے افعال جن کو اس نے بذات خود کیا، تو یہ کلام اور اس کا معنی صحیح و درست

---

(۱) المقاصد الحسنۃ (ص: ۳۵۱)

ہے لیکن ان میں سے ہر ایک کا مفہوم بلفظہ قرآن وحدیث کا معنی ومفہوم نہیں ہے کہ اسے قرآن یا حدیث مرفوع کہا جا سکے۔'' (۱)

یہ عقیدہ اہل سنت ماتریدیہ واشعریہ اور کبار اسلاف کے بالکل خلاف ہے۔ ابن تیمیہ کو ان کی ذریت حنبلیت کی طرف منسوب کرتی ہے جب کہ امام احمد کا مذہب محتاط یہ ہے کہ باری تعالیٰ کا عرش پر استوا اور اس کا آسمان دنیا پر نزول معلوم ہے، البتہ! استوا یا نزول کی کیفیت مجہول ہے اور ان نصوص متشابہات کے بارے میں سوال کرنا بدعت ہے۔ (۲)

شیخ ابن تیمیہ نے نزول باری تعالیٰ کو بذاتہٖ سے مقید کیا ہے اور اس کو حدیث موضوع سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اسی پر بس نہیں کیا ہے بلکہ اس معنی کو قرآن وسنت سے ثابت مانا ہے، جب کہ یہ غلط ہے۔ ہم اس کی تفصیل میں نہیں جاتے، کیوں کہ یہاں تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں ہے۔ اس پر تفصیلی گفتگو اللہ نے چاہا تو پھر کبھی۔

اسی طرح شیخ ابن تیمیہ نے مجموع الفتاوی ہی میں حدیث: **أَدَّبَنِي رَبِّي فَأَحْسَنَ تَأْدِيبِي۔** (میرے رب نے مجھے اچھے اخلاق وآداب سے مزین فرمایا۔) کے بارے میں سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے:

الْمَعْنَى صَحِيحٌ لٰكِنْ لَا يُعْرَفُ لَهُ إِسْنَادٌ ثَابِتٌ وَمِمَّا يَرْوُونَهُ عَنْهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ: لَوْ كَانَ الْمُؤْمِنُ فِي ذُرْوَةِ جَبَلٍ قَيَّضَ اللّٰهُ لَهُ مَنْ يُؤْذِيهِ أَوْ شَيْطَانًا يُؤْذِيهِ. اس کلام کے معنی صحیح ہیں لیکن اس کی کوئی سند ثابت معلوم نہیں ہے، اس معنی کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر مومن پہاڑ کے ٹیلے پر ہو، اللہ تعالیٰ اس کو ایذا پہنچانے والوں سے یا ایذا دینے والے شیطان سے محفوظ رکھے گا۔ (۳)

شیخ ناصر الدین البانی کی تصحیح کردہ حدیث

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، وہ فرماتی ہیں کہ میں نے کہا:

---

(۱) مجموع الفتاویٰ، شرح حدیث النزول (۵/ ۳۹۴)

(۲) امام احمد سے پوچھا گیا کہ اللہ تعالی کے اس قول: اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى میں استواء سے کیا مراد ہے تو آپ نے فرمایا: استوی کما ذکر لا کما یخطر للبشر (اللہ نے استوی فرمایا جیسا کہ آیت میں ہے لیکن اس طرح نہیں جیسا بشر خیال کرتا ہے۔) ابو العون/ لوامع الانوار البھیۃ، ۲/ ۲۰۰)

(۳) مجموع الفتاوی (۱۸/ ۳۷۵)

يَا رَسُولَ اللهِ أَسْتَدِينُ وَأُضَحِّي؟ قَالَ: نَعَمْ فَإِنَّهُ دَيْنٌ مَقْضِيٌّ (۱)

یارسول اللہ! کیا قرض لے کر قربانی کرسکتی ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہاں! کیوں کہ یہ ایسا قرض ہے جو پورا ہو جائے گا۔

اس حدیث کو شیخ البانی نے منکر کہا ہے اور حدیث منکر البانی کے مذہب میں موضوع ہی ہے، پھر ایک طویل بحث کرنے کے بعد انھوں نے لکھا:

لٰكِنْ يَبْدُوْلِي أَنَّ مَعْنَاهُ صَحِيْحٌ مِنْ حَيْثُ الدِّرَايَةُ، فَقَدْ ثَبَتَ عَنْ عَائِشَةَ نَفْسَهَا أَنَّهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ حَمَلَ مِنْ أُمَّتِي دَيْنًا، ثُمَّ جَهَدَ فِي قَضَائِهِ، فَمَاتَ وَلَمْ يَقْضِهِ، فَأَنَا وَلِيُّهُ.

لیکن مجھے لگتا ہے کہ درایت کے اعتبار سے اس کا معنی درست ہے، اس کی تائید حضرت عائشہ ہی کی ایک دوسری روایت سے ہوتی ہے، جس میں انھوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میری امت میں جو شخص قرض لے، پھر اس کو ادا کرنے کی کوشش کرے لیکن وہ مرجائے اور قرض نہ ادا کر پائے، تو میں اس کے قرض کا ذمہ دار ہوں۔ (۲)

شیخ البانی نے اس کے علاوہ بھی تائید میں اور کئی حدیثیں پیش کی ہیں۔

ان مثالوں سے واضح ہوا کہ علمائے اعلام اور فقہائے عظام نے اگر کوئی حدیث نقل کی ہے اور ہمیں اس کی کوئی اصل نہیں مل رہی ہے لیکن اس کے معنی کی تائید قرآن و حدیث سے ہوتی ہو تو حدیث پر بحث کے وقت اس کے معنی کی تائید کر کے سکوت اختیار کرنا چاہیے، جیسا کہ علامہ سخاوی اور علامہ سیوطی نے بہت سارے مقامات پر کیا ہے، تاکہ امت اس آزمائش میں مبتلا نہ ہو جائے کہ وہ اپنے اکابر علما کو حدیث دانی کے زعم میں برا کہنے لگے، ہاں اگر وہ حدیث دین کے قواعد عامہ ثابتہ کے خلاف ہو تو رد بھی کرنے سے گریز نہیں کرنا چاہیے کیوں کہ یہ علما انسان ہیں فرشتے نہیں۔

محدثین کے بیان اور طرز عمل سے یہ واضح ہو گیا کہ اگر حدیث، سند صحیح کے باوجود، قرآن و سنت ثابتہ کے خلاف ہونے کی وجہ سے رد ہوسکتی ہے تو ضعیف یا بے سند حدیث موافق قرآن و سنت صحیحہ ہونے کی وجہ سے قابل قبول ہوسکتی ہے۔ اسی لیے قطب ربانی، امام شعرانی لکھتے ہیں:

---

(۱) سنن الدار قطني (۵/ ۵۱۰، ح: ۴۷۵۵) بیہقی/ السنن الکبریٰ (۹/ ۴۴۰، ح: ۱۹۰۲۱)

(۲) سلسلة الاحاديث الضعيفة والموضوعة وأثرها السيئ في الامة (۹/ ۱۷۰)

جیسے فضائل کی تمام احادیث قبول کی جائیں گی۔ اگر چہ ان کی سند پر ضعف کا حکم لگایا گیا ہو۔ کیوں کہ حدیث ضعیف شریعت سے خارج نہیں، بلکہ احادیث موضوعہ بھی بالکلیہ خارج نہیں کیوں کہ اگر شریعت کے اندر اس سے قریب کوئی بات نہ ہوتی تو دلیل تو دور کی بات ہے حدیث وضع کرنے والے کو اس حکم کا بھی علم نہ ہوتا جس کے لیے اس نے حدیث گڑھی ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ کے قول: لَا سَبْقَ إِلَّا فِي خُفٍّ، أَوْ حَافِرٍ، أَوْ نَصْلٍ (صرف شتر بانی، گھوڑسواری یا تیر اندازی کا مقابلہ جائز ہے) کو دیکھو کہ واضع نے کس طرح سے جب کسی خلیفہ کو کبوتر بازی کرتے دیکھا تو اس حدیث میں أَوْ جَنَاحٍ (کبوتر بازی) کا اپنی طرف سے اضافہ کر دیا۔ اگر خف اور حافر کا ذکر نہ ہوتا تو گڑھنے والا جناح کا اضافہ کیسے کر پاتا۔

اسی طرح سے اگر وہ ساری حدیثیں نہ ہوتیں جو سورتوں اور دعاؤں کے فضائل میں وارد ہیں تو وضع کرنے والے کچھ بھی وضع نہ کر پاتے، ان جیسی حدیثیں نہ ہوتیں تو کس پر وہ قیاس کرتے؟ رہی وہ موضوع حدیث جو کسی چیز کے مرتبے کو گھٹاتی ہے تو صرف ایسی روایتیں ہی نا قابل اعتبار ہیں، لیکن اس کے علاوہ فضائل میں حدیث گڑھنے والے پر صرف ایک طعن رہ جاتا ہے کہ خاص لفظ کو اس نے رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر دیا ورنہ حدیث موضوع پر عمل کرنے کا حکم مجتہدین کے اقوال کے برابر ہے کیونکہ دونوں کا ماخذ شریعت ہے۔(۱)

امام شعرانی کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ ائمہ نصوص کے بغیر قیاس نہیں کرتے اسی طرح وضاع بھی عموماً بغیر حدیث کے حدیث نہیں گڑھتے ہیں جیسے یہ حدیث: لَا سَبْقَ إِلَّا فِي خُفٍّ، أَوْ حَافِرٍ، أَوْ نَصْلٍ۔ اگر نہ ہوتی تو وضاع کیسے اس میں أَوْ جَنَاحٍ کا اضافہ کرتا۔

بلا سند حدیث کا کیا حکم ہے؟

فضائل کے باب میں علما نے ایسی حدیثیں بھی نقل کی ہیں جن کا کتب حدیث میں کہیں وجود نہیں ہے، بلکہ بعض علما نے بلا سند حدیث نقل کی اور بعد کے علما اپنی کتابوں میں انھیں سے نقل کرتے چلے آئے، کیونکہ وہ فضائل کے باب میں نقل حدیث کے لیے اتنا کافی سمجھتے ہیں کہ اسے کسی معتبر عالم نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہو، اگر چہ سند حدیث کا کوئی نام ونشان نہ ہو، اس کی بھی

---

(۱) ارشاد الطالبین الی مراتب العلماء العالمین (ص: ۱۰۸)

ایک مثال ملاحظہ فرمائیں؛

قاضی عیاض نے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی بات پر گریہ فرما رہے تھے، میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان، گریہ فرمانے کی کیا وجہ ہے؟ جب کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک آپ کا بلند منصب یہ ہے کہ اس نے اگرچہ آپ کو تمام انبیائے کرام کے بعد مبعوث فرمایا، لیکن آپ کے ذکر کو سب پر مقدم رکھا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ مِیْثَاقَھُمْ وَ مِنْكَ وَ مِنْ نُّوْحٍ وَّ اِبْرٰھِیْمَ وَمُوْسٰی وَعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ (احزاب:۷) ہم نے آپ سے، نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ اور دوسرے انبیا سے عہد لیا اور اللہ رب العزت کی بارگاہ میں آپ کی فضیلت اس درجے کی ہے کہ عذاب پانے والے دوزخی بھی یوں پکار اٹھیں گے: یٰلَیْتَنَآ اَطَعْنَا اللّٰہَ وَ اَطَعْنَا الرَّسُوْلَا (احزاب:۷) کاش! ہم نے اللہ کی اطاعت کی ہوتی اور رسول کی اطاعت کی ہوتی۔(۱)

اس حدیث کی تخریج کرتے ہوئے علامہ خفاجی لکھتے ہیں کہ:

> اس حدیث کی تخریج میں علامہ سیوطی نے کہا کہ میں نے یہ حدیث کسی کتاب میں نہیں پائی، مگر عبد اللہ رشاطی (۵۴۲ھ) نے ''اقتباس الانوار'' اور ابن الحاج نے ''مدخل'' (۷۳۷ھ) میں ایک طویل حدیث کے ضمن میں اس کو ذکر کیا ہے۔ ایسی حدیثوں میں اتنی ہی سند کافی ہے کیونکہ اس کا تعلق احکام سے نہیں ہے: وَ کَفٰی بِذٰلِکَ سَنَدًا لِمِثْلِهٖ فَاِنَّهٗ لَیْسَ مِمَّا یَتَعَلَّقُ بِالْاَحْکَامِ (۲)

خیال رہے کہ قاضی عیاض (م:۵۴۴ھ)، علامہ عبد اللہ بن علی رشاطی (م:۵۴۲ھ) اور علامہ ابن الحاج عبدری مکی (م:۷۳۷ھ) نے بلا سند اس حدیث کو ذکر کیا ہے۔ پھر علامہ رشاطی سے ابو العباس قصار نے ''شرح قصیدہ بردہ'' میں، علامہ احمد قسطلانی نے ''مواہب لدنیہ'' میں اور شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے ''مدارج النبوۃ'' میں اس کو ذکر کیا ہے۔

اتنی طویل اور تفصیلی گفتگو سے قارئین پر یہ واضح ہو گیا کہ کسی حدیث پر موضوع ہونے کا حکم لگانا آسان نہیں ہے اسی لیے علامہ زرکشی (م:۷۹۴ھ) کا ایک خوبصورت تبصرہ ملاحظہ فرمائیں:

> قَدْ حَکَمَ جَمْعٌ مِنَ الْمُتَقَدِّمِیْنَ عَلٰی أَحَادِیْثَ بِأَنَّهَا لَا أَصْلَ لَهَا وَ وُجِدَ الْأَمْرُ بِخِلَافِ ذٰلِكَ، وَ فَوْقَ کُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِیْمٌ

---

(۱) کتاب الشفا، القسم الاول، الباب الاول، الفصل السابع (۱/۴۵)

(۲) نسیم الریاض فی شرح شفاء القاضی عیاض، القسم الاول، الباب الاول، الفصل السابع (۱/۳۹۰)

متقدمین کی ایک جماعت نے جن حدیثوں پر لَا أَصْلَ لَهُ کا حکم لگایا ہے ان میں سے بہت پر حکم، خلاف واقع پایا گیا ہے، کیونکہ ایک سے بڑھ کر ایک علم والے موجود ہیں۔(۱)

حدیث: اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ کے معنی کی تصحیح

اس مقام پر اس حدیث کے بارے میں کچھ گفتگو کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔

اس حدیث کو صنعانی، ابن تیمیہ اور ابن حجر وغیرہ نے کہا کہ اس کی کوئی اصل نہیں ہے، یہ من گھڑت اور موضوع ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں ان کی کوئی سند نہیں ملی اور ان حضرات نے یہ سمجھا کہ دنیا کی محتاجگی قابل فخر شئ نہیں ہے کیوں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے جہاں غنا کے فتنے سے پناہ مانگی ہے وہیں فقر یعنی مسکینیت کے فتنے سے بھی پناہ مانگی ہے جیسا کہ آپ ﷺ نے دعا فرمائی:

اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ النَّارِ وَعَذَابِ النَّارِ، وَفِتْنَةِ القَبْرِ وَعَذَابِ القَبْرِ، وَشَرِّ فِتْنَةِ الغِنَى وَشَرِّ فِتْنَةِ الفَقْرِ۔

اے اللہ! میں جہنم کی مصیبت اور اس کے عذاب سے پناہ مانگتا ہوں، قبر کی مصیبت اور اس کے عذاب سے اور غنا اور فقر کی مصیبت سے پناہ مانگتا ہوں۔(۲)

اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا:

عَرَضَ عَلَيَّ رَبِّي لِيَجْعَلَ لِي بَطْحَاءَ مَكَّةَ ذَهَبًا. فَقُلْتُ: لَا. يَا رَبِّ وَلَكِنْ أَشْبَعُ يَوْمًا وَأَجُوعُ يَوْمًا، أَوْ نَحْوَ ذَلِكَ، فَإِذَا جُعْتُ تَضَرَّعْتُ إِلَيْكَ وَذَكَرْتُكَ، وَإِذَا شَبِعْتُ حَمِدْتُكَ وَشَكَرْتُكَ(۳)

اللہ نے مجھ پر یہ پیش کیا کہ وہ میرے لیے بطحائے مکہ کو سونا بنا دے گا، میں نے عرض کی: اے پروردگار! نہیں میں ایک دن کھاؤں گا اور ایک دن بھوکا رہوں گا یا اسی طرح کچھ، تو جب میں بھوکا رہوں گا تو تیری بارگاہ میں گریہ وزاری کروں گا اور شکم سیر ہوں گا تو حمد وثنا کروں گا اور شکر بجالاوں گا۔

---

(۱) النکت علی مقدمۃ ابن الصلاح (۲/۲۶۷)

(۲) بخاري، کتاب الدعوات، باب الاستعاذۃ...، (۸/۸۰، ح:۶۳۷۶) مسلم، کتاب الذکر...، باب التعوذ من شر الفتن وغیرھا (۴/۲۰۷۸، ح:۵۸۹)

(۳) سنن الترمذي، ابواب الزھد، باب ماجاء في الکفاف والصبر علیہ (۴/۵۷۵)، مسند أحمد (۳۶/۵۲۸، ح:۲۲۱۹۰)

داعی اسلام شیخ ابوسعید ادام اللہ ظلہ علینا نے فرمایا:

سب سے پہلے یہ جانیں کہ محدثین نے سند نہ ہونے کی وجہ سے اسے گو کہ موضوع قرار دے دیا ہے لیکن اس کا معنی درست ہے کیوں کہ الفَقْرُفَخْرِیْ میں فقر سے مراد دنیا کی محتاجگی نہیں ہے جس کی ضد دنیا سے غنی و بے نیازی آتی ہے بلکہ اللہ کی محتاجگی مراد ہے، جس بندے کا دل مکمل طور سے دنیا سے بے نیاز ہو، ہر وقت اللہ کی یاد میں لگا ہو اور اللہ کے علاوہ کسی کو اپنا حاجت روا نہ جانتا ہو ایسا بندہ یقینا قابل رشک ہے اور اس کی یہ صفت یقینا محمود ہے کیوں کہ اللہ تعالی نے فرمایا: وَاللّٰہُ الْغَنِيُّ وَأَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ (محمد: ۳۸) اور اللہ بے نیاز ہے تم لوگ محتاج ہو۔ اسی طرح فرمایا: یَاأَیُّھَاالنَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَی اللّٰہِ وَاللّٰہُ ھُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِیدُ (فاطر: ۱۵) اے لوگو! تم اللہ کے محتاج ہو، اللہ بے نیاز اور قابل ستائش ہے۔ اللہ پر توکل اور صرف اسی کا محتاج رہنا اور ماسوا سے بے نیازی یہ کمال بندگی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں یہ صفت بدرجہ اتم پائی جاتی تھی جو قابل فخر ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ محدثین نے جو یہ سمجھا کہ دنیا کی محتاجگی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پناہ مانگی ہے یہ بات ایک حد تک صحیح ہے کیوں صحابۂ کرام میں سے بہت سے لوگ غنی تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفائے راشدین نے اموال زکات وصول کروائے، ایک زمانے کے بعد اللہ نے اس امت کے اخیار پر فتوحات کے دروازے کھول دیے۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ بعض صحابہ نے حصول دنیا کے لیے کسب نہیں کیا جیسے حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور اصحاب صفہ وغیرہ، ان لوگوں نے عین سنت نبوی کے مطابق قناعت وفقر کو ترجیح دی۔ واللہ اعلم بالصواب

حدیث کی صحت کا دارومدار صرف سند پر نہیں

اس کے علاوہ یہ بھی ملحوظ رہے کہ تلقی بالقبول محدثین کے نزدیک ایک مسلم حقیقت ہے، یعنی امت نے جس حدیث کو قبول کر لیا ہو وہ حدیث مقبول ہے، اگر چہ اس کی سند ضعیف ہو، چنانچہ علامہ ابن عبدالبر ایک ضعیف روایت کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

عِنْدِي صَحِيحٌ، لِأَنَّ الْعُلَمَاءَ تَلَقَّوْهُ بِالْقَبُولِ۔

میرے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے، کیوں کہ علما نے اسے قبول کیا ہے۔ (۱)

---

(۱) تدریب الراوي (۱/ ۶۶)

علامہ ابن ہمام لکھتے ہیں:

حدیث جن وجوہات سے مقبول ہوتی ہے ان میں عمل علما بھی ہے، جیسا کہ امام ترمذی روایت بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے لیکن اس پر صحابہ وتابعین کا عمل رہا ہے، اسی طرح دارقطنی میں ہے کہ قاسم اور سالم نے کہا کہ مسلمانوں کا اس پر عمل رہا ہے، اسی قبیل سے امام مالک کا یہ قول ہے کہ: مدینہ والوں میں کسی حدیث کا مشہور ہونا صحت سند سے بے نیاز کر دیتا ہے۔(۱)

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس حدیث کو امت نے قبول کرلیا اسے تو قابل قبول قرار دے دیا جاتا ہے، لیکن جس شخص کی صداقت و دیانت کو امت نے قبول کرلیا ہو، اگر اس نے کسی قرینے یا کشف کی بنیاد پر یا کسی ایسی سند کی وجہ سے جو ہم تک نہیں پہنچی، کسی حدیث کو فضائل میں بیان کر دیا تو اس کا یہ عمل قابل قبول کیوں نہیں ہے؟

تجربے سے حدیث کی صحت وقبولیت

کسی ضعیف حدیث میں جو بات کہی گئی ہے وہ تجربے سے ثابت ہو جائے تو محدثین اور صوفیہ کی ایک کثیر جماعت نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے اور اس پر عمل بھی کیا ہے، اگرچہ حدیث سند کے اعتبار سے ضعیف یا موضوع ہو۔

جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

إِذَا أَضَلَّ أَحَدُكُمْ شَيْئًا أَوْ أَرَادَ أَحَدُكُمْ عَوْناً وَهُوَ بِأَرْضٍ لَيْسَ بِهَا أَنِيْسٌ، فَلْيَقُلْ: يَاعِبَادَ اللّٰهِ أَغِيْثُوْنِي، يَاعِبَادَ اللّٰهِ أَغِيْثُوْنِي، فَإِنَّ لِلّٰهِ عِبَادًا لَا نَرَاهُمْ.

اگر کوئی شخص ایسی جگہ ہو جہاں اس کا کوئی مونس و مددگار نہ ہو اور اس کی کوئی چیز گم ہوگئی ہو یا اس کو کسی بھی طرح کی مدد کی حاجت ہو تو وہ آواز دے: اے اللہ کے بندو! میری مدد کرو۔ اے اللہ کے بندو! میری مدد کرو۔ کیونکہ ہر جگہ اللہ کے کچھ ایسے بندے ہوتے ہیں جنھیں ہم نہیں دیکھتے ہیں۔(۲)

امام طبرانی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

وَقَدْ جُرِّبَ ذٰلِكَ۔ یہ حدیث تجربہ سے ثابت ہے۔

امام سخاوی نے اس حدیث کے بارے میں فرمایا:

---

(۱) شرح فتح القدیر، کتاب الطلاق (ج:۳،ص:۴۹۳)

(۲) طبراني/ المعجم الکبیر (۱۷/ ۱۱۷، ح:۲۹۰)

سَنَدُهٗ ضَعِيفٌ، لٰكِنْ قَالَ النَّوَوِيُّ: إِنَّهٗ جَرَّبَهٗ هُوَ وَبَعْضُ أَكَابِرِ شُيُوخِهٖ
اس کی سند ضعیف ہے، لیکن امام نووی کا بیان ہے کہ انھوں نے اور ان کے بعض مشائخ نے اس کا تجربہ کیا ہے۔(۱)

علامہ محمد بن ادریس قادری (۱۳۵۰ =۱۹۳۱ م) حدیث: مَاءُ زَمْزَمَ لِمَا شُرِبَ لَهٗ۔ (جس نیت سے بھی آب زمزم پیا جائے وہ نیت پوری ہوگی۔) کی تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:
هٰذَا الْحَدِيثُ صَحِيحٌ مَتْنًا وَسَنَدًا وَتَجْرِبَةً وَكَشْفًا۔ یعنی یہ حدیث متن و سند، تجربہ اور کشف ہر اعتبار سے صحیح ہے۔(۲)

ماضی قریب کے عظیم محدث شیخ عبد العزیز غماری (۱۴۱۸ھ) تحریر فرماتے ہیں:
میں اپنی اس کتاب اربعین میں بعض ایسی احادیث بھی ذکر کروں گا جو صحیح اور حسن تو نہیں ہیں بلکہ ضعیف ہیں، لیکن یہ اس قدر ضعیف بھی نہیں کہ ان کے ضعف کی تلافی ممکن نہ ہو، بلکہ ان حدیثوں کے ضعف کی تلافی کی دو صورتیں ہیں:
۱۔ حدیث متعدد طرق سے مروی ہو جن میں بعض بعض کو قوت بخشتی ہوں جس کی وجہ سے حدیث حسن لغیرہ ہو جاتی ہے، جیسا کہ علوم حدیث میں یہ قاعدہ مسلم ہے۔
۲۔ حدیث واقع کے مطابق ہو اور خبر کا واقع کے مطابق ہونا راوی کے سچے ہونے پر مضبوط دلیل ہے، اگرچہ اس حدیث کی کوئی دوسری ایسی سند نہ ہو جو اس حدیث کو قوت بخشے۔
واقع کے مطابق ہونے کی وجہ سے حفاظ حدیث نے بہت ساری احادیث ضعیفہ کو درست مانا ہے، یہ قاعدہ ان کے نزدیک مسلم ہے اور ان کی کتابوں میں موجود ہے، بلکہ وہ لوگ کبھی کبھی حدیث کے ثبوت میں تجربہ پر بھی اعتماد کرتے ہیں اور اس پر عمل کو جائز قرار دیتے ہیں، جیسا کہ محدثین نے قضائے حاجت والی بارہ رکعت نماز کے سلسلے میں حضرت عبد اللہ ابن مسعود سے مروی حدیث میں کیا ہے۔
اس حدیث کو حاکم نے اپنی کتاب المائۃ میں روایت کیا ہے، دوسرے لوگوں نے بھی اس کی روایت کی ہے، حاکم کی روایت سے امام بیہقی نے بھی نقل کیا ہے۔ حاکم نے لکھا ہے کہ راویوں کی ایک جماعت نے اس حدیث کا تجربہ کیا ہے تو حق پایا ہے

---

(۱) الابتھاج باذکار المسافر والحاج (ص: ۳۹)

(۲) إزالة الدهش والوله في صحة حديث ماء زمزم لما شرب له (ص: ۱۸۸)

، پھر خود حاکم فرماتے ہیں کہ میں نے بھی اس کا تجربہ کیا تو حق پایا۔

حافظ منذری نے اس حدیث کو سند کے اعتبار سے ضعیف قرار دینے کے بعد لکھا ہے کہ ایسی احادیث میں تجربہ پر اعتماد کیا جاتا ہے نہ کہ سند پر۔ محدثین کا یہ ایسا عمل ہے جس میں کوئی شک نہیں کیوں کہ علوم حدیث کی کتابوں میں یہ ثابت ہے کہ ضعیف اور واہی (کمزور) راوی کی بھی کبھی کبھی تصدیق کی جاتی ہے اور حدیث کے واقعہ کے مطابق ہونے اور تجربہ سے ثابت ہونے کے اعتبار سے حدیث قبول کی جاتی ہے اور جب راوی کا صدق اور اس کی روایت کسی طرح ثابت ہو جائے تو اس کی حدیث کو صحیح قرار دینا اور اس پر عمل کرنا درست ہو جاتا ہے۔(۱)

یہ تھے تجربہ کے متعلق علما و محدثین کے اقوال۔ اب حدیث کو موضوع یا ضعیف سمجھ کر استخفافاً عمل نہ کرنے کی وجہ سے مبتلائے وعید ہونے کا بھی ایک واقعہ ملاحظہ کیجیے۔

ایک حدیث میں ہے: **من احْتَجَمَ يَوْمَ السَّبتِ وَيَوْمَ الأَرْبَعَاءِ فَأَصَابَهُ وَضَحٌ فَلا يَلُوْمَنَّ إِلا نَفْسَهُ** (جو بُدھ یا ہفتہ کے دن پچھنے لگائے پھر وہ سفید داغ کے مرض میں گرفتار ہو جائے تو اپنے ہی آپ کو ملامت کرے۔)

اس حدیث کو ابن جوزی نے موضوع قرار دیا ہے(۲)، لیکن علامہ سیوطی نے اس کا رد کرتے ہوئے، اس کی سند پر بحث کی ہے، متابعات وشواہد کا ذکر کیا ہے پھر اخیر میں اپنی بات کو مدلل کرنے کے لیے دو واقعات بیان کیے ہیں:

> دیلمی نے مسند الفردوس میں ابو عمرو محمد جعفر بن مطر نیساپوری کے بارے میں اور ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں ابو معین حسین بن حسن طبری کے بارے میں نقل کیا ہے کہ ان دونوں محدثین نے اس حدیث کی سند میں کمزوری ہونے کی وجہ سے بدھ کے دن پچھنے لگائے پھر وہ سفید داغ کے مرض میں مبتلا کیے گئے، دونوں خواب میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے ان دونوں نے اپنا حال عرض کیا اور یہ بتایا کہ انھوں نے سند میں کمی کی وجہ سے حدیث پر عمل نہیں کیا اور اس مصیبت میں گرفتار ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **إِيَّاكَ وَالْاِسْتِهَانَةَ بِحَدِيْثِي** (میری حدیث کی توہین کرنے سے بچو۔) پھر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی

---

(۱) الاربعین العزیزیۃ (ص:۱۸)

(۲) ابن الجوزي/ الموضوعات (۳/ ۲۱۲)

دعا سے شفایاب ہوئے۔(۱)

یہ دونوں دو الگ الگ شخصوں کے الگ الگ خواب کا واقعہ ہے اختصار کے لیے ایک ساتھ ذکر کردیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی متعدد واقعات کتابوں میں مذکور ہیں جنھیں طوالت کی وجہ سے ترک کیا جاتا ہے، ہدایت کے لیے ایک ہی آیت کافی ہے۔

لیکن اس کے برخلاف محدثین کی ایک جماعت نے تجربے کی وجہ سے حدیث قبول کرنے کی نفی کی ہے، ان میں ماضی قریب کے متشدد عالم حدیث شیخ ناصر الدین البانی بھی ہیں انھوں نے لکھا ہے:

اَلْعِبَادَاتُ لَا تُؤْخَذُ مِنَ التَّجَارِبِ سِيمَا مَا كَانَ مِنْهَا فِي أَمْرٍ غَيْبِيٍّ كَهٰذَا الْحَدِيْثِ، فَلَايَجُوْزُ الْمَيْلُ إِلٰى تَصْحِيْحِهٖ بِالتَّجْرِبَةِ

عبادات، تجربوں سے حاصل نہیں کی جاتیں، خاص کر جن کا تعلق غیبی معاملات سے ہو، جیسے کہ یہ حدیث (جس میں انجان مقام میں مدد کے لیے آواز لگانے کے لیے کہا گیا ہے) اسی لیے تجربے سے حدیث کو صحیح قرار دینے کا رجحان درست نہیں ہے۔(۲)

اس سے قطع نظر کے مذکورہ حدیث کے خلاف شیخ البانی کی ناراضگی کے پیچھے ان کا نازک عقیدہ بھی محرک ہے، یہاں ایسے لوگوں سے میرا سوال یہ ہے کہ محدثین کے یہاں یہ مسلمات میں سے ہے کہ اگر حدیث کے تمام راوی صحیح ہوں، ان کی عدالت اور حافظے پر کسی کو کلام نہ ہو لیکن اگر ان کی روایت کردہ حدیث واقعۂ ثابتہ، تجربۂ بدیہیہ اور مسلمات کے خلاف ہو تو روایت کو یہ کہہ کر رد کردیا جاتا ہے کہ اس سند کے کسی راوی پر وہم ہوا ہے۔ تو کیا جو حدیث تجربے سے ثابت ہوجائے، ہم اُسے یہ کہہ کر قبول نہیں کرسکتے کہ محدث یا ناقد سے اس راوی پر حکم لگانے میں وہم ہوا ہے یا حکم تو درست ہے لیکن ہر جگہ ایک ہی حکم باقی رکھنا وہم یا خطا سے خالی نہیں ہے؟ واللہ اعلم

کیا حدیث موضوع پر عمل کرنا حرام ہے؟

اگر باتفاق محدثین حدیث موضوع ہو اور اصل فعل پر کوئی ممانعت نہ ہو تو اس پر عمل کرنا جائز ہے، بلکہ اچھی نیت سے فعل مستحسن ہوجائے گا اور عمل کرنا مستحب ہوگا، کیونکہ نیت عادت کو عبادت میں بدل دیتی ہے۔

مثلاً اگر کسی جھوٹے شخص نے کسی مقتدا شخصیت کی طرف منسوب کرکے کہا کہ اس نے

---

(۱) اللآلی ء المصنوعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ (۲/ ۳۴۲)

(۲) الابتھاج باذکار المسافر والحاج (ص:۳۹)

کہا ہے: سائنائٹ ایسا زہر ہے کہ آدمی زبان پر رکھتے ہی مرجائے گا، کوئی اس کا ذائقہ تک نہیں بتا پائے گا۔ تو یہ بات اس شخصیت کی طرف نظر کرتے ہوئے موضوع و باطل ہے، کیوں کہ اس نے یہ بات کسی سے ہرگز نہیں کہی، مگر عقل، تجربہ اور علمی مشاہدے کے اعتبار سے صد فیصد درست اور حق و صحیح ہے، اس لیے ہر معمولی عقل وفہم رکھنے والا شخص اس جھوٹے شخص کی بات مانے گا اور سائنائٹ سے پرہیز کرے گا، اگرچہ وہ جانتا ہو کہ وہ شخص جھوٹا ہے۔

درمختار میں ہے: **أَمَّا الْمَوْضُوْعُ فَلَا يَجُوْزُ الْعَمَلُ بِهِ بِحَالٍ** یعنی حدیث موضوع پر عمل کرنا کسی بھی حال میں جائز نہیں۔(۱)

علامہ طحطاوی اس کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

جس فعل کے بارے میں حدیث موضوع وارد ہے اسے اسی وقت کرنا منع ہے جب کہ وہ فعل شریعت کے خلاف ہو اور اگر ایسا نہیں تو اسے کرنے میں کوئی حرج نہیں، اس لیے نہیں کہ اس کا حکم حدیث موضوع میں آیا ہے بلکہ اس لیے کہ عام مباحات کے تحت داخل ہے۔(۲)

جہاں تک یہ سوال ہے کہ حدیث موضوع پر عمل کرنے سے کوئی ثواب نہیں ملے گا تو اس پر عمل کرنے سے کیا فائدہ ہے؟ تو اس سلسلے میں میرا وجدان یہ کہتا ہے کہ اگر بندے نے ثواب کی نیت سے کوئی بھی مباح عمل کیا تو اللہ تعالی اس کا ثواب اسے ضرور عطا فرمائے گا اگرچہ اس تعلق سے کوئی بھی حدیث مروی نہ ہو کیوں اللہ تعالی فرماتا ہے: **أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِي بِي وَ أَنَا مَعَهُ إِذَا دَعَانِي** (۳) میں اپنے بندے کے گمان کے ساتھ ہوں اور میں اس کے پاس ہوتا ہوں جب بھی وہ مجھے بلاتا ہے۔

ملا علی قاری وضو میں ہر عضو کے لیے الگ الگ دعا پڑھنے کی حدیث پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اعْلَمْ أَنَّهُ لَا يَلْزَمُ مِنْ كَوْنِ أَذْكَارِ الْوُضُوْءِ غَيْرَ ثَابِتَةٍ عَنْهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ تَكُونَ مَكْرُوهَةً أَوْ بِدْعَةً مَذْمُومَةً بَلْ إِنَّهَا مُسْتَحَبَّةٌ اسْتَحَبَّهَا الْعُلَمَاءُ

---

(۱) الدر المختار شرح تنویر الابصار، کتاب الطہارۃ (ص: ۲۳)

(۲) حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار (ص: ۷۵)

(۳) صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار، باب فضل الذکر والدعاء والتقرب إلی اللہ تعالی (۴/ ۲۰۶۷، ح: ۲۶۷۵)

الْأَعْلَامُ وَ الْمَشَايِخُ الْكِرَامُ لِمُنَاسَبَةِ كُلِّ عُضْوٍ بِدُعَاءٍ يَلِيقُ فِي الْمَقَامِ

یہ جان لو کہ وضو کی ان دعاؤں کا حضور ﷺ سے ثابت نہ ہونا، ان کے مکروہ یا بدعت ہونے پر دلالت نہیں کرتا، بلکہ ان دعاؤں کا پڑھنا مستحب ہے، علمائے اعلام اور مشائخ عظام نے ہر عضو کے مناسب الگ الگ دعائیں پڑھنے کو مستحب قرار دیا ہے۔(۱)

ائمہ ومحدثین پر مبتدعین سے قبول حدیث میں تساہل کے الزام کا جائزہ

آج اپنی فہم کو قرآن کا درجہ دینے والوں کی ایک ہوڑ لگی ہوئی ہے، وہ اپنے سامنے ائمہ اعلام کو بھی قابل رحم سمجھتے ہیں، ان کا ماننا ہے کہ اگر وہ لوگ قبول حدیث میں سختی برتتے تو بدعتیوں کے پاس ان کی گمراہیوں کے لیے حجت ودلیل نہ ہوتی، وہ اپنے زعم میں صوفیہ کو ایک گمراہ فرقہ تصور کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ صوفیہ کے مزعومات پر جو دلائل احادیث میں موجود ہیں وہ حدیثیں باطل اور بے اصل ہیں لیکن ائمہ حدیث وفقہ کی تساہلی نے ان احادیث کو لائق اعتنا بنا دیا ہے، اس جماعت کے ایک شخص مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

(رہی بات) امام مالک علیہ الرحمۃ سے متعلق تو بے شک اس معاملے میں احتیاط منقول ہے لیکن دوسرے ائمہ: امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام ابوحنیفہ، قاضی ابو یوسف، امام مسلم علیہم الرحمہ وغیرہ کے متعلق صاف معلوم ہے کہ یہ حضرات اہل بدعت سے روایت لینے میں کوئی قباحت نہیں خیال کرتے تھے۔(۲)

محدثین وفقہا کی اس تساہلی کا کیا نتیجہ نکلا ان ہی کی زبانی ملاحظہ فرمائیں:

فی الحقیقت روایات میں اس تساہلی کے نتیجے میں کمزور روایات کی بھر مار تصوف کی کتابوں میں ہوگئی ہے اور ان سے دین کا تصور جس قدر مسخ ہوا ہے وہ مخفی نہیں بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ ان کی بدولت دین کا ایک متوازی تصور قائم ہوگیا جس کی بنیاد نبی ﷺ اور خلفائے راشدین کے عمل میں ہمیں نہیں ملتی۔(۳)

ائمہ اعلام پر ان کا یہ اتہام کسی مثبت فکر کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد صرف توہمات پر ہے، ساری امت کو بدعتی اور مشرک کہنے کے لیے جب انھیں کوئی دلیل نہیں ملی تو ان بنیادوں کو ہی

---

(۱) الاسرار المرفوعۃ فی الاخبار الموضوعۃ = موضوعات کبیر (ص:۴۸۰)

(۲) مبادئ تدبر حدیث، ص:۹۷، ط: فاران فاؤنڈیشن، لاہور، پاکستان

(۳) مبادئ تدبر حدیث، ص:۹۸، ط: فاران فاؤنڈیشن، لاہور، پاکستان

مسمار کرنے پر آمادہ ہو گئے جن پر اس امت کا دارومدار ہے، محدثین، فقہا اور صوفیہ ہی کی جماعت ہے جنھوں نے افکار اسلامیہ کی حفاظت وصیانت بھی کی اور دنیا کے ہر گوشہ میں انھیں پھیلایا بھی۔

آپ ان کی عبارتوں کو بار بار پڑھیں اور ان پر غور کریں تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ امت کا جن لوگوں پر دارومدار ہے ان میں صوفیہ تو سراپا گمراہ اور بدعتی ہیں اور محدثین وفقہا ان کے معاون ہیں کیوں کہ ان کی تساہلی کی وجہ سے صوفیہ کے بدعات وخرافات وجود میں آئے یا کم از کم ان کے بدعات کو ان کی وجہ سے تقویت ملی گویا پوری امت یا تو گمرہی میں مبتلا ہے یا اس گمرہی پر خوش ہے۔ العیاذ باللہ

ذیل میں اس جماعت کے اتہامات میں سے صرف ایک اتہام کا جائزہ لیا جا رہا ہے مثلا ان کا ماننا ہے کہ ان ائمہ نے اہل بدعت، خصوصاً شیعہ وروافض سے روایت لینے میں بڑی وسعت ظرفی کا ثبوت دیا ہے، حلال وحرام میں تو کسی قدر احتیاط برتی ہے لیکن ترغیب وترہیب کے باب میں جان بوجھ کر تساہل سے کام لیا ہے جس کا نتیجہ تصوف اور اس کے خرافات کا ظہور ہے۔

سب سے پہلے ہم ان بدعتی گروہوں میں سے صرف ایک یعنی شیعہ اور روافض کی تاریخ پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

شیعہ بطور فرقہ ضالہ کب معرض وجود میں آیا؟ اس میں مورخین کا اختلاف ہے لیکن یہ جو مشہور ہے کہ شیعہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے حضرت معاویہ کی مخالفت میں حضرت علی کی موافقت وحمایت کی یعنی حضرت علی کے حمایتی شیعہ کہلائے اور حضرت معاویہ کے حمایتی سنی کہلائے یہ غلط ہے۔ کیوں کہ سنی کا اعتقاد ہے کہ ان دونوں صحابہ میں حق سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی طرف تھا۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ شیعہ کا وجود شہادت امام عالی مقام کے بعد ہوا کیوں کہ اہل کوفہ نے یزید بن معاویہ کے مقابلے میں حضرت امام کے ہاتھ پر بیعت کا وعدہ کیا، بالآخر آپ کی شہادت ہوئی تو انھیں بہت شرمندگی ہوئی اور انھوں نے سلطنت امویہ کے خلاف ایک مورچہ قائم کیا، ان کی حکومت کو بہت نقصان پہنچایا لیکن عباسیوں سے پہلے تک ان کی حکومت قائم رہی۔

شیعہ کی ابتدا کا یہ نظریہ کافی حد تک درست ہے کیوں کہ شیعہ جتنا امام عالی مقام سے اظہار محبت اور ان کی شہادت کا تذکرہ کرتے ہیں اتنا اہل بیت کے کسی دوسرے فرد کا نہیں کرتے لیکن اس وقت شیعیت صرف ایک سیاسی اور انتقامی گروہ کے طور پر کچھ دنوں کے لیے ابھری تھی، ان کے عقائد ونظریات گمراہ کن نہیں ہوئے تھے۔

حضرت زین العابدین کے دو صاحبزادے ہوئے: امام محمد باقر (۱۱۴ھ)، امام زید (۱۲۲ھ)۔ یہ سب عقائد میں مکمل طور سے اہل سنت کے موافق تھے لیکن حضرت زید بن علی نے اس بات کا کھل کر اظہار کیا کہ مولیٰ علی تمام صحابہ سے افضل ہیں لیکن انھوں نے شیخین کی خلافت

سے انکار نہیں کیا کیوں کہ ان کے نزدیک بھی افضل کی موجودگی میں مفضول کی امامت درست ہے۔ باقی ان کے تمام عقائد جمہور اہل سنت کے موافق تھے۔ ہاں انھوں نے ہشام بن عبدالملک کے زمانہ میں اموی حکومت کے خلاف آواز بلند کیا اور ۱۲۲ھ میں ان کی شہادت پر معاملہ ختم ہوا۔

زیدیہ کو شیعہ کا ہی ایک گروہ شمار کیا جاتا ہے وہ ان ہی کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرتے ہیں، فضیلت علی کے علاوہ تمام عقائد میں جمہور اہل سنت کے موافق ہیں۔

یہیں پر ایک بات کا ذکر کر دینا مناسب ہے کہ امام زید بن علی علیہ السلام سے ان کے متبعین میں سے کسی نے شیخین کے بارے میں پوچھا تو آپ نے ان کے بارے میں اچھے کلمات کہے اور ان کے لیے رحمت کی دعا فرمائی۔ تو ان لوگوں نے آپ کا انکار کیا، شیخین پر ترحم سے بھی انکار کیا اور ان کی جماعت سے الگ ہو گئے، تاریخ میں یہی لوگ رافضی کے نام سے مشہور ہوئے کیوں کہ ان لوگوں نے اپنے امام زید بن علی کے عقیدہ سے رفض (انکار) کیا۔

خلافت امویہ کے آخری دور میں عباسی تحریک کی شروعات ہوئی اور ۱۳۲ھ ہجری میں دور اموی کا زوال ہوا اور ابو العباس سفاح کی قیادت میں عباسی حکومت قائم ہوئی، خاندان علوی سے عقیدت رکھنے والے تمام لوگ اس حکومت کے قیام میں شریک تھے کیوں کہ ان کی خواہش تھی کہ اولاد علی کے ہی کسی فرد کے ہاتھ میں زمام اقتدار رہے جب ان لوگوں کی خواہش پوری ہوتی نہیں دکھی تو عباسی کے مقابل میں ایک طالبی (حضرت ابو طالب کی طرف منسوب) کے نام سے ایک سیاسی جماعت تشکیل دی، بعد میں جس کا دوسرا نام فاطمی (حضرت فاطمۃ الزہراء کی طرف منسوب) پڑا۔

امام جعفر (۱۴۸ھ)، امام موسی کاظم (۱۸۳ھ) اور امام علی بن موسی رضا (۲۰۳) کے بعد دیگرے اہل بیت کے افراد اس جماعت کی مذہبی قیادت کرتے رہے اسی اثنا جب طالبین کی شورش بڑھی تو عباسی خلیفہ مامون نے امام علی بن موسی رضا کو ولی عہد بنا دیا جس کی وجہ سے عباسیوں کے درمیان بے چینی پھیل گئی اور اسی درمیان ۲۰۳ھ میں امام علی رضا کی وفات ہو گئی، طالبیوں نے مامون پر ان کے قتل کا الزام لگایا، اس طرح حکومتی طور پر بہت زیادہ اتھل پتھل شروع ہو گیا۔

اسی عہد میں فاطمی تحریک ایران کے علاقوں میں خوب پروان چڑھی، وہاں کی قبائلی عصبیت نے اس تحریک کو ایک نیا رخ دے دیا جس کی وجہ سے ان میں گمرہیت اور فاسد عقائد کی جڑیں پھیلنے لگیں۔

امام علی رضا کے بعد امام محمد جواد تقی (۲۲۰ھ)، امام علی بن محمد ہادی نقی (۲۵۴ھ) اور حسن بن علی عسکری (۲۶۰ھ) فاطمیوں کے پیشوا رہے۔ حضرت حسن عسکری نے ایک چھوٹا بچہ محمد چھوڑا تھا جو امامت کے لائق نہیں تھا، اسی لیے حسن عسکری کی اچانک موت نے فاطمیوں کا پورا

شیرازہ بکھیر دیا، صحیح قیادت نہ ہونے کی وجہ سے خارجی جراثیم کارگر ثابت ہوئے اوراس طرح شیعیت ایک گمراہ فرقہ کی شکل اختیار کرگئی۔

۲۶۰ھ تک اہل بیت یا شیعیت کی قیادت ائمہ ہدی کررہے تھے، افضلیت علی کے علاوہ ان کے سارے عقائد اہل سنت کے مطابق تھے، ان کے متبعین میں سے بعض رافضی تھے لیکن ان کا زور نہ کے برابر تھا، ان میں شیخین یا صحابہ کو برا کہنے کا رواج عام نہیں تھا۔

شیعہ جماعت کا ایک فرقہ نُصیر یہ جو حضرت علی کو خدا کہتا تھا، ان کو حضرت علی نے اپنے دور ہی میں جلوادیا تھا اس لیے دوبارہ اس کے عناصر ان ائمہ ہدی کی موجودگی میں ظاہر نہیں ہوئے۔ بعد میں ان کے عقائد ونظریات کے ماننے والے لوگ پیدا ہوگئے۔(۱)

آپ شیعیت کی اس تاریخ کو پڑھیں اور یہ جاننے کی کوشش کریں کہ ان میں گمرہیت کب عام ہوئی؟ تدوین حدیث کے زمانے میں شیعیت سے منسوب افراد گمراہ تھے؟ اور یہ لوگ اپنی گمراہیوں کے نشر واشاعت میں اپنا زور صرف کیے ہوئے تھے؟ یا شیعیت اموی اور عباسی کے مقابل میں صرف ایک سیاسی جماعت تھی؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ ۲۶۰ھ تک شیعیت عمومی طور سے اموی اور عباسی حکومت کے مقابلے میں صرف ایک سیاسی جماعت تھی اس لیے اس دور میں جن حضرات کو شیعیت سے منسوب کیا جاتا ہے حدیث لینے میں کیا حرج ہے؟ کیوں کہ ان کے عقائد اہل سنت کے موافق تھے۔ اس لیے جو لوگ لفظ ''شیعیت'' سے وحشت کھا کر اوائل دور کے ائمہ و رواۃ کو مطعون گردانتے ہیں یہ تاریخی حقائق کے خلاف بھی ہے اور علمی بد دیانتی بھی۔

اسی طرح دوسرے فرقوں کے احوال وکوائف کا بھی جائزہ لیا جائے اور ایک وسیع تناظر میں ان کے حوالے سے غور وفکر کیا جائے کہ ان گمراہ جماعتوں کے کل عقائد اہل سنت کے خلاف تھے یا صرف چند مسائل میں اختلاف رکھتے تھے؟ اگر اختلاف چند مسئلوں میں تھا تو ان کے علاوہ دوسرے باب میں ان سے روایت قبول کرنے میں کوئی حرج سمجھنا اشد درجہ کا تشدد ہے۔

ان ہی تمام وجوہات کو مدنظر رکھتے ہوئے ائمہ اعلام نے بدعت کی طرف منسوب جماعتوں کی احادیث کو مطلق باطل نہیں قرار دیا بلکہ اس کے لیے کچھ قواعد وضوابط بنائے ہیں تا کہ کوئی بھی شخص کسی کو بھی کسی بدعت کی طرف منسوب کرکے ان ساری روایتوں کو کالعدم قرار نہ دے

---

(۱) شیعیت کی یہ مختصر تاریخ ڈاکٹر راغب سرجاني، استاذ جامعة القاهرة، مصر، کی کتاب ''بين التاريخ والواقع'' میں ایک مضمون بنام ''أصول الشيعه'' کا خلاصہ ہے۔ مطبوعہ: مؤسسہ اقرا، ۲۰۰۸ء

دے، کیوں کہ آپ دیکھیں گے کہ کئی کئی مراکز علم کو بدعت کی طرف منسوب کر دیا گیا جیسے بصرہ کو قدریہ کی طرف اور کوفہ کو شیعہ کی طرف۔ اگر ان سے روایت کردہ احادیث کو یک لخت باطل مان لیا جائے تو حصول حدیث کے لیے ہم کہاں رجوع کریں گے؟ کیوں کہ اس طور پر نہ تو کوئی کتاب وضع وضعف سے خالی ہوگی اور نہ ائمہ حدیث جرح وتعدیل کے پیمانہ سے یکسر باہر ہوں گے۔ اس لیے جمہور ائمہ کے اصول کے خلاف بات کرنا خود گمرہی ہے۔

بدعتیوں سے روایت کے بارے میں جلال الدین سیوطی نے بڑی تفصیل کے ساتھ محدثین کے اختلافات کا ذکر کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

> مبتدعین میں سے جن کی تکفیر کی گئی ہے ان سے بالاتفاق روایت جائز نہیں ہے اور جن کی تکفیر نہیں کی گئی ہے اس کے سلسلے میں اختلاف ہے بعض لوگوں کا ماننا ہے کہ ان سے بھی مطلقاً روایت جائز نہیں لیکن صحیح قول یہ ہے کہ دو شروطوں کے ساتھ ان کی حدیث مقبول ہے، پہلی شرط ہے کہ وہ ان میں سے نہ ہو جو اپنے مذہب اور اہل مذہب کی حمایت ونصرت کے لیے جھوٹ کو جائز سمجھتا ہو یا یہ وہ جائز سمجھتا ہو یا نہ ہو لیکن اس کی حدیث اس کے مذہب کی تائید میں نہ ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ اپنے مذہب کا داعی ومبلغ نہ ہو۔ یہی مذہب زیادہ صحیح ہے کیوں کہ صحیحین میں بہت سارے اہل بدعت سے احادیث مروی ہیں۔(۱)

اس خلاصہ کے علاوہ جلال الدین سیوطی کی پیش کردہ اقوال ائمہ میں سے موقع کی مناسبت کی وجہ سے یہاں دو جلیل القدر حفاظ کا قول پیش کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے حافظ ذہبی کا وہ قول جو انھوں نے خاص شیعہ سے متعلق کہا ہے، امام سیوطی لکھتے ہیں:

> میزان الاعتدال میں حافظ ذہبی نے لکھا ہے کہ بدعت کی دو قسمیں ہیں۔ ا: صغریٰ جیسے بغیر غلو کے شیعیت، یا غلو تو ہو لیکن شدید نہ ہو جیسے وہ لوگ جو علی سے قتال کرنے والوں کے حق میں شدید نظریہ رکھتے تھے، ایسے لوگ تابعین اور تبع تابعین میں بہت تھے اگر ان کی روایت کو رد کر دیا جاتا تو بہت ساری حدیثیں ضائع ہو جاتیں۔ ۲: کبریٰ، جیسے مکمل رافضی، حد درجہ غالی، شیخین پر تبرا کرنے والے اور اس کی دعوت دینے والے، ایسے لوگوں سے روایت درست نہیں ہے۔ یہ بات یاد رہے کہ آج کے دور میں ایسے لوگ سچے اور مامون نہیں رہے بلکہ کذب، نفاق اور تقیہ ان کا شعار بن گیا ہے۔(۲)

---

(۱) تدریب الراوی (۱/ ۳۸۳)

(۲) تدریب الراوی (۱/ ۳۸۶)

صوفیہ یا تصوف کے بہانے ائمہ کو گمراہیت کے معاون قرار دینے والوں کے لیے حافظ ابن حجر کی یہ عبارت تازیانہ ہے آپ فرماتے ہیں:

تحقیق یہ ہے کہ مبتدعہ میں سے مکفرہ کی بھی حدیث کو رد نہیں کریں گے، ہر جماعت اپنے مخالف کو بدعتی کہتی ہے معاملہ یہیں پر نہیں رکتا بلکہ اس کی تکفیر کر دیتی ہے اگر مطلق ان سب کی بات مان لی جائے تو سب کے سب کافر ہو جائیں گے۔ اس لیے اس باب میں معتبر قول یہی ہے کہ اس گروہ کی روایت کو رد کریں گے جو ضروریات دین کا منکر ہو یا اس کے خلاف اعتقاد رکھتا ہو۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو اس کے حفظ وضبط اور ورع وتقوی کو دیکھتے ہوئے اس کی حدیث کو قبول کر لیں گے۔ (اگر چہ کسی جماعت نے اس کی تکفیر کی ہو۔) (۱)

ان ائمہ حدیث کی گفتگو پر مزید کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔

اب تک حدیث پر حکم لگانے میں محدثین کے ایک خاص طبقے کے متشددانہ رویہ اور طریقہ عمل کا جائزہ لیا گیا اور ایک معتدل رائے قائم کرنے کی کوشش کی گئی۔

آنے والی سطور میں قبول حدیث میں صوفیہ صافیہ کے ایک خاص منہج کشف والہام پر گفتگو کی جاتی ہے، کیوں کہ صوفیہ نے کشف سے حدیث کی تصحیح وتضعیف کی ہے بلکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عالم بیداری اور خواب میں حدیث سن کر بیان بھی کیا ہے۔

کشف کے ذریعے حدیث کی صحت

جملہ عارفین وکاملین صوفیہ نے کشف والہام کے ذریعے حدیث کی تصحیح وتضعیف کو درست مانا ہے بلکہ محدثین کی ایک جماعت نے بھی اسے قبول کیا ہے اگر چہ اہل ظاہر اور عام محدثین نے اس کا بڑی سختی سے رد کیا ہے۔ ہم اس مسئلے کو ذرا تفصیل سے ذکر کریں گے، تا کہ ہمارے عام قارئین پر کشف والہام کی حقیقت وحجیت واضح ہو جائے۔

کشف کا معنی ومفہوم

لغت میں کشف کا معنی ہے: ظاہر کرنا، کھولنا، کسی چیز کا حجاب دور کرنا۔

اصطلاح میں کشف کہتے ہیں غیبی معانی اور پوشیدہ امور کے وجود کا علم حاصل ہونا، یا ان چیزوں کا مشاہدہ کرنا۔ (۲)

---

(۱) تدریب الراوی (۱ / ۳۸۵)

(۲) تعریفات از سید جرجانی (ص: ۹۷)

انواع کشف

جس طرح نزولِ وحی کی متعدد صورتیں ہیں اسی طرح کشف حاصل ہونے کے بھی مختلف طریقے ہیں، جیسے حالت بیداری میں ارواح انبیا و اولیا، فرشتے اور خضر علیہ السلام کی زیارت واستفادہ (۱)، الہام (۲)، خواب (۳)، کشف حسی (۴)

واضح رہے کہ کشف جب بھی مطلقاً بولا جاتا ہے، تو کشف کی یہی آخری قسم مراد لی جاتی ہے۔ خاص کر جب اس کو کسی کے مقابلے میں جیسے کشف والہام، بولا جائے۔

یہ ساری قسمیں کشف کی ہیں، اب ہم کشف کی حجیت پر قرآن وحدیث اور صحابہ، تابعین اور ائمہ اعلام کے اقوال سے ثبوت پیش کرتے ہیں، تاکہ یہ مسئلہ سب پر روز روشن کی طرح عیاں ہوجائے۔

قرآن کریم سے کشف کا ثبوت

اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام کے بارے میں فرماتا ہے:

وَ كَذٰلِكَ نُرِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ (انعام:۷۵)

اور اسی طرح سے ہم ابراہیم کو آسمان وزمین کی ملکوتیت (مظاہر ربوبیت) دکھاتے ہیں، تاکہ وہ زیادہ یقین کرنے والوں میں ہوجائیں۔

حضرت خضر اور حضرت موسیٰ علیہما الصلاۃ والسلام کے قصے میں حضرت خضر سے تین کشف

---

(۱) المنقذ من الضلال (ص: ۱۴۰) شرح مسلم (۱۵/ ۱۳۵)، تہذیب الاسماء واللغات (۱/ ۱۷۸)

(۲) کسی آیت یا دلیل میں غور وفکر کیے بغیر جو علم بھی دل میں القا ہو اور اس سے عمل کی طرف تحریک ملے وہ الہام ہے۔ (تعریفات از سید جرجاني، ص: ۳۴) اس علم کو ''علم لدنی'' بھی کہتے ہیں، کیوں کہ اس کے حصول میں کوئی شخص یا دلیل واسطہ نہیں بنتی۔ (مدارج السالکین از ابن قیم، ۳/ ۴۳۱)

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: الرُّؤْيَا الحَسَنَةُ، مِنَ الرَّجُلِ الصَّالِحِ، جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَأَرْبَعِينَ جُزْءًا مِنَ النُّبُوَّةِ نیک انسان کا اچھا خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے۔ (بخاري، باب رؤیا الصالحین) اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مَنْ رَآنِي فِي الْمَنَامِ فَقَدْ رَآنِي، فَإِنَّ الشَّيْطَانَ لَا يَتَمَثَّلُ بِي جس نے مجھے خواب میں دیکھا اس نے مجھے دیکھا، کیوں کہ شیطان میری صورت اختیار نہیں کرسکتا۔ (صحیح مسلم، کتاب الرؤیا)

(۴) امام غزالی قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں کہ کبھی کبھی اللہ کے لطف وکرم کی بارش اس قدر ہوتی ہے کہ دلوں سے حجابات اٹھ جاتے ہیں اور لوحِ محفوظ پر لکھی بعض چیزیں منکشف ہوجاتی ہیں۔ (احیاء علوم الدین، ۳/ ۱۹)

کا صدور ہوا، جس کا ذکر قرآن کریم نے سورۂ کہف میں تفصیل سے کیا ہے۔

اس پورے واقعے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے صرف کشف کی بنیاد پر ایسے احکام جاری کیے جن کا نفاذ شرعی شہادت کے بغیر جائز نہیں ہوتا ہے تو اس سے ثابت ہوا کہ کشف دلیل شرعی ہے، ورنہ حضرت خضر علیہ الصلاۃ والسلام نے ایک لڑکے کو بلا کسی شہادتِ شرعی صرف اپنے کشف کی بنیاد پر قتل کیوں کر دیا؟ اس سے واضح ہوتا ہے کہ کشف بھی دلیل شرعی ہے لیکن جس طرح ہر دلیلِ شرعی کے لیے شروط وقیود ہیں اسی طرح اس کے لیے بھی شرائط ہیں۔

اس واقعہ میں ایک اور بات قابل توجہ ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرما:

فَوَجَدَا عَبۡدًا مِّنۡ عِبَادِنَاۤ اٰتَيۡنٰهُ رَحۡمَةً مِّنۡ عِنۡدِنَا وَ عَلَّمۡنٰهُ مِنۡ لَّدُنَّا عِلۡمًا (کہف:۶۵)

تو حضرت موسیٰ و یوشع علیہما الصلاۃ والسلام نے میرے بندوں میں سے ایک بندے (خضر) سے ملاقات کی، جس کو ہم نے اپنی خاص رحمت سے نوازا اور علم لدنی عطا کیا۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس رحمتِ خاص اور علمِ خاص کے حاملین اللہ تعالیٰ کے بہت سارے بندے ہیں اور یہ ہر زمانے میں ہوں گے، ان میں صرف ایک ہی سے حضرت موسیٰ و یوشع علیہما الصلاۃ والسلام کی ملاقات ہوئی تھی۔

قرآن کریم سے یہ دو مثالیں نبیوں کے بارے میں تھیں، حضرت ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام کی نبوت و رسالت میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ البتہ! حضرت خضر علیہ الصلاۃ والسلام کی شخصیت اور اُن کی نبوت میں لوگوں کا اختلاف ہے لیکن حضرت موسیٰ کے نبی ہونے میں سب کا اتفاق ہے۔ ممکن ہے کہ ان کے کشف کے بارے میں کوئی کہے کہ وہ کشف نہیں تھا، بلکہ براہ راست وحی تھی جس پر ان حضرات نے عمل کیا۔ اس لیے اب ہم ایک مثال قرآن کریم سے غیر نبی پر الہام و کشف کے بارے میں پیش کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰۤى اُمِّ مُوۡسٰۤى اَنۡ اَرۡضِعِيۡهِ‌ۚ فَاِذَا خِفۡتِ عَلَيۡهِ فَاَلۡقِيۡهِ فِى الۡيَمِّ وَ لَا تَخَافِىۡ وَ لَا تَحۡزَنِىۡ‌ۚ اِنَّا رَآدُّوۡهُ اِلَيۡكِ وَ جَاعِلُوۡهُ مِنَ الۡمُرۡسَلِيۡنَ (قصص:۷)

اور ہم نے موسیٰ کی ماں کو الہام کیا کہ تو اُسے دودھ پلا، پھر جب تجھے اس کے تعلق سے کوئی اندیشہ ہو، تو اُسے دریا میں ڈال دے، اور پھر کوئی خوف و اندیشہ نہ رکھ، بے شک ہم اُسے تیری طرف لوٹا دیں گے اور اُسے رسول بنائیں گے۔

اس آیت میں غور کریں کہ حضرت موسیٰ کی ماں نے صرف کشف والہام کی بنیاد پر اپنے جگر پارے کو موضع ہلاکت دریا میں ڈال دیا، جب سابقہ امت کی عورتوں نے صرف کشف کی بنیاد پر ایسے احکام پر عمل کیا تو اس امت کے صالح مرد اگر اپنے کشف کی بنیاد پر ایسے حکم پر عمل کریں جو شریعت میں ممنوع نہ ہو تو اس پر واویلا کیوں؟

یہ تو انسانوں کو ہونے والے کشف والہام کی بات تھی، مگر قرآن کریم میں انسان کے علاوہ، حیوانات و جمادات کی طرف ہونے والے کشف والہام کا بھی ذکر آیا ہے۔ چنانچہ شہد کی مکھی سے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ یوں ارشاد فرماتا ہے:

وَ اَوۡحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحۡلِ اَنِ اتَّخِذِیۡ مِنَ الۡجِبَالِ بُیُوۡتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا یَعۡرِشُوۡنَ ثُمَّ كُلِیۡ مِنۡ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسۡلُكِیۡ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا (نحل:۶۸،۶۹)

تمہارے رب نے شہد کی مکھی کو الہام کیا کہ پہاڑوں میں، درختوں میں اور چھتوں میں گھر بنالو، پھر ہر قسم کے پھل کا رس چوسو اور اپنے رب کی راہ اختیار کرو جو تمہارے لیے آسان ہے۔

اللہ تعالیٰ نے زمین کی طرف الہام کرتے ہوئے فرمایا:

یَوۡمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخۡبَارَهَا ۙ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوۡحٰی لَهَا (زلزلہ: ۴،۵)

قیامت کے دن زمین اپنی خبریں بتائے گی جیسا کہ تمہارے رب نے اُس پر الہام کیا۔

ان سارے مقامات پر وحی سے مراد الہام لیا گیا ہے اور الہام، کشف کی ہی ایک قسم ہے ۔ جب اللہ اپنے دیگر مخلوقات سے خطاب کرسکتا ہے، تو اشرف المخلوقات انسان سے کیوں نہیں کرسکتا؟ وہ بھی خیر امت کے چنندہ افراد، متقین و صالحین سے ۔ الہام و کشف کی راہ یقیناً راہ ہدایت ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ایک مقام پر یہ واضح ارشاد فرمایا گیا:

وَ نَفۡسٍ وَّ مَا سَوّٰىهَا فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَ تَقۡوٰىهَا قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَكّٰىهَا وَ قَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰىهَا (شمس: ۷-۱۰)

اور جان کی قسم اور اس کی قسم جس نے اُسے بہتر بنایا، پھر اس کے قلب میں اچھائی اور برائی ڈالی، بے شک وہ کامیاب ہوگیا جس نے قلب کو پاک کیا اور وہ نامراد ہوا جس نے قلب کو معصیت میں مشغول رکھا۔

ان تمام آیات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ اپنے بندوں پر کشف والہام فرماتا رہتا ہے اور صالح روحیں ان الہامات سے ہر معاملہ میں ہدایت حاصل کرتی ہیں۔

سنت نبویہ سے کشف کا ثبوت

نبی کریم ﷺ کی پوری زندگی وحی الٰہی کے زیر سایہ تھی، خواہ وحی حضرت جبریل علیہ السلام کے واسطے سے اتری ہو جیسے قرآن، اس کا نزول اسی خاص طریقے سے ہوا اس کو ہم وحی متلو بھی کہتے ہیں، اس کے علاوہ بہت سارے احکام شرعیہ اور پیغامات الٰہیہ بھی جبریل علیہ السلام کے واسطے سے نبی کریم ﷺ تک پہنچے لیکن اسے قرآن نہیں کہا جاتا ہے بلکہ حدیث کے نام سے جانا جاتا ہے، یا وحی کا نزول کسی واسطے کے بغیر نبی کریم ﷺ کے قلب اطہر پر بشکل الہام نازل ہوا یا بطور کشف اس کا ظہور ہوا، اسی لیے آپ ﷺ کی زندگی کا ہر لمحہ اور ہر گوشہ نمونۂ عمل ہے کیوں کہ یا تو اس میں آپ نے صراحت فرمادی ہے کہ یہ حکم اللہ کی جانب سے ہے یا آپ نے صراحت نہیں فرمائی لیکن اس کے خلاف کوئی وحی نازل نہیں ہوئی تو بھی یہ حکما وسکوتا وحی ہے، بہر صورت آپ کی زندگی کا ہر لمحہ وحی ہے۔

یہاں رسول اللہ ﷺ کے کشف والہام یعنی فرشتہ کے بغیر وحی کے چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں، تاکہ واضح ہو کہ کشف والہام اور اس سے علم حاصل کرنا رسول اللہ ﷺ کی ایک سنت ہے اور یہ سنت خاصۂ نبوت بھی نہیں کہ اُمت اس سے محروم رہے گی۔ جیسا کہ قرآنی آیات سے ثابت ہو چکا ہے تو یہ سنت بھی جاری رہے گی اور یقینا اس کے حاملین خاص طور سے عارفین آتے رہیں گے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ (ایک مرتبہ) جب جماعت کھڑی ہوگئ تو رسول اللہ ﷺ ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

أَقِيمُوا الصُّفُوفَ، فَإِنِّي أَرَاكُمْ خَلْفَ ظَهْرِي(۱) تم لوگ اپنی صفیں درست کرلو، کیوں کہ میں اپنی پیٹھ کے پیچھے سے بھی تمھیں دیکھتا ہوں۔

اس سے واضح ہوا کہ کشف والہام کا عالم حس یا اس مادی دنیا پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، صاحب کشف کے سامنے زمان ومکان کی وسعتیں سمٹ جاتی ہیں، اسی لیے رسول اللہ ﷺ کے لیے آگے پیچھے، دائیں بائیں اور قرب وبعد سب کا علم برابر تھا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ غزوۂ موتہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ مدینہ میں اس واقعے کی خبر آنے سے پہلے ہی رسول اللہ ﷺ نے اس کی تفصیل لوگوں کو بتادی، آپ نے فرمایا:

أَخَذَ الرَّايَةَ زَيْدٌ فَأُصِيبَ، ثُمَّ أَخَذَ جَعْفَرٌ فَأُصِيبَ، ثُمَّ أَخَذَ ابْنُ رَوَاحَةَ

---

(۱) صحیح بخاري، کتاب ابواب الجماعۃ، باب تسویۃ الصفوف عند الاقامۃ وبعدہا(۱/ ۱۴۵، ح:۷۱۸)

فَأُصِيبَ - وَعَيْنَاهُ تَذْرِفَانِ - حَتَّى أَخَذَ الرَّايَةَ سَيْفٌ مِنْ سُيُوفِ اللهِ، حَتَّى فَتَحَ اللهُ عَلَيْهِمْ (۱)

زید نے علم اٹھایا اور وہ شہید ہو گئے، پھر جعفر نے ان کی جگہ لی وہ بھی شہید ہو گئے، پھر عبداللہ بن رواحہ نے کمان سنبھالی، وہ بھی شہید کر دیے گئے۔ جب آپ یہ بیان کرر ہے تھے تو آپ کی آنکھیں اشک بار تھیں، پھر اس کے بعد خالد ابن ولید نے بغیر کسی کے امیر بنائے ہوئے پرچم اسلام سنبھالا اور اُنھیں کی قیادت میں مسلمان فتح یاب ہوئے۔

یہ اور اس طرح کے بے شمار واقعات سیرت کی کتابوں میں موجود ہیں جو ایمان میں جلا بخشتے ہیں، لیکن یہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خاصہ نہیں تھا بلکہ علم کے اس جوہر نایاب تک امت مسلمہ کا ایک طبقہ ہر دور میں رسائی حاصل کرتا رہے گا۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

قَدْ كَانَ يَكُونُ فِي الْأُمَمِ قَبْلَكُمْ مُحَدَّثُونَ، فَإِنْ يَكُنْ فِي أُمَّتِي مِنْهُمْ أَحَدٌ، فَإِنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ مِنْهُمْ، قَالَ ابْنُ وَهْبٍ: تَفْسِيرُ مُحَدَّثُونَ: مُلْهَمُونَ (۲)

سابقہ انبیا کی امت میں مُحَدَّثْ ہوا کرتے تھے اور اگر اس امت میں کوئی مُحَدَّثْ ہوگا تو عمر ابن خطاب ضرور ہوں گے۔ حضرت عبد اللہ ابن وہب نے مُحَدَّثْ کی تفسیر مُلْهَم سے فرمائی، یعنی جس پر الہام کیا جائے اور جس کی زبان پر حق جاری ہو جائے۔

ان اصحاب ظاہر کی دیدہ دری پر حیرت ہوتی ہے جو کتاب وسنت صحیحہ کی اس طرح کے تصریحات کے بعد بھی رٹ لگائے ہوئے نہیں تھکتے کہ مبشرات (اچھے خواب) کے علاوہ الہام کی ساری باتیں افسانہ ہیں۔ اس کے لیے وہ یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ اب نبوت کا صرف یہی مبشرات اس امت کے لیے رہ گیا ہے اور اس کے علاوہ دیگر نصوص قرآنیہ اور احادیث نبویہ کو پس پشت ڈال دیتے ہیں، اب ان سادہ لوحوں کو کون بتائے کہ حدیث نبوی اور عام محاورے میں بھی حصر کبھی تاکید کے لیے آتا ہے، ہر جگہ حقیقی حصر مراد نہیں ہوتا۔

اسی طرح ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واصبہ ابن معبد اسدی سے تین مرتبہ یہ فرمایا:

---

(۱) صحیح بخاري، کتاب المغازی، باب غزوة الموتة (۵ / ۱۴۳، ح: ۴۲۶۲)

(۲) صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة رضی اللہ تعالیٰ عنہم، باب من فضائل عمر (۴ / ۱۸۶۴، ح: ۲۳۹۸)

اسۡتَفۡتِ قَلۡبَك۔ یعنی اپنے دل سے فتوی لو، اپنے دل سے فتوی لو، اپنے دل سے فتوی لو۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

الۡبِرُّ مَا اطۡمَأَنَّتۡ إِلَيۡهِ النَّفۡس، وَالۡإِثۡمُ مَا حَاكَ فِي النَّفۡسِ، وَتَرَدَّدَ فِي الصَّدۡرِ، وَإِنۡ أَفۡتَاكَ النَّاسُ وَأَفۡتَوۡكَ ۔(۱)

نیکی وہ ہے جس سے دل مطمئن ہو جائے اور گناہ وہ ہے جس سے دل میں اضطراب اور شک وشبہ ہو، اگر چہ لوگ تمہارے خلاف فتوی دیں، اگر چہ لوگ تمہارے خلاف فتوی دیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ غیر محکم متشابہ معاملات میں دل کا فتوی بہت اہم ہے، خاص کر اس کشمکش اور تذبذب کے زمانے میں جب کہ ہر کس و ناکس قلمدانِ افتا سنبھالے ہوئے ہے، بڑے بڑے اولیا اور محبوبانِ الٰہی کے عقائد و معمولات ان کے قلم کی زد پر ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس قول اسۡتَفۡتِ قَلۡبَك (اپنے دل سے فتوی لو) کی طرح حدیث کو قبول اور رد کرنے کے بارے میں ایک یہ حدیث بھی ملاحظہ ہو:

إِذَا سَمِعۡتُمُ الۡحَدِيثَ عَنِّي تَعۡرِفُهُ قُلُوبُكُمۡ، وَتَلِينُ لَهُ أَشۡعَارُكُمۡ، وَأَبۡشَارُكُمۡ، وَتَرَوۡنَ أَنَّهُ مِنۡكُمۡ قَرِيبٌ، فَأَنَا أَوۡلَاكُمۡ بِهِ، وَإِذَا سَمِعۡتُمُ الۡحَدِيثَ عَنِّي تُنۡكِرُهُ قُلُوبُكُمۡ، وَتَنۡفِرُ أَشۡعَارُكُمۡ، وَأَبۡشَارُكُمۡ، وَتَرَوۡنَ أَنَّهُ مِنۡكُمۡ بَعِيدٌ فَأَنَا أَبۡعَدُكُمۡ مِنۡهُ (۲)

جب تم میری طرف سے کوئی بات سنو جسے تمہارا دل قبول کر لے، تمہارے رونگٹے کھڑے ہو جائیں اور تمھیں یہ بات اپنے دین اور فہم کے قریب معلوم ہو تو سمجھو کہ میں اس بات کا تم سے زیادہ قبول کرنے والا ہوں اور جب میری جانب سے کوئی ایسی بات سنو جسے تمہارا دل قبول نہ کرے، تم پر کوئی اثر نہ ہو اور فہم سے دور معلوم ہو تو سمجھو کہ میں تم سے زیادہ اس بات سے نفرت کرنے والا ہوں۔

محدثین وشارحین کے ایک طبقے کا کہنا ہے کہ اس حدیث کا اطلاق صرف ائمہ محدثین پر ہوتا ہے جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زبان و بیان اور دوسرے لوگوں کے زبان و بیان میں خط

---

(۱) مسند احمد (۲۹ / ۵۳۳)

(۲) مسند احمد (۲۵ / ۴۵۶)

امتیاز کھینچنے میں کافی مہارت ہوتی ہے اوراسی طرح انھیں راویوں کی سوانحی زندگی، اُن کے سچے یا جھوٹے ہونے، ان کی قوت حافظہ اورآیات قرآنیہ ونصوص ثابتہ کے موافق یا مخالف ہونے کا علم وافر مقدار میں ہوتا ہے۔

یہ بات اپنی جگہ کافی حد تک درست ہے لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ یہ حدیث عارفین، کاملین اور مشائخ عظام کے لیے بھی دلیل و حجت ہے جو واصل عین شریعت ہوتے ہیں اور چشمۂ صافی سے بلا واسطہ فیض پاتے ہیں، ان کے قلوب پر انوار محمدیہ کی ہمیشہ بارش ہوتی رہتی ہے یقیناً یہ حضرات حدیث رسول کو محدثین سے زیادہ سمجھنے والے اور بیان کرنے والے ہیں۔ محدثین الفاظ و روایات کے جوہر شناس ہوتے ہیں اور صوفیہ حقائق و معانی اور منہج نبوت سے آشنا ہوتے ہیں۔ ایک جماعت لفظوں کی تحقیق کی ماہر ہوتی ہے تو دوسری جماعت عالَم معنی کی سیاح۔ اس کی مزید وضاحت کے لیے یہ حدیث دل کی آنکھیں کھول کر پڑھیے:

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حارثہ سے پوچھا کہ تم نے صبح کس حالت میں کی؟ انھوں نے جواب دیا کہ میں نے اللہ پر یقین اور مکمل ایمان کی حالت میں صبح کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ غور کرلو، کیا کہہ رہے ہو، کیوں کہ ہر بات کے لیے ایک حقیقت ہے۔ حارثہ نے کہا: یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں نے دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرلی ہے، میں پوری رات جاگتا ہوں اور دن بھر بغیر کھائے پیئے رہتا ہوں، اس وقت میری یہ کیفیت ہے کہ لگتا ہے کہ عرش الٰہی میرے سامنے ہے، میں اہل جنت کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ ایک دوسرے سے مل رہے ہیں، جہنمیوں کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ کیسے چیخ رہے ہیں۔ یہ سن کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم نے حقیقت کو پالیا، اِسے مضبوطی سے تھامے رہو، کچھ بندے ایسے ہوتے ہیں جن کے دل میں اللہ نور ایمان داخل فرمادیتا ہے۔

پھر حضرت حارثہ نے عرض کیا: یارسول اللہ میرے لیے شہادت کی دعا فرمادیجیے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کے لیے دعا فرمائی، ایک دن جہاد کا اعلان ہوا، اے مجاہدو تیار ہوجاؤ، تو حضرت حارثہ سب سے پہلے گھوڑے پر سوار ہوئے اور سب سے پہلے شہادت پائی۔ یہ خبر اُن کی ماں تک پہنچی، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئیں، عرض کی: مجھے میرے بیٹے کے بارے میں بتائیے، اگر وہ جنت میں ہے تو میں نہ روؤں گی، نہ گھبراؤں گی اور اگر وہ جنت میں نہیں ہے تو زندگی بھر روتی رہوں گی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ام حارثہ! وہ عام جنت میں نہیں ہے بلکہ وہ جنت کے

اعلی درجہ فردوس میں ہے، حارثہ کی ماں ہنستے ہوئے لوٹ گئیں۔(۱)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو زہد اور تقویٰ اختیار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو منور کردیتا ہے، اس کے سامنے بہت ساری غیبی باتوں کو کھول دیتا ہے، کیا ایسا شخص بھی احادیث رسول کے سمجھنے اور بیان کرنے میں جھوٹ اور بہتان کا سہارا لے گا؟ جیسا کہ بعض لوگوں کا الزام ہے۔ دوسری طرف یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جو شخص احادیث وآثار اور اُن کی فہم و اِدراک نہ رکھتا ہو، ایسا شخص آسمان و زمین، عرش و کرسی اور جنت وجہنم کو دیکھ کر کیا کرے گا؟ اصل کو فوت کر کے فرع کو حاصل کرنے کا کیا مطلب ہوتا ہے؟

کشف کی بنیاد پر صحابہ کا عمل

کشف والہام، وراثت محمدی ہے جس کے سب سے پہلے امین صحابہ کرام ہوئے، اُن کے بعد اُن کے متبعین قیامت تک آتے رہیں گے، یہ اُن کے ایمان، صداقت اور صفائے قلبی کی روشن دلیل ہے۔

بعض موقعوں پر صحابہ کرام نے بھی کشف پر عمل کیا ہے، یہاں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

(۱) حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد آپ کو غسل دینے کے سلسلے میں اختلاف ہوگیا، صحابہ نے کہا: واللہ! ہم کچھ نہیں جانتے کہ ہم کیا کریں؟ عام مردوں کی طرح آپ ﷺ کے جسم اطہر سے لباس اتار دیں، یا پھر پیرہن مبارک کے ساتھ ہی غسل دے دیں، اسی اثنا میں اللہ کی طرف سے صحابہ کرام پر غنودگی طاری ہوگئی، سب لوگ نیند کی آغوش میں چلے گئے، پھر گھر کے ایک جانب سے کسی شخص کی آواز آئی، نہ جانے وہ کون شخص تھا، اس نے کہا: رسول اللہ ﷺ کو اُن کے پیرہن ہی میں غسل دے دو۔ صحابہ کرام، رسول اللہ ﷺ کی طرف بڑھے اور اُن کو اُن کی قمیص ہی میں غسل دینے لگے، آپ ﷺ پر پانی بہاتے، بیر کی پتی ڈالتے اور ہاتھ لگائے بغیر قمیص کے اوپر ہی سے جسم اطہر کو ملتے۔(۲)

(۲) حضرت عمر رضي اللہ عنہ نے ساریہ بن زنیم خلجي کو ایک لشکر کا امیر بنا کر فارس کی طرف روانہ کیا، مسلمانوں نے 'نہاوند' کا محاصرہ کیا، حالات بگڑ گئے، دشمن کے حملے تیز ہونے لگے اور اسلامی فوج شکست کے قریب پہنچ گئی، ادھر مدینہ میں حضرت عمر خطبہ جمعہ دے رہے تھے،

---

(۱) مسند بزار (۱/ ۲۶) بیہقی/ شعب الایمان (۱۳/ ۱۵۸) طبرانی/ جامع کبیر (۳/ ۳۰۲) یہ حدیث متعدد ضعیف سندوں سے مروی ہے۔

(۲) مسند احمد (۴۳/ ۳۳۲) ، سنن ابوداود (ح: ۳۱۴۲) ، سنن ابن ماجہ (ح: ۱۴۶۴) ، یہ حدیث حسن ہے

یکا یک آپ نے دورانِ خطبہ فرمایا: اے ساریہ! پہاڑ کی پناہ لو، اے ساریہ! پہاڑ کی پناہ لو۔ اے ساریہ! پہاڑ کی پناہ لو۔

پھر جب قافلہ مدینہ واپس آیا تو عمر نے حالات دریافت کیے، اُنھیں بتایا گیا کہ ہم لوگ تو شکست کھا چکے تھے، لیکن اسی وقت ہم نے آپ کی آواز سنی کہ اے ساریہ! پہاڑ کی پناہ لو۔ حالاں کہ مدینہ اور نہاوند کے درمیان ایک ماہ کی مسافت تھی، پھر ہم لوگ پہاڑ کی پناہ میں آ گئے اور اللہ تعالیٰ نے دشمنوں کو شکست دی۔

اس واقعے کو ابن حجر عسقلانی نے حسن قرار دیا ہے اور کہا کہ اس کو بیہقی نے 'دلائل' میں، لالکائي نے 'شرح السنۃ' میں، زین عاقولي نے 'فوائد' میں اور ابن اعرابي نے 'کرامات الاولیاء' میں ذکر کیا ہے۔(۱)

(۳) طارق بن شہاب نے کہا کہ ایک شخص نے حضرت عمر سے کوئی بات بیان کی اس نے اس میں جھوٹ کا سہارا لیا، تو آپ نے کہا: اُسے مت بیان کرو۔

پھر اس نے کوئی بات بیان کی، تو آپ نے پھر اس سے کہا: یہ مت بیان کرو۔

جب اس نے اپنی بات پوری کر لی، تو کہا: جو کچھ میں نے آپ سے بیان کیا، اُس میں سب حق اور درست تھا، اُن باتوں کے سوا جن کے بارے میں آپ نے کہا کہ اُسے مت بیان کرو۔(۲)

حضرت حسن بصری قدس اللہ سرہٗ سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا: اگر جھوٹ بولا جاتا اور اُسے کوئی شخص پہچان لیتا تو وہ عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) تھے۔(۳)

ایک معاصر اسکالر عبد السلام بن محسن آلِ عیسیٰ نے ان دونوں روایتوں کے بارے میں کہا ہے کہ یہ حسن ہیں ان شاء اللہ۔(۴)

(۴) تاج الدین سبکی نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے کہ ایک شخص حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے پاس آیا، راستے میں اس کی ملاقات کسی خاتون سے ہوئی تھی، جس کو اس نے اذیت پہنچائی تھی، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا: ایک شخص داخل ہوا ہے جس کی آنکھوں میں زنا کا اثر ہے۔ اس شخص نے کہا: کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد بھی وحی نازل ہو رہی ہے؟

---

(۱) الاصابۃ، حرف السین المھملۃ، (۳/ ۵، ۶، ترجمۃ: ۳۰۳۶)

(۲) تاریخ دمشق (۴۴/ ۲۸۲)، تاریخ الخلفاء (ص: ۱۲۷)

(۳) تاریخ دمشق (۴۴/ ۲۸۱)، سیوطی/ تاریخ الخلفاء (ص: ۱۲۸)

(۴) دراسۃ نقدیۃ في المرویات الواردۃ فی شخصیۃ عمر بن الخطاب وسیاستہ الاداریۃ رضي اللہ عنہ (ص: ۲۲۱)

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: نہیں، بلکہ یہ ایک مومن کی فراست ہے۔

علامہ سبکی نے اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: حضرت عثمان نے اس واقعے کا اظہار صرف اس شخص کی تادیب اور زجر وتوبیخ کے لیے کیا تھا۔(۱)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ مشائخ اپنے مریدین کی تربیت کے لیے کشف کا اظہار کر سکتے ہیں، بلکہ کرتے رہے ہیں۔

(۵) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ وفات کے وقت حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے عائشہ فلاں فلاں مال تم، تمہارے دو بھائیوں اور تمہاری دو بہنوں کے لیے ہیں تو میں نے پوچھا: اے ابا جان! بھائی تو دو ہیں لیکن اسما کے علاوہ مری دوسری بہن کون ہے؟ تو آپ نے فرمایا: أُلْقِيَ فِي رَوْعِي أَنَّ ذَا بَطْنِ بِنْتِ خَارِجَةَ جاريةٌ(۲)

میرے دل میں یہ بات ڈالی گئی ہے کہ بنت خارجہ کے شکم میں لڑکی ہے۔

بنت خارجہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی اہلیہ ہیں۔ آپ نے از راہ کرامت والہام یہ خبر دی کہ بنت خارجہ جو اس وقت حاملہ ہیں، ان کے شکم سے لڑکی پیدا ہوگی اور ایسا ہی ہوا بھی۔

(۶) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ثابت بن قیس ''جنگ یمامہ'' میں شہید ہو گئے، کسی نے خواب میں آپ کو دیکھا کہ آپ فرما رہے ہیں: میں شہید ہو گیا تو میری زرہ فلاں مسلم شخص نے اٹھا کر پتھر کی ہانڈی میں چھپا دی ہے، تم امیر المومنین کے پاس جانا اور بتانا کہ میرے ذمے اتنا قرض ہے اور میرا فلاں غلام آزاد ہے۔ اس شخص نے مدینہ پہنچ کر یہ سارا واقعہ حضرت ابو بکر صدیق کو بتا دیا، انھوں نے زرہ اسی شخص کے پاس پائی اور ثابت بن قیس کی وصیت پوری کی۔

اس واقعے کو حاکم نے نقل کیا ہے اور اُسے مسلم کی شرط پر صحیح قرار دیا ہے اور ذہبی نے بھی اُن کی موافقت کی ہے۔(۳)

اِس واقعے کو غور سے پڑھیے اور ملاحظہ کیجیے کہ صحابۂ کرام خاص طور سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خواب کو کتنی اہمیت دی اور صرف اس خواب کی بنیاد پر جو کہ کشف کی ایک قسم ہے، درج ذیل فقہی احکام نافذ کیے، مثلاً:

---

(۱) طبقات الشافعیہ الکبری (۲/ ۳۲۷)

(۲) امام مالک/ موطا، کتاب الاقضیہ، باب مالا یجوز من النحل (۲/ ۷۵۲)؛ اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ/ ابن اثیر (۱/ ۱۳۲۹)

(۳) مستدرک، کتاب معرفۃ الصحابۃ رضی اللہ عنہم، ذکر مناقب ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ، (۳/ ۲۶۰)

۱۔صرف ایک کشف کی بنیاد پر زرہ کی تلاشی ہوئی اور اس کے مل جانے کے بعد اسے ثابت بن قیس کا قرار دیا گیا۔

۲۔پھر اُسے ثابت بن قیس کا ترکہ مان لیا گیا۔

۳۔پھر اُن کے ترکے سے اُن کا قرض ادا کیا گیا۔

۴۔اور اِسی خواب کی بنیاد پر غلام آزاد کر دیا گیا۔

اِن واقعات سے جہاں کشف کا ثبوت ملتا ہے وہیں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کرام نے کشف کی بنیاد پر احکام بھی جاری کیے ہیں، دین کی نصرت و مدد میں بھی اِس کا سہارا لیا ہے اور قلوب کی صفائی، تزکیہ وتطہیر کے لیے بھی اِس کا استعمال کیا ہے۔

اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حدیث کی تصحیح یا دین سیکھنے اور اُس پر عمل کرنے کے لیے کشف کا سہارا نہیں لیا جا سکتا؟

کشف کی اہمیت وحجیت کے بارے میں علما کے اقوال

یہ پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے کہ علمائے ظاہر اور عام محدثین نے کشف کو کسی بھی معاملے میں حجت ماننے سے انکار کیا ہے، جب کہ علما کی ایک جماعت کا ماننا ہے کہ کشف والہام کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چلا جا سکتا، ہاں! اسے ایک مستقل رکن یا ایک اصل کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا جا سکتا، اسی لیے علما کی ایک کثیر تعداد ایسی ملتی ہے جنھوں نے کشف والہام کی حجیت کو قبول کیا ہے، بعض نے چند مقامات پر کچھ شرطوں کے ساتھ قبول کیا ہے، ذیل میں تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔

علامہ عبدالرؤوف مناوی حدیث: **لَوْ لَا أَنْ لا تَدَافَنُوْا، لَدَعَوْتُ اللهَ أَنْ يُسْمِعَكُمْ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ** (۱) اگر مجھے ڈر نہ ہوتا کہ تم لوگ دفن کرنا چھوڑ دو گے تو میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا کہ وہ تم لوگوں پر عذاب قبر ظاہر فرما دے۔) کے تحت تحریر فرماتے ہیں:

> اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ کشف بقدر طاقت ہوتا ہے، اسی لیے جس پر برداشت سے زیادہ کشف ہو جائے، وہ ہلاک ہو جائے گا۔

پھر آپ لکھتے ہیں:

> بعض صوفیہ کا کہنا ہے کہ قبروں میں ثواب وعقاب پانے والوں کی خبر بہت سارے لوگوں کو حاصل ہے، یہ ایک دردناک صورت حال ہے۔ جو شخص بھی قبر کے احوال پر اطلاع پاتا ہے وہ دن بھر میں کئی بار موت کی آغوش میں آتا جاتا ہے، وہ اللہ سے

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الجنۃ، متعۃ نعیمہا (۴/ ۲۲۰۰، ح:۲۸۶۸)

فریاد کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر قبر کے احوال ظاہر نہ کرے۔اس مقام پر بندہ اسی وقت فائز ہوتا ہے جب اس کی جسمانیت پر روحانیت غالب ہو جاتی ہےاور وہ روحانیین کی طرح ہوجاتا ہے۔اس حدیث میں خطاب ان لوگوں سے ہےجن پر جسمانیت کا غلبہ ہے نہ کہ ان لوگوں سے جن پر روحانیت غالب ہے، کیوں کہ مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں سے کلام ان کے حال اور ان کی فہم کے مطابق فرمایا کرتے۔(۱)

اسی طرح ایک دوسرے مقام پر امام مناوی حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم :**إنّ لکلِّ قَوْمٍ فِراسَةً وإنّما یَعْرِفھا الأَشْراف** (یقیناً ہرقوم کوایک فراست حاصل ہے،قوم کے معظم لوگ اس فراست کے حامل ہوتے ہیں) کےتحت لکھتے ہیں:

فراست کی بنیاد گناہوں سے بچنے پر ہے،کرمانی کہتے ہیں کہ''جس نے اپنے ظاہر کواتباع سنت سے اوراپنے باطن کومراقبہ سے آراستہ کیا،اپنے آپ کوخواہشات کی دَلدَل میں پھنسنے سے بچایا،نزاع ومخالفت کی وادیوں سے الگ رکھا اور حلال کھانے کی عادت ڈال لی،ایسے شخص کی فراست میں خطانہیں ہوتی۔''

امام مناوی اس پرتبصرہ کرتے ہوئےفرماتے ہیں:

ایسا شخص دل کی آنکھوں سے حقائق کا مشاہدہ کرتا ہے۔(۲)

جس شخص پر روحانیت کا غلبہ ہو،دل کی آنکھوں سے حقائق ملاحظہ کرتا ہو،کیا ایسے شخص پر سنت محمدیہ،احادیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقیقت یعنی ان کا صحیح یا موضوع ہونا پوشیدہ رہ سکتا ہے؟

محدث شام ابوالفداءاسماعیل عجلونی نے کشف کے ذریعے حدیث کوصحیح یا ضعیف قرار دینے کودرست تسلیم کیاہے،وہ لکھتے ہیں:

''محدثین کاکسی حدیث پروضع یاصحت وغیرہ کاحکم لگانا ظاہریعنی سنداورراوی وغیرہ کےاعتبار سے ہے نہ کہ نفس الامر کےاعتبار سے۔کیوں کہ اس بات کاامکان موجود ہے کہ جوحدیث کسی محدث کے نزدیک ضعیف یا موضوع ہووہ حقیقت اورنفس الامر میں صحیح ہو،اسی طرح اس کے برعکس (یعنی جوحدیث کسی محدث کے نزدیک صحیح ہواُس کا نفس الامر میں موضوع ہونے) کا بھی امکان موجود ہے،اگرچہ

---

(۱) فیض القدیر،شرح الجامع الصغیر (۵/ ۳۴۲)

(۲)فیض القدیرشرح جامع صغیر(۲/ ۵۱۵)

حدیث صحیحین ہی میں کیوں نہ موجود ہو، یہی مذہب صحیح اور درست ہے۔''

پھر آگے اپنی بات کی تائید کے لیے 'فتوحات مکیہ' کی ایک بحث کا خلاصہ تحریر فرماتے ہیں:

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ روایت کے اعتبار سے حدیث صحیح ہوتی ہے لیکن کسی صاحب کشف کے نزدیک یہی حدیث صحیح نہیں ہوتی، کیوں کہ اس نے اس حدیث کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ حدیث موضوع ہے اس پر عمل نہیں کیا جائے گا، اگرچہ اہل حدیث اس روایت کو صحیح مان کر اس حدیث پر عمل کرتے ہوں۔ اسی طرح سے محدثین کسی حدیث کی سند میں کسی جھوٹے راوی کے پائے جانے کی وجہ سے اس پر عمل کرنا ترک کردیتے ہیں، اگرچہ نفس الامر میں وہ حدیث صحیح و درست ہو، کیوں کہ صاحب کشف نے اس حدیث کی صداقت کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کرلیا ہے۔''(۱)

ماضی قریب کے عظیم محدث ابوالفیض احمد بن ابوعبداللہ محمد بن صدیق غماری حدیث موضوع کی معرفت کے طریقے پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حدیث موضوع کی معرفت کے سلسلے میں دو باتیں بہت ہی اہم ہیں:

پہلی بات یہ ہے کہ کسی حدیث کی سند میں کوئی جھوٹا راوی پایا جائے، خواہ وہ تنہا روایت کرے یا کوئی اس کے علاوہ دوسرا روایت کرے لیکن وہ بھی جھوٹا راوی ہو، یا اسی کی طرح کوئی بہت ہی کمزور راوی ہو، اِن سب وجوہات سے حدیث موضوع ہوجاتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ حدیث میں ظاہری خرابی پائی جاتی ہو، جیسے الفاظ حدیث میں سقم کا ہونا، حدیث کا ثابت شدہ معانی کے مخالف ہونا یا مشہور حکم کے علاوہ کسی حکم کا پایا جانا۔

مگر ان دونوں صورتوں کے علاوہ بھی کبھی کبھی ممتاز محدثین اور تجربہ کار اصحاب جرح و تعدیل کسی حدیث پر وضع کا حکم کسی ایسے معنی کی وجہ سے لگا دیتے ہیں جو حدیث کے باطن کو نقصان پہنچاتا ہو اور یہ حکم صرف اپنے ذوق پر نہیں اترنے کی وجہ سے لگاتے ہیں، ان کے اس ذوق کی تائید اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس قول سے ہوتی ہے:

---

(۱) کشف الخفاء (۱/ ۱۴)

تم میری طرف سے کوئی بات سنو جسے تمہارا دل قبول کرے، تمہارے رونگٹے کھڑے ہوجائیں اور تمھیں یہ بات اپنے دین اور فہم کے قریب معلوم ہوتو سمجھو کہ میں اس بات کا تم سے زیادہ قبول کرنے والا ہوں اور جب میری جانب سے کوئی ایسی بات سنو جسے تمہارا دل قبول نہ کرے، تم پر کوئی اثر نہ ہو اور فہم سے دور معلوم ہو تو سمجھ لو کہ میں تم سے زیادہ اس بات سے نفرت کرنے والا ہوں۔

اس حدیث کو امام احمد نے ابوحمید اور ابواسید سے روایت کیا ہے۔ یہ حدیث ان محدثین کے لیے دلیل ہے جو حدیث کو صرف سن کر یا دیکھ کر وضع کا حکم لگا دیتے ہیں، اگر چہ اس کی سند اور اس کا ظاہر صحیح ہو۔ لیکن یہ چیز صرف ان ہی لوگوں کے لیے روا ہے جن کا حدیث سے ایک زمانے تک تعلق رہا ہو اور اُنھوں نے اس کی خدمت کی ہو، جس کی وجہ سے کلام نبوی کا انھیں ایسا ذوق حاصل ہو گیا ہو، اور اُن کی طبیعت اس میں اس طرح رچ بس گئی ہو کہ وہ صرف حدیث صحیح، یا کلام نبوی سنتے ہی اس کی طرف مائل ہو جاتی ہو اور اسے قبول کر لیتی ہو، اسی طرح سند میں غور وفکر کیے بغیر غلط حدیث سنتے ہی ان کا دل اس سے متنفر ہو جاتا ہو۔

یہیں سے واضح ہوا کہ جس کو حدیث کے معنی کا ذوق حاصل نہ ہو وہ غلطی کر جاتا ہے، اسی طرح سے بعض محدثین صرف ظاہر اسناد پر اعتماد کرتے ہوئے بے اصل اور باطل روایات پر صحت کا حکم لگا دیتے ہیں اور بعض احادیث صحیحہ کو باطل کہہ دیتے ہیں، یقیناً وہ معذور ہیں، اس لیے کہ ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی معتمد دلیل نہیں ہوتی، لیکن مذکورہ حدیث اس کے برخلاف کا پتہ دیتی ہے اور حدیث کے ردوقبول میں ایک قاعدہ پیش کرتی ہے، وہ قاعدہ یہ ہے کہ دل اس کی معرفت پالے اور اسے قبول کر لے یا ایسے محدث کی روح کا میلان اس حدیث کی جانب ہو جس کی روح میں سنت رسول رچی بسی ہو، دل منور ہو، ذہن پاکیزہ ہو، علم حدیث میں مہارت رکھتا ہو ، حدیث کے ردوقبول میں ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کا میلان قلب اور انکار قلب کا کوئی اعتبار نہیں، جیسے خشک فقہا، قصہ گو واعظین اور نام نہاد صوفیہ وغیرہ، مگر عارفین کا اعتبار ہے جو کشف صحیح رکھتے ہوں اور خداداد گہری بصیرت کے مالک ہوں، ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کا کوئی اعتبار نہیں، کیوں کہ ان کا حدیث سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور ان میں مومنانہ فراست نہیں پائی جاتی۔ چنانچہ کتنی ایسی حدیثیں ہیں جنھیں حفاظ حدیث نے صحیح قرار دیا ہے جب کہ وہ ازروئے معنی باطل، قرآن وسنت صحیحہ کے

معارض اورتاریخ وواقعات کے مخالف ہیں اور ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ وہ راوی جس کی عدالت معروف ہو، اُسے کبھی وہم ہوجاتا ہے یا غلطی ہوجاتی ہے بلکہ وہ کبھی جھوٹ پر بھروسہ کرلیتا ہے، کیوں کہ راوی کی شہرت اور عدالت کا یہ مطلب نہیں کہ اس سے روایت کردہ چیزیں واقعی طور پر قطعی ہی ہوں۔(۱)

بہت سارے محدثین اور مشائخ، حدیث کے ردوقبول میں کشف اور الہام پر اعتماد کرتے ہیں اور اس کی طرف اشارہ اِس طرح کے جملوں سے کرتے ہیں کہ یہ حدیث ہمارے (مشائخ صوفیہ کے) نزدیک صحیح ہے۔ یہ حدیث کشف کے اعتبار سے صحیح ہے، وغیرہ۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ محدثین نے بھی بعض موقعوں پر الہام کا سہارا لیا ہے، امام سخاوی لکھتے ہیں:

علل حدیث کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے محدثین نے الہام کو پیش کیا ہے، حاکم نے ابن مہدی کا ایک قول نقل کیا ہے کہ علت حدیث کی معرفت الہامی ہے، اگر علل حدیث کے عالم سے پوچھا جائے کہ آپ نے یہ بات کہاں سے بیان کی ہے تو ان کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں ہوگی سوائے اس کے کہ قبول وانکار میں ان کے دل کا میلان ہی حجت ہے۔(۲)

حاکم نے اپنی سند سے بیان کیا ہے:

ابن زرعہ سے کسی نے سوال کیا کہ آپ لوگوں کے پاس حدیث میں علت بیان کرنے کے لیے کیا دلیل ہوتی ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ جس حدیث کی علت کے بارے میں جاننا چاہتے ہو، اس کو مجھ سے پوچھو اور جو میں بتاؤں اسے یاد رکھو، پھر محمد بن مسلم بن وارۃ کے پاس جاؤ اور اسی روایت کے بارے میں ان سے سوال کرو، وہ جو جواب دیں اس کو بھی یاد رکھو لیکن انھیں یہ نہ بتانا کہ تم اس کے بارے میں مجھ سے پوچھ چکے ہو، پھر ابوحاتم کے پاس جاؤ اور اُن کی بیان کردہ علت کو بھی سامنے رکھو، پھر ہمارے اقوال کے درمیان تطبیق دو، اگر سارے موافق ہوں تو جان لو کہ یہی اس علم (علت) کی حقیقت ہے، اس شخص نے ایسا ہی کیا، اس نے ان محدثین کے اقوال کو متفق پایا تو اس نے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ علم، الہام ہے۔(۳)

---

(۱) المغیر، خاتمہ (ص: ۱۳۶-۱۳۸)

(۲) سخاوی/ فتح المغیث (۱/ ۲۲۹)

(۳) حاکم/ معرفۃ علوم الحدیث، نوع: ۲۷، معرفۃ علل الحدیث (ص: ۱۷۴)

اس گفتگو سے واضح ہوا کہ الہام وکشف کے بغیر محدثین بھی علم حدیث کو مکمل نہیں کہہ سکتے۔

علامہ عبداللہ بن احمد نسفی (۷۱۰ھ) نے احکام میں قرآن، سنت، اجماع اور قیاس کے نہ پائے جانے کی صورت میں الہام کو صاحب کشف کے حق میں بطور حجت ودلیل قبول کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

الہام، ادلۂ اربعہ (یعنی قرآن، سنت، اجماع اور قیاس) کے نہ پائے جانے کی صورت میں صاحبِ الہام کے حق میں حجت ہے، غیر کے حق میں نہیں، جیسے تحری (کہ ایک شخص کسی خاص مسئلے میں کسی شرعی دلیل کے نہ ہونے کی وجہ سے صرف اپنے قیاس پر عمل کرتا ہے، جیسے کوئی شخص ایسی جگہ ہو جہاں اُسے قبلہ بتانے والا کوئی نہ ہو اور اُس کے پاس کوئی دوسری دلیل بھی نہ ہو تو وہ اپنے قیاس کے مطابق جس رخ پر چاہے نماز ادا کرلے، اس کی نماز ہو جائے گی۔ دوسرے کی نہیں۔)(۱)

شیخ ابن تیمیہ (۷۲۸ھ) نے کتاب وسنت اور اجماع کے سوا کسی شخص کے الہام کو مستقل بالذات دلیل شرعی ماننے سے انکار کیا ہے۔ لیکن دو دلیلوں کے درمیان تعارض وتردد کے وقت کسی ایک کو ترجیح دینے کے لیے الہام کی حقیقت کو تسلیم کیا ہے اور اپنے فتاوی میں اس پر تفصیل سے بحث کی ہے، نیز الہام کی حجیت کو قطعی دلیلوں سے ثابت کیا ہے، اسی میں انھوں نے لکھا ہے:

جن لوگوں نے الہام کو کسی بھی طرح کی دلیل ماننے سے انکار کیا ہے انھوں نے خطا کی ہے اور جن لوگوں نے اُسے مستقل دلیل شرعی مانا ہے انھوں نے بھی خطا کی ہے۔ (اس لیے کہ کتاب وسنت کے علاوہ کوئی بھی دلیل شرعی مستقل نہیں ہے) لیکن ایک سالک جب ظاہری دلیل شرعی میں غور کرتا ہے اور اسے اُس میں ترجیح کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی، مگر اُس کا دل کسی ایک فعل کی طرف مائل ہو، تو ایسے صالح، متقی اور نیک نیت شخص کا الہام اس کے حق میں دلیل ہے۔ یہ الہام بعض دلیل شرعی، جیسے قیاس ضعیفہ، احادیث ضعیفہ، نص کے احتمالات ضعیفہ اور استصحاب ضعیفہ کو قوت فراہم کرتا ہے، یہ وہ ادلۂ شرعیہ ہیں جنھیں مذہب، اختلافات اور اصول فقہ میں غور وفکر کرنے والے دلیل بناتے ہیں۔(۲)

اسی طرح جب دو فعلوں کے درمیان کسی ایک کی تقویت یا ترجیح کی کوئی صورت نظر نہ

---

(۱) کشف الاسرار (۲/۳۱۶)

(۲) مجموع الفتاوی (۱۰/۴۷۳)

آئے، یا مسئلہ امر مباح سے متعلق ہو جس میں علم کے بغیر بھی عمل کرنا جائز ہوتا ہو، تو ایسے حالات میں ابن تیمیہ نے الہام پر مکمل اعتماد کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

یعنی بہت سارے اہل ایمان اور اہل کشف کے دل میں اللہ تعالیٰ یہ بات ڈال دے کہ یہ کھانا حرام ہے یا اس کے برعکس اس کے دل میں یہ بات ڈال دے کہ یہ کھانا حلال ہے، اس کے سامنے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس القا اور الہام کے علاوہ کوئی ظاہری دلیل نہ ہو۔ اس طرح کی دوسری بہت سی مثالیں ہوسکتی ہیں، جن کا صدور اولیاء اللہ اور مومن متقی بندوں سے بعید نہیں ہے۔(۱)

اس تعلق سے حضور داعی اسلام ادام اللہ ظلہ علینا نے ایک حکایت بیان فرمائی:

ایک بزرگ اپنے چند مریدوں کے ساتھ کسی مقام پر تھے، ان کے پاس کھانے کا کوئی سامان نہ تھا، مریدوں نے عرض کیا کہ حضور! کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اس پر اُن بزرگ نے فرمایا کہ صبر کرو۔

کچھ دیر بعد مجہول الحال لوگوں کی ایک جماعت اس بزرگ کے پاس آئی اور اُنھیں ایک گائے اور آٹے کی بوری نذر کی۔ بزرگ نے اپنے مریدوں سے کہا کہ گائے ذبح کرو، روٹی پکاؤ اور کھاؤ، لیکن اس کا سر، کھال اور آٹے کی بوری الگ رکھ دینا۔ ان کے ساتھ کچھ علما بھی تھے جنھیں یہ اعتراض تھا کہ اس طرح کا مال ہمارے لیے حلال کیسے ہوسکتا ہے؟ اور اُن لوگوں نے کھانے سے پرہیز کیا۔

اس کے بعد ایک شخص آیا اور اس بزرگ سے عرض کیا کہ میں نے آپ کی خدمت میں ایک گائے پیش کرنے کی نذر مانی تھی، لیکن لٹیروں کی ایک جماعت اسے لوٹ لے گئی۔ اس بزرگ نے فرمایا کہ تمہاری گائے کیسی تھی؟ اور اُسے ذبح شدہ گائے کی کھال اور اُس کا سر دکھایا، اس شخص نے اپنی گائے پہچان لی اور کہا کہ یہی میری گائے ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے فرمایا کہ ہم تک تمہاری نذر پہنچ گئی۔

پھر اس کے بعد ایک دوسرا شخص آیا اور اُس بزرگ کی خدمت میں عرض کیا: حضور! میں نے ایک بوری آٹا، آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی نذر مانی تھی مگر کچھ لٹیرے آئے اور اُس کو لوٹ کر لے گئے۔

اس شخص سے بھی بزرگ نے یہی فرمایا: آٹے کی بوری کیسی تھی اور اُسے وہ آٹا والی

---

(۱) مجموع الفتاوی (۷/۴/۱۵۲)

بوری دکھائی گئی، اُس نے کہا کہ یہی میری بوری ہے۔ بزرگ نے فرمایا: تمہاری نذر بھی ہم تک پہنچ گئی۔

داعی اسلام شیخ ابوسعید ادام ظلہ علینا فرماتے ہیں کہ اس سے تین باتیں واضح ہوتی ہیں:

۱۔ اللہ اپنے بعض بندوں پر ایسے حقائق کھول دیتا ہے جن پر عام لوگ آگاہ نہیں ہو پاتے اور اسے خلاف شرع سمجھ لیتے ہیں۔

۲۔ تمام متبعین کے لیے شیخ کے الہام پر عمل کرنا لازم نہیں لیکن جو لوگ الحب فی اللہ میں مغلوب ہوں ان کے لیے شیخ کے الہام و کشف پر عمل کرنا درست ہے۔

۳۔ اگر بعض متبعین شیخ کے الہام و کشف پر ظاہر کو ترجیح دیں تو اُنھیں طعن و تشنیع کا نشانہ بنانا مناسب نہیں۔

علامہ ابراہیم شاطبی (۷۹۰ھ) نے الہام کی حجیت کو مندرجہ ذیل شرطوں کے ساتھ صحیح مانا ہے:

''الہام کسی امر مباح سے متعلق ہو اور اُس پر عمل کرنا کسی ایسے فائدے کی وجہ سے ہو جس کے حصول کی کوشش کی جاتی ہے، یا الہام میں ایسے پند و نصائح، خوشخبریاں، عبرتیں اور وعیدیں ہوں جن سے کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی تحریک ملے۔''

پھر اِن شرطوں کے بیان کرنے کے بعد تحریر کرتے ہیں: ''حاصل گفتگو یہ ہے کہ خارق عادت امور جیسے الہام و کشف پر عمل کرنے میں ان شرطوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔''(۱)

معاصر اسکالر یوسف قرضاوی نے الہام کو ایک شرعی دلیل کی حیثیت سے تسلیم کیے بغیر قرآن و سنت کی فہم کے لیے اس کو معتبر مانا ہے، وہ لکھتے ہیں:

اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض متقی بندوں پر کتاب و سنت کی معرفت کے لیے فضل الٰہی اور فتوحات الٰہی کے ذریعے علم کے حقائق کا کشف فرماتا ہے اور معرفت کے انوار نازل فرماتا ہے، جب کہ دوسرے بہت سارے لوگ ان ہی حقائق کو درس و تدریس اور مطالعہ کے ذریعے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، پھر بھی وہ کامیاب نہیں ہو پاتے۔(۲)

---

(۱) الموافقات (۲/ ۴۷۴)

(۲) موقف الاسلام من الالہام (ص: ۳۰)

ان علما کے اقوال سے جہاں یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک الہام مختلف شرطوں کے ساتھ احکام میں بھی معتبر ہے، وہیں یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ معتمد اور مرجع عام وخاص محققین صوفیہ نے جن احادیث کو کشف سے روایت کیا ہے اور وہ محدثین کے یہاں نہیں پائی جاتیں، تو ایسی احادیث؛ احکام کو قوت بخشنے، دلوں کو منور کرنے اور نفس کو پاک کرنے کے لیے حجت و دلیل ہیں۔

کشف والہام کے قبول کرنے کے شرائط

کشف و الہام کے ذریعے حدیث پر حکم لگانے کے مسئلے میں ایک اہم مسئلہ حدود و قیود اور شرائط کا بھی ہے۔ جن لوگوں نے کشف والہام کو الگ الگ شرطوں کے ساتھ مقید کیا ہے، ان کو ہم ایک دوسرے سے ضم کر دیتے ہیں، تاکہ ان شرائط کے ذریعے ہم افراط وتفریط اور مبالغہ و غلو کے درمیان اعتدال کی راہ تلاش کرسکیں۔ انھی تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے داعی اسلام مرشدی شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی ادام اللہ ظلہ فرماتے ہیں:

عارفین کے نزدیک کشف و اِلہام اور خواب کے ذریعے حدیث بیان کرنے یا کشف و فراست سے حدیث پر صحت وضعف کا حکم لگانے کے لیے چند شرطیں ہیں جن کا اعتبار کیے بغیر حکم لگانا بہت ہی دشوار ہے، بلکہ ہلاکت خیز بھی ہے؛ کیوں کہ اس طرح امان اٹھ جائے گا۔ وہ شرطیں یہ ہیں:

سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ کشف سے ثابت شدہ حدیث دین کے ان اصول عامہ کے مخالف نہ ہو جن کا ثبوت ادلۂ شرعیہ سے ہو، بلکہ زیادہ بہتر یہ ہے کہ حدیث کشفی سنت ثابتہ، یا اقوال صحابہ وتابعین سے مؤید ہو۔

دوسری یہ کہ یہ حدیث باب اعتقاد یا حلال وحرام کے قبیل سے نہ ہو۔

تیسری یہ کہ الہام، صاحبِ الہام اور اُن کے متبعین کے لیے حجت ہے جو صاحبِ الہام کی محبت میں مغلوب ہوں، لیکن دوسروں کے لیے حجت نہیں۔

اسی طرح حدیث منامی صاحب کشف اور اُن کے متبعین کے لیے تو قابل عمل ہے مگر وہ ناقدین جو اس حدیث کا انکار کریں اُنھیں برا کہنا درست نہیں۔

چوتھی یہ کہ اس حدیث کا کشف کرنے والا یا اپنے کشف و اِلہام سے حدیث کو صحیح یا ضعیف قرار دینے والا مشائخ کبار سے ہو، اور جس کی عظمت و بزرگی پر اُس کے ہم عصر مشائخ نے اعتماد کیا ہو۔

حضور داعی اسلام ادام اللہ ظلہ علینا اِن شرطوں کو واضح کرنے کے لیے، مولانا عبدالرحمن جامی قدس اللہ سرہٗ کی نقل کردہ یہ حکایت بیان فرماتے ہیں:

> حدیث نبوی میں ہے کہ ستّر ہزار بار کلمہ طیبہ پڑھنا، پڑھنے والے کی نجات کے لیے یا اس کی نجات کے لیے جس کے واسطے وہ پڑھا گیا، پورا پورا اثر رکھتا ہے۔ شیخ

ابوالربیع مالقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس ذکر کو ستر ہزار بار کیا تھا، لیکن کسی کے نام پر معین نہ کیا تھا، ایک دن ایک شخص کے یہاں میں دعوت میں مدعو تھا، میں دستر خوان پر بیٹھا تھا، کچھ اور لوگ بھی موجود تھے، ان لوگوں میں ایک نوجوان صاحب کشف بھی تھا، جب اس لڑکے نے کھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو یکا یک رونے لگا۔ لوگوں نے اس سے رونے کی وجہ دریافت کی، اس نے کہا کہ میں نے ابھی دوزخ کو دیکھا، وہاں میں نے اپنی والدہ کو عذاب میں مبتلا پایا۔

شیخ ابوالربیع فرماتے ہیں کہ میں نے دل میں کہا کہ الٰہی! تو واقف ہے کہ میں نے ستر ہزار بار کلمہ طیبہ پڑھا ہے، میں نے اس کو اس نوجوان کی ماں کی دوزخ سے آزادی کے لیے معین کر دیا ہے، جیسے ہی میں نے یہ نیت دل میں پوری کی وہ نوجوان ہنسنے لگا کہ اب میں اپنی والدہ کو دیکھ رہا ہوں کہ ان کو دوزخ کے عذاب سے رہائی مل گئی ہے۔ الحمد للہ! یہ کہہ کر وہ سب کے ساتھ کھانے میں مشغول ہو گیا۔

شیخ ابوالربیع قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں کہ مجھ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اس حدیث کی صحت اس نوجوان کے کشف سے معلوم ہو گئی اور اس نوجوان کے کشف کے حال کی صحت اس حدیث شریف کے ذریعے معلوم ہو گئی۔ (۱)

مرقات شرح مشکوٰۃ، فصل ثانی، باب ما جاء علی الماموم من المتابعۃ میں یہی کشف والا واقعہ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کا بتایا گیا ہے۔

حضور داعی اسلام ارشاد فرماتے ہیں:

یہ حدیث کسی بھی عام اصول دین سے متصادم نہیں ہے اور نہ ہی حلال و حرام کے قبیل سے ہے، جب کہ اس حدیث کی موافق یعنی لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ کی فضیلت میں بہت سی صحیح حدیثیں موجود ہیں۔ شیخ اکبر کے کمالات سے کسی کو انکار نہیں، تمام مشائخ کے نزدیک ان کی عظمت و بزرگی مسلّم ہے، اس لیے اس حدیث کی صحت کو ضرور تسلیم کیا جائے گا۔

کشف والہام کی حجت کے لیے یہ شرائط ضروری ہیں ورنہ ہر کس و ناکس خود سے حدیث بیان کر کے کہنے لگے گا کہ یہ حدیث میں نے کشف سے بیان کی ہے۔ خصوصاً اس زمانے میں ان شرائط کا لحاظ اور بھی ضروری ہے کیوں آج تصوف زہد و تقوی سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ خاندانی وراثت میں تقسیم ہوتا ہے، آج ہر شخص زاہد و عارف بنا ہوا ہے اور ہر فاسق قطبیت کا دعویدار ہے۔

---

(۱) عبد الرحمن/نفحات الانس (ص: ۷۸۳)

ہر بو الہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

کشف سے ثابت شدہ احادیث

کشف سے ثابت شدہ احادیث دو طرح کی ہیں:

ا۔جس میں یہ صراحت ہو کہ یہ حدیث کشف سے ثابت ہے،اس طرح کی احادیث کریمہ بہت ہی کم ہیں۔

۲۔جس میں یہ صراحت نہ ہو، کیوں کہ مشائخ عظام اگر کوئی حدیث بیان کریں اور وہ حدیث کسی کتاب میں نہ ہو تو سمجھ لیا جائے گا کہ انھوں نے یہ حدیث اپنے یا اپنے مشائخ کے کشف سے بیان کی ہے، جیسا کہ عارف باللہ شیخ علی خواص قدس اللہ سرہٗ کا یہ قول گزرا:

> ''کسی فقیہ کے لیے مناسب نہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی ایسی حدیث روایت کرے اور اُس میں کوئی ایسی علامت نہ پائی جائے جس سے حدیث رسول ہونا معلوم ہو، خواہ یہ نقل در نقل کے ذریعے ہو، یا بیداری کی حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کرکے ہو، یعنی جس میں حضور یہ صراحت فرمائیں کہ یہ میرا کلام ہے۔لیکن اس طرح کے کشف کی ضرورت، سند میں ضعف ہونے کی صورت میں ہے،لیکن اگر حدیث محدثین کے اصول پر صحیح ہے اور محدثین نے اس کی تحسین بھی کی ہے تو اُس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کرنے کی ضرورت نہیں۔''

جن احادیث کو صیغۂ جزم کے ساتھ مشائخ نے یہ کہا ہو کہ یہ حدیث رسول ہے اگرچہ انھوں نے یہ وضاحت نہ کی ہو کہ انھوں نے اس حدیث کو نقل در نقل سے لیا ہے، یا کشف سے بیان کیا ہے،تو وہ کشف سے ہی ہے، جب کہ وہ حدیث کتب حدیث میں نہ ملے،جیسا کہ شیخ علی خواص نے وضاحت فرمائی ہے، کیوں کہ عارف سب سے بڑا فقیہ ہوتا ہے، خاص طور سے امام غزالی علیہ الرحمہ جیسی شخصیتیں جنھوں نے بہت سی حدیثیں احیاء العلوم میں ایسی بیان کی ہیں جن کی اصل محدثین کے یہاں نہیں ملتی،جیسا کہ تقی الدین سبکی نے طبقات شافعیہ میں اور زین الدین عراقی نے المغنی میں بیان کیا ہے۔ان سب حدیثوں کو کشف پر محمول کرنا مناسب ہوگا کیوں کہ بغیر تحقیق ایسے لوگ کسی کلام کو رسول کی طرف منسوب نہیں کرسکتے ہیں جیسا کہ عارف باللہ شیخ علی خواص قدس سرہ نے فرمایا ہے۔

ذیل میں بطورِ نمونہ چند حدیثیں پیش کی جاتی ہیں جن میں یہ وضاحت ہے کہ یہ حدیث یا اس کی صحت کشف سے ثابت ہے:

۱۔ امام شعرانی نے ابو المواہب شاذلی سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کی اور آپ سے اس حدیث مشہور: **أُذْكُرُوا اللّٰهَ حَتّٰى يَقُوْلُوْا مَجْنُوْنٌ۔** (تم اللہ کا ذکر اس قدر کرو کہ لوگ تم کو دیوانہ کہنے لگیں) کے بارے میں سوال کیا اور میں نے یہ بھی کہا کہ یہ حدیث صحیح ابن حبان میں ان الفاظ سے مروی ہے: **أَكْثِرُوْا مِنْ ذِكْرِ اللّٰهِ حَتّٰى يَقُوْلُوْا مَجْنُوْنٌ۔** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ابن حبان نے سچ کہا اور دوسرے راوی نے بھی سچ کہا، کیوں کہ یہ دونوں اقوال میرے ہی ہیں، ایک مرتبہ میں نے ان الفاظ سے بیان کیا اور دوسری مرتبہ دوسرے الفاظ سے۔(۱)

۲۔ حدیث: **أَصْحَابِي كَالنَّجُوْمِ بِأَيِّهِمْ إِقْتَدَيْتُمْ إِهْتَدَيْتُمْ۔** (میرے صحابہ ستاروں کی طرح ہیں ان میں سے تم جس کی بھی پیروی کروگے ہدایت پا جاؤ گے۔)

اس حدیث کے بارے میں امام شعرانی فرماتے ہیں:

یہ حدیث اہل کشف کے نزدیک صحیح ہے، اگرچہ محدثین کو اِس حدیث کی صحت میں کلام ہے۔(۲)

غلبۂ حال حجت نہیں

علمائے اسلام بشمول صوفیہ کا اس بات پر اجماع ہے کہ کوئی بھی شخص شریعت سے بالا نہیں ،شریعت سب پر یکساں نافذ ہوتی ہے، جو بھی دائرہ اسلام میں رہنا چاہتا ہے اس کو شریعت اسلامیہ کی حاکمیت تسلیم کرنی پڑے گی۔ اسی شریعت اسلامیہ کا ایک قانون یہ بھی ہے:

رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلَاثَةٍ: عَنِ الصَّبِيِّ حَتّٰى يبلغ، وَعَنِ النَّائِمِ حَتّٰى يَسْتَيْقِظَ، وَعَنِ الْمَجْنُوْنِ حَتّٰى يفِيقَ (۳)

تین شخصوں پر شریعت نافذ نہیں ہوتی، بچہ؛ جب تک بالغ نہ ہوجائے، سویا ہوا شخص ؛ جب تک بیدار نہ ہوجائے اور مجنون؛ جب تک کہ ہوش میں نہ آجائے۔

اسی طرح ناسی، خاطی، مکرہ، اور بے خود حقوق اللہ میں اور بعض صورتوں میں حقوق العباد میں بھی مجنون کی طرح ہیں، حضرت حسن بصری سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

---

(۱) الطبقات الکبری الشعرانیۃ (۲/ ۶۸)

(۲) الطبقات الکبری الشعرانیۃ (۱/ ۳۰)

(۳) سنن أبو داود، کتاب الحدود، باب في المجنون يسرق أو يصيب حدا (۶/ ۵۴۴، ح: ۴۴۰۳)، سنن الترمذی، ابواب الحدود، باب ماجاء فیمن لایجب علیہ الحد (۴/ ۳۲، ح: ۱۴۲۳)

تَجاوَزَ اللّٰہُ عَزَّ وَجَلَّ لِابْنِ آدَمَ عَمَّا أَخْطَأَ وَعَمَّا نَسِيَ، وَعَمَّا أُكْرِهَ، وَعَمَّا غُلِبَ عَلَيْهِ (۱)

اللہ تعالیٰ نے ابن آدم سے خطا، نسیان، اکراہ اور غلبۂ حال کو معاف رکھا ہے۔

اللہ سے شدید محبت کی وجہ سے عموماً صوفیہ پر غلبۂ حال طاری ہوتا ہے، اس وقت وہ بے اختیار و بے خود ہوتے ہیں، اسی حالت میں کوئی کہتا ہے: **سُبْحٰنِی مَا أَعْظَمُ شَأْنِی**، کوئی کہتا ہے: **قَدَمِي هٰذِهٖ عَلٰى رَقْبَةِ كُلِّ وَلِيِّ اللّٰهِ**، کوئی گویا ہوتا ہے: **أَنَا الْحَق**۔ ایسی حالت جس پر بھی طاری ہو وہ معذور و ماجور ہے۔

ان ہی احوال میں سے یہ بھی ہے کہ بعض صوفیہ تجلی کو ذات سمجھ لیتے ہیں، جس کی وجہ سے اپنے مشائخ کے اقوال و اعمال کو غلبۂ حال میں رسول کی طرف منسوب کر دیتے ہیں، اگر یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے تو ان کو معذور جانیں گے اور ان کی اس طرح کی حدیث کو قبول نہیں کریں گے۔

خطا کوئی بھی کر سکتا ہے

قرآن میں ہے:

وَ كُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ وَ جَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَ مَوْعِظَةٌ وَّ ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ۔ (ہود: ۱۲۰)

ہم آپ سے رسولان عظام کے قصے بیان کرتے ہیں، جس سے آپ کا دل مطمئن ہوگا، اور آپ کو مزید عرفان حق حاصل ہوگا، ان میں مومنین کے لیے نصیحت و عبرت ہے۔

صوفیہ عبرت کے لیے امثال و حکایات خاص طور سے اسرائیلی روایات کثرت سے بیان کرتے ہیں، ان ہی حکایات کے بیان کرنے اور انتساب کرنے میں ان سے کبھی کبھی خطا واقع ہو جاتی ہے۔ موقع و محل کے اعتبار سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہتے ہیں، ان کا مقصد دل میں توحید کو راسخ کرنا ہوتا ہے، خوف آخرت دلانا ہوتا ہے اور عمل پر ابھارنا ہوتا ہے وہ اس میں تو کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن واقع کے انتساب میں کبھی کبھی زبردست خطا واقع ہو جاتی ہے۔

کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ شیخ نے لفظ ''قال'' بغیر فاعل کے اظہار کیے ہوئے کہا، اسی طرح شیخ نے فارسی میں کہا ''در حدیث آمدہ است'' یا کہا ''فرمود'' تو مرید نے اس کو رسول کی طرف منسوب کر کے بیان کر دیا اور بعد میں آنے والے لوگ روایت کا معنی درست اور قرآن و حدیث کے موافق ہونے کی وجہ سے بغیر تحقیق کے نقل کرتے رہے۔

---

(۱) سنن سعید بن منصور، کتاب الطلاق، باب ماجاء في طلاق المکرہ (۱/ ۳۱۷، ح: ۱۱۴۶)

اسی لیے صوفیہ کی کتابوں میں مذکور تمام حدیثوں کو جس طرح آنکھ بند کر کے رد کر دینا ظلم ہے اسی طرح سب کو غیر مشروط طور پر قبول کر لینا بھی انصاف کے تقاضوں کو قتل کرنا ہے۔

کیا صرف کتب صوفیہ ہی میں احادیث ضعیفہ وموضوعہ ہیں؟

کتاب اللہ کے سوا کوئی بھی کتاب لاریب نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ دنیا کا کوئی بھی شخص مقتدائے مطلق نہیں ہے، اسی طرح خطا ونسیان سے کوئی بھی انسان بری نہیں ہے۔ اسی لیے ہر فن کی معتبر سے معتبر کتاب میں بھی کچھ نہ کچھ کمی یا خطا ہونا لازمی امر ہے۔

ملاحظہ کیجیے کہ وہ کتابیں جو صرف احادیث صحیحہ کے جمع کرنے کے لیے لکھی گئی ہیں ان میں بھی علما کے ایک طبقے کے نزدیک احادیث موضوعہ و واہیہ موجود ہیں جیسے بخاری و مسلم کی دو درجن سے زائد احادیث پر مختلف علما نے الگ الگ مقام پر حکم وضع لگایا ہے۔ کچھ کی طرف اس سے پہلے اشارہ بھی کیا گیا ہے۔

حاکم نے اپنی کتاب المستدرک علی الصحیحین میں ان احادیث کو جمع کرنے کا ارادہ کیا جو صحیحین کی شرط پر ہیں لیکن اس کے باوجود تقریباً ایک چوتھائی حصہ شدید ضعیف اور موضوع احادیث پر مشتمل ہے۔

صحیح ابن خزیمہ اور صحیح ابن حبان میں بھی احادیث ضعیفہ کی ایک کثیر تعداد موجود ہے۔ اسی طرح سنن و جوامع اور مسانید میں بھی احادیث ضعیفہ بلکہ واہیہ وموضوعہ کی کوئی کمی نہیں ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ کتابیں جن کا مقصد ہی جمع احادیث تھا ان میں بھی احادیث موضوعہ در آئی ہیں تو کتب صوفیہ کی بعض احادیث پر اتنا شور مچانے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر کسی محدث کو صوفیہ کی بعض احادیث پر کلام ہے تو اس طرح کا کلام محدثین کی کتابوں پر بھی ہے۔

خلاصۂ بحث

حدیث کے رد وقبول میں متشددین کے طریقۂ عمل کا ناقدانہ جائزہ اور صوفیہ کے منہج پر ایک تفصیلی مطالعہ سے مندرجہ ذیل باتیں واضح ہوتی ہیں:

۱۔ احکام میں محدثین کے طریقے پر ثابت شدہ حدیث ہی کو قبول کریں گے، اگر درایت و نصوص ثابتہ کے خلاف نہ ہو۔

۲۔ راسخون فی العلم یعنی عارفین باللہ اور عین شریعت کبری سے فیض پانے والوں کے علاوہ کسی کے لیے جائز نہیں کہ احادیث ضعیفہ سے احکام ثابت کرے۔

۳۔ فضائل میں احادیث ضعیفہ، اگرچہ وہ بے سند ہوں، معتبر ہیں۔

۴۔ جو روایت شریعت کے اصول عامہ کے خلاف نہ ہو، اس کے بارے میں یقین سے

نہیں کہا جاسکتا کہ وہ موضوع ہے، اگر چہ جھوٹے راوی نے اسے بیان کیا ہو۔

۵۔مشائخ کبار کی روایت کردہ احادیث جو ہمیں کتب حدیث میں نہ ملیں اور نہ وہ شریعت کے اصول ثابتہ کے خلاف ہوں، ان کے بارے میں نرم رویہ اختیار کرنا چاہیے، اور حتی الامکان ان کو موضوع کہنے سے بچنا چاہیے۔

٦۔ ہاں خواہی نہ خواہی ان ہی روایات پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔

۷۔ جو لوگ پند ونصائح میں صوفیہ کی روایتیں بیان کرتے ہیں انھیں طعن وتشنیع کا نشانہ نہیں بنانا چاہیے۔

۸۔ مشائخ بھی بشر ہیں ان سے خطائیں ہو سکتی ہیں، جہاں تک ممکن ہو تاویل کا سہارا لینا چاہیے، بلاضرورت ان پر طعن کرنا محرومی کا سبب ہے۔

۹۔مشائخ کے غلبۂ حال کو محکم جاننا بھی مریدین کی خطا ہے۔

۱۰۔اور جہاں صوفیہ کی روایت میں کسی بھی طرح تاویل ممکن نہ ہو اور ان کی روایت شریعت اسلامیہ کے قواعد عامہ کے خلاف معلوم ہوتی ہو، وہاں اعتراف حق سے بھی گریز نہیں کرنا چاہیے۔

اب میں اپنی گفتگو یہیں پر ختم کرتا ہوں، اس پورے مقالے میں جو بھی بیان ہوا، اُسے باریک بینی کے ساتھ مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے، ہم نے کوشش کی ہے کہ حدیث کے تعلق سے ایک معتدل نقطۂ نظر سامنے آئے، حدیث کے سلسلے میں اکابر صوفیہ کا مسلک ومنہاج واضح ہو اور مخالفین تصوف کے ساتھ موافقین تصوف میں بھی صوفیہ کے تعلق سے جو بدگمانیاں فروغ پا رہی ہیں، ان کا ازالہ ہو۔

○○○

امام الدین سعیدی

علم لدنی: ایک مطالعہ

علم لدنی یہ لفظ ماخوذ ہے قرآن مقدس کی اس آیت سے جس میں اللہ رب العزت نے حضرت خضر علیہ السلام کے تعلق سے ارشاد فرمایا ہے:

اٰتَیْنٰہُ رَحْمَۃً مِّنْ عِنْدِنَا وَ عَلَّمْنٰہُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا (کہف: ۶۵) ہم نے اُسے اپنے پاس سے رحمت عطا کی اور اسے اپنی جانب سے ایک خاص علم سکھایا۔

اسی سے علم لدنی کی اصطلاح رائج ہوئی جو صوفیہ کرام کے یہاں بکثرت مستعمل ہے۔ یہی اصطلاح ان کی کتابوں اور مضامین میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ یہاں تک کہ امام غزالی کا علم لدنی پر ایک مستقل رسالہ بھی موجود ہے جو الرسالۃ اللدنیۃ کے نام سے موجود ہے۔ امام رازی تفسیر کبیر کے اندر اس کتاب کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں: **وللشیخ ابی حامد الغزالی رسالۃ فی اثبات العلوم اللدنیۃ۔** (۱)

صدیق حسن قنوجی نے اپنی کتاب ''ابجد العلوم'' میں لکھا ہے:

اَلْعِلْمُ الَّذِی تَعَلَّمَہُ الْعَبْدُ مِنَ اللہِ تَعَالٰی مِنْ غَیْرِ وَاسِطَۃ مَلَکٍ أَوْ نَبِیٍّ بِالْمُشَافَھَۃِ وَ الْمُشَاھَدَۃِ کَمَا کَانَ لِخضر عَلَیہِ السَّلام ،قَالَ تعالٰی (اٰتَیْنٰہُ رَحْمَۃً مِّنْ عِنْدِنَا وَ عَلَّمْنٰہُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا۔ (کھف: ۶۵) وَقِیلَ ھُوَ مَعرِفَۃُ ذاتِ اللہِ تعالی و صِفَاتِہ عِلمًا یَقِینِیًّا مِن مُشَاھَدَۃٍ وَّ ذَوقٍ بِبَصَایِرِ القُلُوبِ۔ (۲)

یعنی علم لدنی وہ علم ہے جسے بندہ اپنے رب سے بلا واسطہ بالمشافہ یا بالمشاہدہ حاصل کرتا ہے۔ اس میں کسی نبی یا فرشتے کا واسطہ نہیں ہوتا، جیسا کہ خضر علیہ السلام کا

---

(۱) تفسیر کبیر ج ۲۱ ص ۱۴۹، دار احیاء التراث، بیروت

(۲) ابجد العلوم، ج: ۲، ص: ۴۶۹، دار الکتب العلمیہ، بیروت

معاملہ تھا۔ان کے بارے میں اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا: ہم نے اسے اپنی جانب سے رحمت اور خاص علم عطا کیا۔

بعض لوگوں نے کہا کہ علم لدنی سے مراد، اللہ تعالی کی ذات وصفات کی معرفت اس علم یقینی کے طور پر ہو جو مشاہدہ یا دل کی آنکھ سے ذوق کے واسطے سے حاصل ہوتا ہے۔

آیت مذکورہ کے ضمن میں علم لدنی کی تفسیر کے حوالہ سے عام مفسرین کا کہنا ہے کہ اس علم سے مراد، علم بالغیب ہے۔بعض یہ کہتے ہیں کہ جو علم بطریق الہام حاصل ہوا سے علم لدنی کہتے ہیں اسی کو علم الغیوب بھی کہتے ہیں اسی کو علم باطن الہامی، اور علم الکواین بھی کہتے ہیں۔(۱)

امام قرطبی فرماتے ہیں:

بانہ علم الغیب۔اپنے اس قول کی سند میں ابن عطیہ اندلسی کی یہ عبارت پیش کرتے ہیں: **کان علم الخضر علم معرفة بواطن قداوحیت الیہ لاتعطی ظواھر الاحکام افعالہ بحسبھا وکان علم موسی علم الاحکام والفتیا بظاھر اقوال الناس وافعالھم۔**(۲): خضر علیہ السلام کا علم باطن کی معرفت کا علم تھا جس کی طرف آیت میں اشارہ کیا گیا ہے، لہذا اس کے افعال پر ظاہری احکام صادر نہیں ہوں گے اور موسی علیہ السلام کا علم علم احکام وفتوی تھا جو لوگوں کے ظاہری اقوال وافعال سے متعلق ہوتا ہے۔

تفسیر ابن کثیر میں ہے:

جب موسی علیہ السلام پر اللہ کی طرف سے یہ وحی آئی: **ان لی عبدا ھو اعلم منک یعنی الخضر۔فذھب الیہ موسی وقال لہ اتیتک لتعلمنی مماعلمت رشدا فقال لہ الخضر انی علی علم من علم اللہ علمنیہ لاتعلمہ انت، وانت علی علم من علم اللہ علمکہ اللہ لا اعلمہ۔وھذا دلیل علی ان العلم اللدنی عطاء من اللہ ولیس کسبا من العبد۔**(۳)

اے موسی! میرا ایک بندہ ہے جو تجھ سے زیادہ علم والا ہے۔یعنی خضر علیہ السلام۔تو موسی علیہ السلام خضر کے پاس پہنچے اور ان سے کہا میں آپ کے پاس اس لیے آیا

---

(۱) بیضاوی، نسفی، خازن

(۲) تفسیر قرطبی، ج:۶،ص:۴۰۵۵، دارالریان للتراث

(۳) تفسیر ابن کثیر، ج:۳،ص:۹۲۔۹۳، طہ الحلبی، مصر

ہوں کہ آپ مجھے وہ علم سکھا دیں جو آپ جانتے ہیں ، خضر علیہ السلام نے کہا ہاں! میں اللہ کی عطا سے ایک ایسا علم رکھتا ہوں جو مجھے ہی بتایا گیا ہے اس کو آپ نہیں جانتے۔ اورآپ بھی اللہ کی عطا سے ایک ایسا علم رکھتے ہیں جو صرف آپ ہی کو معلوم ہے اسے میں نہیں جانتا۔ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ علم لدنی اللہ کی عطا ہی سے حاصل ہوتا ہے، بندہ کے کسب میں نہیں ہے۔

امام رازی مذکورہ آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

تلك العلوم حصلت عنده من عند الله من غير واسطة، والصوفية سموا العلوم الحاصلة بطريق المكاشفات العلوم اللدنية ۔وہ سارے علوم جو بندے کو من جانب اللہ بلا واسطہ عطا ہوں ،اور صوفیہ جن علوم کو بطریق مکاشفہ حاصل کرتے ہوں، ان کو علم لدنی کہا جاتا ہے۔

بعض مفسرین سے منقول ہے کہ علم لدنی وہ علم خاص ہے جو صرف رب کی توفیق ہی سے عطا ہوتا ہے، یہ علم ربانی، بندے کے اخلاص وتقوی کا ثمرہ ہوا کرتا ہے۔(۱)

امام محمد غزالی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں:

ان القلب اذا طهر من ادران المعاصی وصقل بالطاعات اشرقت صفحته فانعكس عليها من اللوح المحفوظ ماشاءالله ان يكون، وهذا هو العلم المعروف بالعلم اللدنی (۲)

جب قلب معصیت کی گندگی وآلودگی سے پاک ہو جائے اور طاعتوں سے منور ہو جائے ،تو اس روشن اور منور قلب پر مشیت مولیٰ کے مطابق لوح محفوظ کا عکس پڑتا رہتا ہے۔اسی علم کو علم لدنی کہا جاتا ہے۔

منطقی وعقلی توضیحات

بعض صوفیہ و متکلمین نے علم لدنی کو بہت سارے علوم کے ضمن میں واضح کیا ہے، ذیل میں ان کی توضیحات وتشریحات کے چند حصے پیش ہیں:

(۱)علم یا تو تصور ہے یا تصدیق۔ جب ہم کسی امر کا ادراک یا کسی حقیقت کا تصور کرنا چاہتے ہیں تو اس پر کوئی حکم لگائیں گے یا حکم سے خالی رکھیں گے۔اگر حکم لگاتے ہیں تو تصدیق ہے

---

(۱)مفاتیح الغیب، جلد:۲۱،ص:۱۴۹،دار احیاء التراث، بیروت

(۲)المنقذ من الضلال،ص:۲۷،دار الفکر العربی، قاہرۃ

نہیں لگاتے ہیں تو تصور ہے۔ پھر دونوں میں سے ہر ایک یا تو نظری ہوں گے جو بغیر کسب اور طلب کے حاصل ہوا ہو یا کسب وطلب سے حاصل ہوا ہو۔ وہ علوم نظریہ جو نفس و عقل میں بلا کسب حاصل ہوتے ہیں ان کی مثال جیسے انسان کا لذت والم کا تصور کرنا۔ اور اس بات کی تصدیق کہ ان الواحد نصف الاثنین۔ گویا علوم نظری کی دو قسمیں ہیں کسبیہ، غیر کسبیہ۔

علوم کسبیہ وہ علوم ہیں جو ابتداء ہر نفس میں حاصل نہیں ہوتے بلکہ کسی طریقہ کا سہارا لے کر ان کو حاصل کیا جاتا ہے۔ امام رازی اس طریقہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وهذا الطريق على قسمين: أحدهما أن يتكلف الإنسان تركب تلك العلوم البديهية النظرية حتى يتوصل بتركبها إلى استعلام المجهولات. وهذا الطريق هو المسمى بالنظر والتفكر والتدبر والتأمل والتروي والاستدلال، وهذا النوع من تحصيل العلوم هو الطريق الذي لا يتم إلا بالجهد والطلب. والنوع الثاني: أن يسعى الإنسان بواسطة الرياضات والمجاهدات في أن تصير القوى الحسية والخيالية ضعيفة فإذا ضعفت قويت القوة العقلية وأشرقت الأنوار الإلهية في جوهر العقل، وحصلت المعارف وكملت العلوم من غير واسطة سعي وطلب في التفكر و التأمل، وهذا هو المسمى بالعلوم اللدنية۔ (۱)

وہ طریقے دو قسم کے ہیں: ایک یہ کہ انسان نظری بدیہی علوم کو ترتیب و ترکیب دینے کی کوشش کرتا ہے تاکہ اس سے مجہول کو جان سکے اسی طریقے کو فکری و تاملی اور استدلالی طریقہ کہتے ہیں اس قسم کے طریق سے علم کا حصول مشقت وطلب کے بغیر نہیں ہوتا۔ دوسری قسم یہ ہے کہ انسان ریاضت ومجاہدہ کے ذریعہ کوشش کرتا رہے تاکہ اس کے حسی وخیالی قوٰی کمزور ہو جائیں اور قوت عقل مستحکم ہو جائے، جوہرِ عقل انوار الہیہ سے روشن ہو جائے پھر علوم و معارف بغیر کسی فکری سعی وطلب کے حاصل ہونے لگے۔ اسی کو علوم لدنیہ کہا جاتا ہے۔

مزید وضاحت کے ساتھ آگے لکھتے ہیں:

إذا عرفت هذا فنقول: جواهر النفس الناطقة مختلفة بالماهية فقد تكون النفس نفسا مشرقة نورانية إلهية علوية قليلة التعلق بالجواذب البدنية

---

(۱) تفسیر کبیر، ج: ۲۱، ص: ۱۴۹، دار احیاء التراث، بیروت

والنوازع الجسمانية فلا جرم كانت أبدا شديدة الاستعداد لقبول الجلايا القدسية والأنوار الإلهية، فلا جرم فاضت عليها من عالم الغيب تلك الأنوار على سبيل الكمال والتمام، وهذا هو المراد بالعلم اللدني وهو المراد من قوله: {رحمة من عندنا وعلمناه من لدنا علما*} وأما النفس التي ما بلغت في صفاء الجوهر وإشراق العنصر فهي النفس الناقصة البليدة التي لا يمكنها تحصيل المعارف والعلوم إلا بمتوسط بشري يحتال في تعليمه وتعلمه والقسم الأول بالنسبة إلى القسم الثاني كالشمس بالنسبة إلى الأضواء الجزئية وكالبحر بالنسبة إلى الجداول الجزئية (مصدر سابق)

نفس انسانی کے جواہر مختلف الماہیت ہوتے ہیں ایک وہ نفس ہے جو روشن، نورانی، علوی، الٰہی ہے، بدنی وجسمانی تقاضوں سے بہت کم تعلق رکھتا ہے ایسا نفس انوار الٰہیہ وتجلیات قدسیہ کے قبول کرنے کی اعلی استعداد رکھتا ہے اسی وجہ سے اس پر کمال وتمام کے ساتھ عالم غیب سے انوار ومعارف کا نزول ہوتا رہتا ہے یہی علم لدنی ہے، آیت کریمہ میں علم لدنی سے مراد یہی علم ہے۔ اور وہ نفس جس میں صفائی اور جس کے عنصر میں نورانیت نہ ہو وہ نفس ناقص اور خسیس ہے وہ علوم حاصل کرنے میں عام انسانی طریقہ کا محتاج ہوگا۔ پہلی قسم کا علم بہ نسبت دوسری قسم کے علم کے ایسے ہی ہے جیسے ایک سورج ہو اور دوسرا اس کی معمولی شعائیں ہوں، جیسے ایک سمندر ہے اور دوسرا چھوٹی چھوٹی نہریں ہوں۔

علم لدنی کا مقام

یوں تو علم خواہ جیسا بھی ہو عظیم سرمایہ ہے، اس پر سب کا اتفاق ہے اس لیے کہ علم جہالت کی ضد ہے اور جہل تاریکی وظلمت کا نام ہے، اور تاریکی کسی بھی جہت سے اچھی چیز نہیں، جب کہ علم ایک نور ہے اور یہ ظاہر ہے کہ تاریکی اور روشنی دونوں برابر نہیں ہوسکتی۔

قرآن کریم میں ہے:

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ (فاطر:۱۹/۲۰)

ترجمہ: اندھے اور آنکھ والے برابر نہیں اور نہ ظلمت ونور برابر ہیں۔

تمام علوم میں علم لدنی کو وہ درجہ حاصل ہے جو کسی بھی علم کو نہیں، کیوں کہ یہی حقیقت میں جو ہر علم اور نور علم ہے اور جب تک نور علم یا جو ہر علم حاصل نہ ہو تو ایسا علم چند عبارتوں اور کتابوں تک

ہی محدود رہتا ہے۔

تمام علوم خواہ کسبی ہوں یا وہبی ہوں وہ نفس ناطقہ کے شعور وادراک میں ہوتے ہیں، انسانی طبیعت میں اللہ رب العزت نے ایک عظیم جوہر ودیعت کر رکھا ہے، اسی جوہر کا نام منطقی اصطلاح میں نفس ناطقہ ہے، وہ جوہر لطیف ہوا کرتا ہے، جب کسی کے اندر جسمانی و بدنی تقاضوں کا احساس کمزور ہو جائے اور روح غالب آجائے تو وہ اس قدر صاف اور لطیف ہو جاتا ہے کہ وہ نورانی کہلانے لگتا ہے، اس جوہر کے اندر اس بات کی بھر پور صلاحیت اور قابلیت آجاتی ہے کہ وہ تجلیات ربانی کا حامل ہو جائے، پھر عالم غیب سے اس کے لیے علوم ومعارف کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے اسی علم کو علم لدنی کہا جاتا ہے اور جس کے اندر یہ جوہر اس قابل نہیں ہوتا، بلکہ وہ نفسانی و بشری تقاضوں کی تکمیل میں غرق رہتا ہے تو اُسے یہ علم نہیں عطا ہوتا، چوں کہ اس کے اندر وہ ظرف ہی نہیں ہوتا جو اس علم کی قرارگاہ بن سکے۔

اس کی دوسری پہچان یہ ہے کہ علم لدنی ان ذرائع اور طریقوں سے حاصل نہیں ہوتا جو انسانی ذہن نے ایجاد کیے ہیں، بلکہ وہ پاکیزہ قلوب میں ایسے وارد ہوتا ہے کہ انھیں یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ یہ کہاں سے آیا اور کیسے آیا؟

جو علوم انسانوں کو حاصل ہوتے ہیں، امام غزالی قدس سرہٗ نے اس کے حصول کا دو ذریعہ بیان کیا ہے:

۱۔ تعلم انسانی ۲۔ تعلم ربانی

تعلم انسانی وہ طریقہ ہے جو لوگوں میں رائج اور معروف ہے، جن پر ارباب بصیرت کا اتفاق ہے یا وہ تمام ذرائع جو حصول علم کے لیے ماہرین نے وضع کیے ہیں، خواہ وہ خارجی ذرائع ہوں یا داخلی، جیسے غور وفکر کرنا یہ حصول علم کا داخلی ذریعہ ہے، ان ذرائع سے علم حاصل کرنے کے لیے انسان کا سلیم الفطرت اور صحیح العقل ہونا کافی ہے، ان ذرائع سے جو علوم حاصل ہوتے ہیں انھیں کسبی کہا جاتا ہے۔

تعلمِ ربانی وہ ہے جس میں انسانی کسب کا دخل نہیں ہوتا، نہ ان ذرائع کا استعمال کیا جاتا ہے، جو انسانی ذرائع کہلاتے ہیں، بلکہ یہ خالص ربانی عنایت سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں:

ایک قسم وحی ہے جو انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والتسلیم کے لیے خاص ہے اور جو بغیر تفکر و تدبر کے انھیں عطا کیا جاتا ہے۔ یہ دراصل قلب لطیف پر مشکاۃ غیب سے ضیا پاشی ہوتی رہتی ہے ، اب چوں کہ باب نبوت بند ہو چکا ہے اس لیے یہ علم کسی کو بھی حاصل نہیں ہوسکتا۔ وحی کے ذریعے

جوعلم حاصل ہوتا ہے وہ سب سے اکمل اور مستحکم ہوتا ہے وہ علم یقین وشہود کا فائدہ دیتا ہے، اس میں کہیں سے بھی کوئی التباس نہیں ہوتا۔

دوسری قسم الہام ہے جو غیر نبی کو عطا ہوتا ہے، الہام، علم کا ذریعہ ہے مگر وحی کے مقابلے میں الہام ایسے ہی ہے جیسے سمندر کے مقابلے میں قطرہ یا آفتاب نصف النہار کی روشنی کے مقابلے میں مدہم چراغ کی روشنی۔ الہام وحی کا عکس ہوتا ہے، یہ اس بندے کو حاصل ہوتا ہے جس کا قلب خباثتوں اور گناہوں سے محفوظ ہو، وحی کے ذریعے جو علم حاصل ہوا اُسے علم نبوی کہتے ہیں اور الہام کے ذریعے جو حاصل ہوا اُسے علم لدنی کہتے ہیں، وحی انبیا کا زیور ہے اور الہام اولیا و اصفیا کی زینت۔ جو فرق نبی اور ولی میں ہوتا ہے وہی فرق وحی و الہام میں ہے۔(۱)

علم لدنی کی استعداد و اہلیت

یہ بات مسلم ہے کہ اس علم کو حاصل کرنے کے لیے انسان لاکھ جتن کرے اگر اللہ نہ چاہے تو اسے کبھی نصیب نہ ہو، اس علم کا ملنا فضل الٰہی پر موقوف ہے ۔ایں سعادت بزور بازو نیست، تانہ بخشد خدائے بخشندہ۔

عارفین و سالکین نے اپنے اپنے اعتبار سے اس کی استعداد و قابلیت کے لیے کچھ اصول، مجاہدے اور مراقبے بیان کیے ہیں، مجموعی طور سے سب کا حاصل یہ ہے کہ بندے کے اندر جس قدر صفائے نفس اور تزکیۂ باطن ہوگا اسی قدر استعداد بڑھتی جائے گی اور اس کے علم میں اضافہ ہوتا رہے گا، یا اس بندے کا تعلق ذات علیم سے جتنا زیادہ قوی ہوگا اسی قدر وہ علم پائے گا اور جس قدر اطاعت و بندگی کا جذبہ قوی ہوگا اسی قدر تعلق باللہ میں قوت و استحکام پیدا ہوگا اور جس قدر قربت ہوگی اسی قدر عنایت ہوگی۔

قرآن کریم میں جسے حکمت کہا گیا ہے اس میں علم لدنی بھی شامل ہے۔قرآن کریم میں اس کے تعلق سے یوں فرمایا گیا ہے يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ وَ مَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا وَ مَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ (بقرہ:۲۶۹) اللہ جسے چاہتا ہے حکمت عطا فرماتا ہے اور جسے حکمت عطا فرماتا ہے گویا اسے خیر کثیر عنایت فرماتا ہے، صرف ارباب فہم ہی قرآن سے نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

یہاں یہ واضح رہے کہ حکمت ہر کسی کو نہیں حاصل ہوتی بلکہ یہ اللہ کی مشیت پر موقوف ہے، دوسری چیز یہ کہ حکمت خیر کثیر ہے۔اس کی تشریح یہ ہے کہ جنھیں حکمت عطا ہوتی ہے اُن کا حال یہ

---

(۱)الرسالۃ اللدنیہ للغزالی،ص:۱۱۴تا۱۱۶

ہوتا ہے کہ انھیں دقیق معانی ومطالب تک پہنچنے کے لیے عام انسانوں کی طرح تگ ودو اور محنت ومشقت نہیں اٹھانی پڑتی ہے، بلکہ وہ اس سے بے نیاز ہوتے ہیں، وہ تھوڑا جانتے ہیں لیکن اس سے کہیں زیادہ بیان کرتے ہیں۔

گویا ان کی زبان پر علوم ومعارف کے چشمے پھوٹتے ہیں جو نہ کسی استاذ کی درسگاہ سے سیکھے ہوتے ہیں اور نہ کتابوں کی ورق گردانی سے حاصل ہوتے ہیں۔ ان کا حال یہ ہوتا ہے۔

نگار من کہ بہ مکتب نرفت و خط ننوشت
بغمزہ مسئلہ آموز صد مدرس شد

(حافظ شیرازی قدس سرہ)

میرا محبوب جو نہ کبھی مدرسہ گیا اور نہ کبھی کچھ لکھا مگر اشارۂ ابرو سے سینکڑوں مدرس کو مسئلہ سمجھا گیا، حکمت ہو یا علم لدنی، بغیر طاعت وتقوی کے نہیں ملتا، فسق وفجور، بدعملی وبے عملی اس علم کے موانع وحجابات ہیں بلکہ جس قدر علم پر عمل ہوگا اسی قدر علم لدنی میں اضافہ ہوتا رہے گا، اس کی دلیل اس حدیث میں بھی موجود ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: **مَنْ عَمِلَ بِمَا عَلِمَ أَوْرَثَهُ اللهُ عِلْمَ مَا لَمْ يَعْلَمْ**۔ (۱) یعنی جس شخص نے اپنے علم پر عمل کیا تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے بدلے اُسے ایک ایسا علم عطا فرماتا ہے جو اُسے حاصل نہیں ہوتا۔

امام غزالی علم لدنی کے شرائط بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

(۱): تحصيل العلوم جميعها واخذ الحظ الاوفر من اكثرها۔ (۲) الرياضة الصادقة والمراقبة الصحيحة۔ (۳) التفكر: فان النفس اذا تعلمت وارتاضت بالعلم ثم تتفكر في معلوماتها بشروط التفكر ينفتح عليها باب الغيب، كالتاجر الذي يتصرف في ماله بشرط التصرف السليم ينفتح عليه ابواب الربح، واذا سلك طريق الخطا يقع في مهالك الخسران۔ فالمتفكر اذا سلك سبيل الصواب يصير من ذوي الالباب، وتنفتح روزنة من عالم الغيب في قلبه فيصير عالما كاملا عاقلا ملهما مؤيدا۔ (۲)

اول یہ کہ سارے علوم حاصل کرے اور ان میں سے اکثر علوم میں حظ بھی اٹھائے۔ دوسری چیز: صدق کے ساتھ ریاضت اور حقیقی مراقبہ ہے۔ تیسری چیز، تفکر ہے

---

(۱) حلیۃ الاولیاء ابونعیم

(۲) الرسالۃ اللدنیۃ، ص: ۱۲۲

۔یعنی حاصل شدہ علم میں غور وفکر کریں تا کہ غیبی دروازہ کھل سکے جیسے تاجر اپنے مال میں صحیح تصرف کرتا رہتا ہے تا کہ منفعت کے دروازے کھول سکے۔مگر جب غلط راستہ اختیار کرتا ہے تو خسارہ میں گرتا ہے۔غور وفکر کرنے والا جب حق وصواب کی راہ اختیار کرے گا تو عقل مندوں میں سے ہو جائے گا اور اس کے قلب میں عالم غیب کا دریچہ کھل جائے گا، پھر وہ کامل، عاقل، الہامی عالم بن جائے گا۔

احمد بن ابی حواری کہتے ہیں کہ مجھ سے عباس بن احمد نے قرآنی آیت:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا کی تفسیر میں یہ روایت بیان کی :**الّذین یعملون بمایعلموْن نهدیهم الٰی مالا یعلمون**۔ یعنی جولوگ اپنے علم کے مطابق اُس پر عمل کرتے ہیں تو ہم اُنھیں ایسا علم عطا کرتے ہیں جو اُنھیں حاصل نہیں ہوتا۔

حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اَلْعِلْمُ أَحَدُ لَذَّاتِ الدُّنْيَا فَإِذَا عَمِلَ بِهٖ صَارَ لِلْاٰخِرَةِ۔:علم دنیا کی لذتوں میں سے ایک ہے، لہٰذا جب اس پر عمل کرلیا جائے تو وہ آخرت کے لیے توشہ ہو جاتا ہے۔

حقیقت میں علم نافع وہی ہے جو آخرت میں کام آئے اور انسان کو گناہوں سے باز رکھے.

اصحابِ علم لدنی کی صفات

علم لدنی کس کے پاس ہوتا ہے اس کی بظاہر کوئی واضح علامت نہیں ہوتی، البتہ !اس کے اندر چند ظاہری صفات کا ہونا انتہائی ضروری ہے، مثلاً وہ فسق وفجور میں مشہور نہ ہو، خلاف شرع کام نہ کرتا ہو، معصیت سے بچتا ہو، دیانت دار ومتقی ہو، اعمال صالحہ میں رغبت ودلچسپی رکھتا ہو، اوامر ونواہی کا بقدر ضرورت علم رکھتا ہو، صائب الرائے ہو، سلیم الفطرت ہو۔اس کا دل ان تمام خباثتوں سے پاک وصاف ہو جو قلب کے لیے مہلک امراض ہیں، مثلاً: حسد، کینہ، بغض، نفرت، کبر وغیرہ۔ یہاں پر علامہ برہان الدین زرکشی کی بات قابل ذکر ہے، وہ فرماتے ہیں کہ علم وہبی اس شخص کو عطا نہیں ہوتا جس کے دل میں بدعت یا کبر، یا حب دنیا، یا گناہوں کی طرف رجحان ہو۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:**سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ** (اعراف:۱۴۶) میں اپنی نشانی دیکھنے والی بصیرت کو اُن لوگوں سے سلب کر لیتا ہوں جو روئے زمین پر بلاوجہ تکبر جتاتے ہیں۔

امام شافعی فرماتے ہیں:

شَكَوْتُ إِلٰى وَكِيْعٍ سُوْءَ حِفْظِي   فَأَرْشَدَنِي إِلٰى تَرْكِ الْمَعَاصِي

وَ أَخْبَرَنِي بِأَنَّ الْعِلْمَ نُوْرٌ   وَ نُوْرُ اللّٰهِ لَا يُهْدٰى لِعَاصِي

میں نے اپنے استاذ وکیع سے اپنے خراب حافظے کی شکایت کی تو اُنھوں نے مجھے معصیت ترک کر دینے کی ہدایت کی اور یہ بتایا کہ علم نور ہے اور نورِ الٰہی نافرمانوں کو عطا نہیں ہوتا۔(۱)

مذکورہ بالا مباحث کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ علم لدنی کے بارے میں یہ کلام نہیں کیا جائے گا کہ یہ علم ہے یا نہیں؟ ہے تو کیسا ہے؟ کیوں کہ اس کا ثبوت واضح نصوص سے ہے، ائمہ محدثین ومفسرین اور سادات صوفیہ کے اقوال ومکاشفات اس پر شاہد ہیں۔اسی طرح صوفیہ کے وہ اقوال جو الہام پر مبنی ہوتے ہیں مثلاً وہ کہے کہ مجھ سے میرے رب نے فرمایا، جیسا کہ محبوب سبحانی شیخ عبد القادر جیلانی قدس سرہ کے ارشادات زیادہ تر اسی قسم کے ہیں۔اسی طرح مشائخ کے وہ واقعات جن میں اس جانب اشارات ہوں وہ بھی علم لدنی کے زمرے میں ہیں، جیسا کہ شیخ ابو سعید ابوالخیر قدس سرہ نے ایک واقعہ بیان فرمایا ہے:

> ابوبکر کتانی ایک عظیم بزرگ تھے علم ومعرفت اور ریاضت ومجاہدہ میں اپنے زمانے میں لاثانی تھے۔ان کے بڑے مجاہدوں میں ایک مجاہدہ یہ بھی تھا کہ مکہ میں ایک گنبد کے اندر تیس سال مقیم رہے، رات دن میں ایک ہی بار وضو فرماتے ،ایک دن باب بنی شیبہ سے ایک پر وقار بزرگ ان کے پاس آئے اور سلام کرتے ہوئے فرمایا کہ اے ابوبکر! تم مقام ابراہیم پر کیوں نہیں چلے جاتے کیونکہ لوگ وہاں حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سننے کے لیے آتے ہیں ایک عظیم محدث آئے ہوئے ہیں جن کا درس ہوتا ہے تم بھی اس بابرکت مجلس میں شریک ہو جاتے ، یہ سن کر شیخ ابوبکر کتانی نے سر اٹھاتے ہوئے پوچھا کہ وہ محدث کس سند سے حدیث روایت کرتے ہیں؟ بزرگ نے جواب دیا: **عن عبد الرزاق الصنعانی عن الزھری عن ابی ھریرہ**۔شیخ کتانی نے فرمایا کہ بہت طویل سند ہے، جو کچھ وہ اسناد کے ساتھ بیان کرتے ہیں میں یہاں بلا اسناد اسے سنتا ہوں۔بزرگ نے پوچھا کہ کس سے؟ تو شیخ کتانی نے جواب دیا: **حدثنی قلبی عن ربی**۔بزرگ نے کہا کہ اس بات کے برحق ہونے پر کیا دلیل ہے؟ انہوں نے جواب دیا: دلیل یہ ہے کہ آپ خضر ہیں۔اس کے بعد حضرت خضر فرماتے ہیں: ابھی تک میں سمجھ رہا تھا کہ روئے زمین پر کوئی ایسا ولی نہیں جسے میں نہیں جانتا مگر جب شیخ ابوبکر کتانی سے ملا تو یہ معلوم ہوا کہ وہ مجھے پہچان گئے مگر میں انہیں نہیں پہچان سکا۔(۲)

---

(۱) الاتقان، جلد:۲، ص:۲۶۱

(۲) اسرار التوحید، ص:۳۶۳۔۲۶۲

اسی طرح بعض اوقات صوفیہ کسی اہم بات کو بیان کرتے ہیں تو ان سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ آپ نے یہ بات کہاں سے حاصل کی تو جواب میں یہ فرمادیتے ہیں: **ذلک مما علمنی ربی** ۔ یہ سب علم لدنی والے علوم کی طرف اشارہ ہوا کرتے ہیں۔ لہذا کسی متقی مومن، عبد صالح سے اگر ایسی باتیں صادر ہوں تو حیرت وتعجب کی بات نہیں کیونکہ اللہ اس پر قادر ہے کہ اپنے برگزیدہ بندوں میں سے جسے چاہے محرم راز بنادے، اس پر اسرار ومعارف کا غیبی دروازہ کھول دے۔ البتہ! اخبار واحادیث کی روایت کے سلسلہ میں محدثین کے مقرر کردہ منہج ومعیار کے مطابق ہی اس کی صحت وضعف پر کلام ہوگا۔

وہ منور ومجلی قلوب جن میں معارف ربانیہ وتجلیات قدسیہ کا انعکاس پڑتا رہتا ہے انھیں ہی یہ شرف حاصل ہوتا ہے کہ وہ ایسے علوم کا محل بن سکیں۔ ہر بوالہوس کو اس علم کا اہل نہیں مانا جائے گا۔ اور نہ ہر کسی کو زیب دیتا ہے کہ وہ اس علم کا ادعا کرے۔ اور نہ کسی متعصب اور نادان کے لیے روا ہے کہ وہ ان نفوس قدسیہ کی بیان کردہ باتوں کو ہدف تنقید بنایے اور ان کے وجدانی وروحانی ذوق سے بے خبری کے سبب ان پر زبان طعن دراز کرے۔

○○○

ضیاء الرحمٰن علیمی

مطالعۂ تصوف کے چند رہنما اصول

صوفیائے کرام کا اس بات پر اجماع ہے کہ وہ علما جن کا اختلاف رحمت ہے وہ ایسے علما ہیں جو کتاب اللہ کو مضبوطی سے پکڑ کر اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی پیروی کی پوری کوشش میں لگے ہوئے ہیں اور اتباعِ رسول کی اس مہم میں وہ صحابۂ کرام کے نقوشِ قدم کو اپنے لیے رہنما تصور کرتے ہیں۔ ان صفات کے مصداق تین گروہ ہیں: (۱) محدثین (۲) فقہا (۳) صوفیہ۔ محدثین نے اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی احادیث جو اساسِ دین ہیں ان کی حفاظت کا کام انجام دیا، اس طرح وہ دین کے محافظ کہلائے۔ فقہا نے محدثین کا علم رکھنے کے ساتھ ان احادیث کی فہم حاصل کر کے عقائد، احکام وحدود کے استنباط کی خدمت انجام دی، اس طرح وہ دین کے حاکم وامیر ٹھہرے اور رہے صوفیہ تو وہ لفظ ومعنیٰ دونوں لحاظ سے ان دونوں گروہوں کے ساتھ ہیں۔ لہذا جو صوفی احکامِ شرع اور حدودِ دین کا علم نہ رکھتا ہو اس کے لیے ان محدثین وفقہا کی جانب رجوع ضروری ہے، لیکن صوفیہ کا امتیاز یہ ہے کہ محدثین وفقہا کے علوم کے ساتھ ان کو علمِ احوال ومقامات بھی حاصل ہے۔ جس طرح ظاہر کو محاسن سے آراستہ کرنے اور معائب سے پاک کرنے کا علم دوسروں کو حاصل ہے، اسی طرح قلب وباطن کو فضائل سے منور کرنے اور رذائل سے ستھرا بنانے کا فن صوفیہ کو حاصل ہے، اس طرح یہ صوفیہ دین کے اعوان وانصار بن کر سامنے آئے۔ (۱) اور اس فن سے کسی کو فرار نہیں جس طرح صوفیہ کو فقہ وحدیث وعقیدہ سے دوری کی گنجائش نہیں؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وذروا ظاهر الاثم وباطنه۔** ظاہری اور باطنی دونوں گناہ ترک کر دو۔ (۲)

---

(۱) آداب المریدین، شیخ ابونجیب سہروردی، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۲۰۰۵ء، ص: ۱۸ ملخصا

(۲) انعام (۱۲۰)

ماسبق کی گفتگو سے یہ بات واضح ہوگئی کہ تصوف کا مقصود اصلاح قلب اور تزکیۂ نفس ہے اوراس کا بہت بڑا ذریعہ تصوف کی کتابیں ہیں۔ ہمارے اسلاف کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو پہلے کسی کامل شیخ کے حوالے کرتے اور پھر ان کے حکم وارشاد کے مطابق تصوف کی اہم کتابوں کے مطالعے کی طرف متوجہ ہوتے، جہاں کہیں ان کوشبہہ یا خلجان ہوتا اپنے شیخ سے رجوع کرکے عقدہ کشائی کرتے اور تصوف کی جن کتابوں کا درس شیخ دیتے اس میں شریک ہوکر علم تصوف کی تحصیل کرتے لیکن بعد کے ادوار میں جب کہ طالبان مولیٰ کم یاب ہوگئے اور حقیقی مشائخ کبریت احمر، ایسے میں جن کے اندر مولیٰ تعالیٰ کی طلب پیدا ہوئی انہوں نے کتب تصوف کو ہی اپنا مرشد بنالیا، اس سے جہاں ایک طرف یہ فائدہ ہوا کہ مشائخ کے کلمات کو پڑھ کر ان کے اندر طلب مولیٰ کی آگ اور بھڑکی وہیں کسی شیخ کامل کی نگرانی کے بغیر مطالعے کا نقصان یہ ہوا کہ ان کو تصوف کی حقیقی سمجھ حاصل نہیں ہوئی، مشائخ کے کون سے نسخے کو کہاں استعمال کرنا ہے اس سے ناواقف رہے اور اس زعم میں کہ ہم تصوف کی فلاں فلاں اہم کتابیں پڑھ چکے ہیں خود اپنا علاج کرنے بیٹھ گئے اور اس کی وجہ سے صرف ہلاکت ہی حاصل ہوئی۔ یہی نہیں بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ ان میں سے بعض تصوف وصوفیہ سے بدظن ہوکر روحانی سعادتوں سے محروم ہوگئے۔ یوں ہی جولوگ پہلے ہی تصوف سے دور تھے انہوں نے بھی جب تصوف کو ائمہ تصوف کی رہنمائی کے بغیر صرف کتابوں سے سمجھنا چاہا تو وہ بھی تصوف کے حوالے سے اور زیادہ گمراہیوں کے شکار ہوگئے۔

دراصل بات یہ ہے کہ کتاب وسنت کے عمومی مواعظ واحکام سے کوئی شخص بھی بغیر کسی رہنما کے استفادہ کرسکتا ہے لیکن اگر کتاب وسنت کی تفقہ مطلوب ہے تو اسے کسی رہنما کی نگرانی حاصل کرنی ہوگی، ورنہ انسان يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا (البقرہ:۲۶)(۱) کے زمرے میں آسکتا ہے اور امام سفیان بن عیینہ کے قول: اَلْحَدِيْثُ مِضَلَّةٌ إِلَّا لِلْفُقَهَاءِ(۲) کے مطابق اسے گمراہی ہاتھ آسکتی ہے، بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی، کسی فقیہ کی نگرانی کے بغیر فقہ وفتاویٰ کی کتابیں بھی گمرہی کا ذریعہ ہوسکتی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک فقیہ جب قرآن وسنت کا مطالعہ کرتا ہے تو فقہ قرآن وسنت کے کچھ اصول وضوابط اس کے پیش نظر ہوتے ہیں، وہ مانتا ہے کہ قرآن وسنت کے نصوص عام بھی ہیں اور خاص بھی، اس میں اجمال بھی ہے اور تفصیل بھی، اس میں مواعظ وقصص بھی ہیں اور امثال وحکم وغیرہ

---

(۱) اسی قرآن سے بہت سے لوگ گمراہ ہوتے ہیں۔

(۲) حدیث فقہا کے علاوہ دوسروں کے لیے گمراہ کن بھی ہوسکتی ہے۔ ابن أبي زيد القيرواني (۳۸۶ھ)/ الجامع فی السنن والآداب...، (ص:۱۱۸)

بھی، چنانچہ وہ قرآن وسنت کے مطالعے کے وقت اصول فقہ کو مدنظر رکھتا ہے، یوں ہی جب وہ فقہ کی کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ ان کتابوں میں کچھ احکام راجح ہیں تو کچھ مرجوح، کچھ ظاہر الروایہ تو کچھ نادر الروایہ، کچھ مفتیٰ بہ تو کچھ اس کے برعکس، جن کتب فقہ میں یہ مسائل درج ہوتے ہیں وہ ان کتابوں اور ان کے مؤلفین کے درجات کو جانتا ہے اور اس طرح کے بہت سے اصول اس کے سامنے ہوتے ہیں جن کی روشنی میں وہ اپنا مقصود حاصل کرتا ہے، چنانچہ جب قرآن و سنت اور کتب فقہ وفتاویٰ کے مطالعے کے ضروری اصول سے ناواقف عام انسان خود سے بغیر کسی رہنما کے استفادہ کرنا چاہتا ہے تو وہ گمراہیوں کے دلدل میں پھنس جاتا ہے۔

ویسے بھی یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ناقصوں کے لیے کتابیں خواہ وہ کسی بھی فن کی ہوں استاذ کی نگرانی میں اور رہنما کی رہنمائی میں ہی نفع بخش ہوتی ہیں۔اسی لیے مدارس قائم کیے جاتے ہیں تاکہ اساتذہ سے قرآن وسنت اور فقہ وافتا کے درس لیے جائیں، یونیورسٹیاں، کالج اور اسکول بنائے جاتے ہیں تاکہ ماہر اساتذہ کی شاگردی اختیار کر کے عصری علوم کی تحصیل کی جائے۔اور کوئی بھی یہ تسلیم نہیں کرتا کہ ایک عام انسان قرآن کریم اور کتب حدیث وفقہ کے ذخائر کو لفظی طور پر پڑھ لینے سے عالم قرآن وسنت اور فقیہ ہو جائے گا یا عصری علوم کی کتابیں اگر طالب علم گھر بیٹھے بغیر کسی رہنما کے پڑھتا رہے تو وہ عصری علوم کا عالم اور ڈاکٹر، انجینیر وغیرہ بن جائے گا۔لیکن یہ زمانے کی ستم ظریفی ہی کہی جائے گی کہ دور متاخر میں عالم تصوف بننے کے لیے تصوف کی کتابوں کو ہی کافی سمجھ لیا گیا اور مشائخ وصوفیہ کی رہنمائی اور ان کی صحبت کو درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا جس کی وجہ سے حامیان تصوف بھی دین وشریعت سے دور اور جادۂ مستقیم سے منحرف ہوئے اور منکرین تصوف نے تو اپنی کج فہمیوں اور بدگمانیوں کی بنا پر اسے دین و مذہب سے خارج ہی قرار دے دیا، اسی حقیقت کی جانب متنبہ کرتے ہوئے شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی کے پیر و مرشد شیخ ابوالنجیب ضیاء الدین سہروردی (۵۶۳ھ) آداب المریدین میں فرماتے ہیں:

> **ثم إن كل من أشكل عليه شيء من العلوم الثلاثة فعليه أن يرجع فيه إلى أئمتها، فمن أشكل عليه شيء من علوم الحديث و معرفة الرجال يرجع فيه إلى أئمة الحديث لا إلى الفقهاء و من أشكل عليه شيء من دقائق الفقه يرجع إلى أئمة الفقهاء، و من أشكل عليه شيء من علوم الأحوال و الرياضات و دقائق الورع و مقامات المتوكلين يرجع فيه إلى أئمة الصوفية لا إلى غيرهم، فمن فعل غير ذلك فقد أخطأ الطريق و سلك المضيق.**

اگر کسی شخص کو مذکورہ بالا تینوں علوم (حدیث، فقہ اور تصوف) کے کسی مسئلے میں کوئی

اشکال در پیش ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ ان علوم کے ائمہ کی جانب رجوع کرے، چنانچہ اگر کوئی علوم حدیث اور رجال حدیث کی معرفت سے متعلق کسی مسئلے میں الجھ جائے تو اس کو ائمہ حدیث کی طرف رجوع کرنا چاہیے فقہا کی طرف نہیں، جو شخص کسی فقہی باریکی میں پھنس جائے تو اس کو فقہا کی بارگاہ سے تعلق قائم کرنا چاہیے اور جس پر علوم احوال، علوم ریاضت، ورع کی باریکیاں اور متوکلین کے مقامات سے متعلق کوئی مسئلہ حل نہ ہو تو اس کو ائمہ صوفیہ کے در پر دستک دینی چاہیے کسی اور کے در پر نہیں، جو دوسری راہ اختیار کرے گا وہ بھٹک جائے گا اور اپنے آپ کو تنگی ودشواری کی راہ پر ڈال دے گا۔(۱)

حقیقت یہ ہے کہ دوسرے فنون کی طرح تصوف بھی ایک فن ہے اور دیگر کتب کی طرح کتب تصوف میں بھی عموم وخصوص، اجمال وتفصیل، ابہام وتوضیح، مطلق ومقید، قصص ومواعظ، حکم و امثال، محکمات، متشابہات، شطحات اور غلبۂ حال کے اقوال وافعال ہیں، اسی طرح احکام تصوف کے درجات ہیں، اس کے بعض احکام ظاہر النص سے حاصل کیے گئے ہیں تو بعض عبارت النص، اشارت النص، دلالۃ النص اور اقتضاء النص سے۔ اور ان سب کے جداگانہ احکام اور اثرات ہیں اور بعض وہ اسرار ورموز بھی ہیں جن کو شیخ کامل کی بارگاہ میں زانوئے ادب تہہ کیے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا؛ کیوں کہ تصوف فقہ باطن اور حقیقت شریعت کا نام ہے اور کتب تصوف دین کے باطنی مسائل کا مجموعہ، جب دین کے ظاہری مسائل کے استخراج کے لیے اصول مرتب کیے گئے ہیں تو دین کے باطنی مسائل کے استخراج کے لیے اصول کیوں کر نہیں ہوں گے اس لیے ظاہری مسائل کے استخراج کے بہ نسبت باطنی مسائل کا استنباط زیادہ مشکل ہے۔ یوں ہی فقہائے باطن یعنی صوفیہ کے بھی درجات ہوں گے اور ان کے درجات کے لحاظ سے ہی ان کی کتابوں کو استنادی حیثیت حاصل ہوگی۔

فقہ ظاہر کے ساتھ یہ خوش قسمتی رہی کہ اصول فقہ کے نام سے اس کے ثابت شدہ اصول مدون ہو گئے، جن کی روشنی میں کتب فقہ سے استفادہ آسان ہو گیا جب کہ فقہ باطن کے ساتھ معاملہ یہ رہا کہ فقہائے باطن اپنے اصول کی روشنی میں تزکیہ نفس اور اصلاح وارشاد میں لگے رہے اور خود کو عمل (Practice) سے زیادہ جوڑ کر رکھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اصول کو کسی ایک جگہ جمع نہیں کیا گیا، یہ الگ بات ہے کہ وہ اصول متفرق طور پر کتب تصوف میں موجود ہیں۔ دراصل فقہائے باطن نے چوں کہ اس بات کو مان لیا ہے کہ تصوف کو صرف کتابوں سے حاصل نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اس

---

(۱) آداب المریدین، فصل: الکلام علی فروع الدین واحکامہ (ص:۱۹)

علم کے اصول سے بھی اسی وقت استفادہ ممکن ہے، جب یہ کسی صوفی محقق کی صحبت میں رہ کر ہو، ان ہی وجوہات کے سبب صوفیہ نے اصول تصوف کو جمع کرنے کی چنداں ضرورت محسوس نہیں کی لیکن اب چوں کہ شیخ کامل بھی کم یاب ہو گئے اور طالبان مولی بھی عنقا اور ایسے میں علم تصوف کی معرفت کا ذریعہ تقریباً صرف کتابیں رہ گئیں، اس لیے اس اعتراف کے ساتھ کہ نظری اور عملی دونوں طرح کے تصوف کے لیے شیخ کامل کی صحبت ناگزیر ہے، ہر زمانے سے زیادہ اب اس کی ضرورت ہے کہ مشائخ صوفیہ کی کتابوں سے ان بکھرے ہوئے اصولوں کو جمع کر دیا جائے تا کہ مطالعۂ تصوف کرنے والے نظری طور پر خطا سے محفوظ رہیں اور ان کے لیے تصوف کی نظری تفہیم آسان ہو۔

اسی ضرورت کی صراحت کرتے ہوئے صاحبِ آداب المریدین فرماتے ہیں:

ولا یصح لاحد ان یسلک طریق الصوفیة حتی یعلم عقائدھم وأدابھم فی ظاھرھم وباطنھم واصطلاحاتھم فی کلماتھم، ویفھم اطلاقاتھم فی محاوراتھم حتی یصح له أن یحذو حذوھم ویقفو اثرھم فی افعالھم واقوالھم فانه من کثرة المدعیین، جھل حال المحققین وفساد المفسدین الفاسدین الیھم یعود ولا یقدح فی صلاح الصالحین۔(۱)

صوفیہ کی راہ کے سالک کے لیے ان کے عقائد، ظاہری و باطنی آداب، اصطلاحات اور ان کی گفتگو کے اطلاقات کا علم حاصل کرنا ضروری ہے، تا کہ وہ افعال و اقوال میں ان کے نقشِ قدم پر چل سکے، ان علوم کی تحصیل کے بغیر صوفیہ کی راہ پر چلنا درست نہیں ہے؛ کیوں کہ مدعیانِ تصوف کی کثرت کی وجہ سے محققینِ تصوف کا حال پردۂ خفا میں چلا گیا ہے، لیکن ان مفسد و فاسد لوگوں کے فساد کا نقصان خود ان کو ہی ہوگا، اس سے صالحین کے صلاح و تقویٰ پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

عارف ربانی داعی اسلام حضرت شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی عصر حاضر کے ان صوفیہ میں ہیں جو بحر معرفت کے شناور، رموز تصوف سے آشنا، اسرار طریقت کا گنجینہ اور مقام تحقیق پر فائز ہیں، چنانچہ جب میرا بخت خفتہ بیدار ہوا، رحمت الٰہی متوجہ ہوئی اور عنایت ربانی نے ان کی خدمت میں پہنچا دیا اور ان کی صحبت میسر آئی تو گزرتے ایام کے ساتھ علم تصوف واضح ہوتا گیا اور تصوف پر یقین بڑھتا گیا، ان کی مبارک صحبت میں عملی تصوف کے ساتھ ساتھ علم تصوف پر نظری طور پر اتنی باتیں ہوئیں، ایسے ایسے پہلوؤں پر آپ نے روشنی ڈالی اور ایسے رہنما اصول بیان

---

(۱) صفحہ: ۷

فرمائے کہ تصوف کے حوالے سے سارے شکوک وشبہات دور ہو گئے اور مخالفین تصوف کی باتیں کج فہمی، بدگمانی یا تعصب پر مبنی معلوم ہونے لگیں۔

درج ذیل سطور میں انہیں کی صحبت بابرکت سے حاصل شدہ بعض ان اصول وقواعد کو بیان کیا جاتا ہے جو کتب محققین سے مستفاد ہیں اور جن کو پیش نظر رکھ کر اگر تصوف کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے تو کافی حد تک فکری کجی اور غلط فہمی سے اپنے آپ کو بچایا جا سکتا ہے۔

۱۔صوفی کے درجے کا تعین

عوام الناس کے نزدیک صوفی ہر اس شخص کو کہا جاتا ہے جو صوفیوں جیسا بھیس بنائے ہو یا جو حقیقی صوفیہ کے در پر بیٹھا ہو، خواہ وہ حقیقت میں صوفی ہو یا صوفیہ کے نام پر کمانے کھانے والا ہو۔اس لیے علمی اور فنی طور پر ضروری ہے کہ جب بھی تصوف کے نام پر کسی کتاب کا مطالعہ کیا جائے یا کسی صوفی کے نام سے منسوب کوئی قول وفعل سامنے آئے تو پہلے اس بات کا یقین حاصل کرلیا جائے کہ وہ تصنیف کس درجے کے صوفی کی ہے اور اس شخص پر لفظ صوفی نام کا اطلاق حقیقی ہے یا رسمی اور اسمی۔ کیوں کہ محققین نے طالبان مولیٰ کی درجہ بندی کی ہے اور تصوف سے انتساب رکھنے والوں کی تین قسمیں بیان کی ہیں:

(۱) صوفی (۲) متصوف (۳) مستصوف

داتا گنج بخش شیخ علی ہجویری قدس سرہ (۴۶۵ھ) فرماتے ہیں:

> صوفی مرد حق آگاہ کا نام ہے جو واصل ہوتا ہے اور متصوف وہ ہے جو صوفیہ کے اصول وطریق پر چل کر حقیقی صوفی بننے کی کوشش میں لگا ہو، جب کہ مستصوف وہ ہے جو فضولیات میں مشغول، مکار و دغاباز اور صوفیہ کے نام پر کھانے کمانے والا ہو۔(۱)

اسی تقسیم کو وسعت دیتے ہوئے درج ذیل تقسیم کی جا سکتی ہے:

الف۔واصلین کی جماعت

صوفی: یہ وہ گروہ ہے جو خود بھی واصل ہے اور دوسروں کو بھی مقام قرب سے آشنا کرانے کی صلاحیت رکھتا ہے، گویا وہ کامل بھی ہے اور مکمِّل بھی۔ وہ طالبان مولیٰ کا مرشد وہادی ہے، وہ خوف و ہلاکت کے مقامات سے آشنا، قربِ الٰہی کی راہ کا عارف اور مریدین وطالبین کے مزاج واحوال کا ادراک رکھنے والا اور پھر ان کے احوال کے مطابق ان کے لیے نسخے تجویز کرنے والا ہے۔ گویا وہ انبیا کا وارث اور **وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ**(۲) کا مظہر ہوتا ہے۔

---

(۱) کشف المحجوب، باب سوم، فصل اول (ص:۶۱)

(۲) بے شک آپ صراط مستقیم کی ہدایت دیتے ہیں۔(شوریٰ:۵۲)

پھراس کی بھی دو قسمیں ہیں۔(۱) سالک مجذوب، یہ وہ صوفی ہے جس نے پہلے مجاہدہ و ریاضت کی ہو پھر قرب و مشاہدۂ ربانی کی نعمتوں سے بہرہ ور ہوا ہو۔(۲) مجذوب سالک، یہ وہ صوفی ہے جس کو پہلے انوار یقین اور مشاہدے کی دولت حاصل ہوئی اور پھر اس کا ظاہر بھی مجاہدے سے بغیر کسی دقت کے آراستہ ہو گیا ہو اور یہ صوفی کا اعلیٰ درجہ ہے۔

قلندر: یہ حضرات بھی واصل و موصل دونوں ہوتے ہیں لیکن سلوک میں کسی خاص روش کے پابند نہیں ہوتے۔

ملامتی: یہ بھی واصلین کی جماعت ہے لیکن ان میں ہمیشہ ایک طرح کا جذب رہتا ہے، اسی لیے یہ ملامت کا لبادہ اوڑھے رہتے ہیں۔ان میں بھی ایک جماعت، دوسروں کے لیے مرشد و رہنما ہوتی ہے اگر چہ ان کی تعداد بہت کم ہے۔ اس گروہ کا تعارف کراتے ہوئے شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہٗ ارشاد فرماتے ہیں:

بعض صوفیہ کا ارشاد ہے: **الملامتي هو الذي لا يظهر خيراً و لا يضمر شراً۔** ملامتی وہ ہے جو خیر کو ظاہر نہ کرے اور شر چھپائے نہ رکھے، اس کی توضیح یہ ہے کہ چوں کہ ملامتی کا رگ و پے اخلاص سے سرشار ہوتا ہے اور وہ سراپا صدق بن جاتا ہے، اس لیے وہ یہ پسند نہیں کرتا کہ کسی کو اس کے احوال و اعمال کی خبر ہو۔(۱)

مجذوب محض: بندگان الٰہی کی یہ وہ جماعت ہے جو سلوک سے بالکل بری ہے، اسی لیے انھیں **عتقاء اللہ** (اللہ کے آزاد کردہ غلام) کہا جاتا ہے، ان کے قلوب سے اللہ تعالیٰ تمام حجابات کو اٹھا دیتا ہے اور ان پر انوار و تجلیات کی بارش فرماتا رہتا ہے۔ اس گروہ کو علامہ ابن جوزی جیسے ناقدین صوفیہ نے **المَجَانِيْنُ الْعُقَلَاء**(۲) (عقلمند مجنون) کہا ہے۔

یہ بھی خود تو واصل ہیں لیکن چوں کہ انھوں نے قرب الٰہی کا یہ سفر ہوش و حواس اور بیداری کے عالم میں طے نہیں کیا، اور نہ ہی قرب کی لذت پانے کے بعد سلوک کی راہ اختیار کی، مجاہدے کی سختیاں جھیلیں، راہ کی دشواریوں اور باریکیوں سے آشنائی حاصل کی۔ اس لیے یہ دوسروں کو اللہ تک نہیں پہنچا سکتے۔ان کے اور ملامتیوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ اگر چہ ملامتیوں کو بھی جذب سے حصہ ملا ہے لیکن ان کا جذب دائمی نہیں ہے بلکہ کسی قدر ہوش و حواس میں ہوتے ہیں۔ ملامتیوں کے یہاں قصد و اختیار باقی ہوتا ہے جب کہ مجذوبوں کے یہاں نہیں۔تجلیات ربانی کو

---

(۱) عوارف المعارف، باب ۸۔فرقہ ملامتیہ اور ان کے احوال (ص:۱۴۵)

(۲) صفۃ الصفوۃ، مقدمۃ (۱/ ۱۴)

دیکھ کر مجذوب محض کی ایسی حالت ہوئی کہ ان کے ہوش وحواس ہی ختم ہو گئے اور عقل جاتی رہی۔

ب۔طالبین وصال کی جماعت:

طالب وسالک: یہ صاحب مجاہدہ حضرات کی جماعت ہے، جو پورے جوش وخروش کے ساتھ اصول تصوف کے مطابق خود کو شمائل صوفیہ سے آراستہ کرنے کی کوشش میں لگے ہیں۔ یہ لوگ ابھی کامل نہیں لیکن مکمل ارادت اور طلب کے ساتھ کمال کی راہ پر گامزن ہیں، یہ سالکین وسائرین کی جماعت ہے۔ یہ لوگ مقام **قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى** (۱) کے حصول میں کوشاں اور **وَّ اتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ** (۲) کے حکم پر عامل ہیں۔

جب یہی لوگ ریاضات ومجاہدات سے گزر کر آداب سے آراستہ ہوجاتے ہیں اور صاحبانِ صدق وصفا کی صحبت میں رہ کر کندن ہوجاتے ہیں تو اربابِ صدق وصفا ان کو خلافت سے نوازتے ہیں اور پھر یہ لوگوں کے درمیان اجازت یافتہ داعی بن کر آتے ہیں اور خلقِ خدا کی ارشاد و تربیت کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں تصوف وطریقت کے نام پر خلفا کی بڑی کثرت ہوگئی ہے، جب کہ ہمارے مشائخ اس سلسلے میں بڑے محتاط تھے اور جن کے اندر اس منصب عظیم کو سنبھالنے کی لیاقت پاتے ان کو ہی اس نعمت سے سرفراز کرتے تھے اور اسی وجہ سے مشائخِ عظام نے خلافت کے لیے درج ذیل شرطیں رکھی ہیں: (۱) مسلمان ہو، کافر وفاسق نہ ہو (۲) عاقل ہو، مجنون ومجذوب محض اور مغلوب نہ ہو (۳) بالغ ہو، نابالغ بچہ نہ ہو (۴) قادر ہو، عاجز نہ ہو، کسی کے جبر کی وجہ سے یا کسی اور سبب سے اپنے مشن سے دست بردار ہونے والا نہ ہو (۵) عالم ہو اور ہر وقت طلبِ علم کے جذبے سے سرشار ہو (۶) صالح ہو، فاسق نہ ہو، ہر عمل اللہ کے لیے اور اس کی شریعت کے مطابق انجام دینے والا ہو، متواضع ہو، متکبر نہ ہو (۷) زاہد ہو، یعنی دنیا کی حرص وہوس سے پاک ہو، تاکہ بے غرض ہوکر اپنی ذمے داری انجام دے سکے (۸) متقی ہو، نعمتِ خلافت ملنے کے باوجود ہمیشہ اپنے حق میں خوف کھانے والا ہو۔

خلافت کی ان شرطوں کو پیشِ نظر رکھنے کا فائدہ یہ ہوگا کہ تصوف میں خلفا کے حوالے سے ہمارا نظریہ واضح ہوگا اور نااہل خلفا کو دیکھ کر ہم تصوف وصوفیہ پر اعتراض کرنے سے بچ سکیں گے۔

متشبہ صوفیہ: یہ وہ گروہ ہے جو صوفیہ کے عقائد پر ہوتا ہے مگر ان کے جیسا ریاضت ومجاہدہ نہیں کرتا لیکن اسے صوفیہ کے ساتھ محبت وارادت ہے، گویا یہ گروہ اللہ کے رسول ﷺ کے

---

(۱) یقیناً وہ لوگ کامیاب ہیں جنہوں نے تزکیہ حاصل کیا۔ (اعلی: ۱۴)

(۲) ان کے راستے کی پیروی کرو جو میری طرف مائل ہیں۔ (لقمان: ۱۵)

فرمان مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ (۱) کی بشارت کا مصداق ہے۔

متصوف (طالب) اور متشبہ کے مابین فرق یہ ہے کہ حضرات صوفیہ کے طریقے کا آغاز ایمان سے ہوتا ہے پھر علم کا درجہ ہے اور آخر میں وجدان وذوق کا۔ چنانچہ متشبہ وہی صاحبِ ایمان ہے جو صوفیہ کے طریقے کے مطابق ایمان لایا ہے، جب کہ متصوف وہ صاحبِ ایمان ہے جس نے صوفیہ کے طریقے کے مطابق علم بھی حاصل کرلیا ہے جس کی وجہ سے اس کی معلومات اور صلاحیت میں اضافہ ہوگیا ہے، البتہ متصوف اور متشبہ دونوں کو صوفی کے حال سے کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ملا ہے۔

محب صوفیہ: یہ لوگ گروہ صوفیہ سے محبت رکھتے ہیں، صوفیہ پر اپنا سب کچھ نثار کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں لیکن مجاہدہ و ریاضت کے ذریعہ صوفی بننے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ یہ لوگ الْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ (۲) کے زمرے میں ضرور شامل ہیں۔ محبینِ صوفیہ بھی اپنی محبت کے واسطے سے کبھی تو ظاہری طور پر اور کبھی روحانی طور پر صوفیہ کے ہم نشین ہوتے ہیں اور اس طرح وہ هُمُ الْقَوْمُ لَا يَشْقَى بِهِمْ جَلِيسُهُمْ (۳) کی بشارتوں کے بھی مصداق ہوتے ہیں، محبت بے نتیجہ نہیں ہوتی، وہ بالآخر اپنا رنگ ضرور دکھاتی ہے۔

اس گروہ میں دو طرح کے لوگ ہیں ایک تو عوام الناس جو صوفیہ سے محبت رکھتے ہیں اور ان کے مشن کے لیے دامے، درمے، قدمے، سخنے کوشاں رہتے ہیں۔ اور دوسرے وہ علما ہیں جو خود تو صوفیانہ اخلاق واحوال سے آراستہ نہیں ہیں اور نہ ہی آراستگی کا کوئی ارادہ رکھتے ہیں لیکن علمی طور پر ہمیشہ ان کی وکالت اور ان کے دفاع میں ہمہ تن لگے رہتے ہیں، یہ لوگ گروہ صوفیہ کے صف شکن مجاہدین کا درجہ رکھتے ہیں۔

خادم صوفیہ: یہ وہ گروہ ہے جو نہ صوفیہ کے احوالِ عالیہ سے آراستہ ہے اور نہ اس کے حصول کی راہ پر ہے، لیکن اس کو صوفیہ سے محبت ہے اور ان کی خدمت میں لگا ہے۔ وہ صوفیہ کی خدمت میں صرف اس لیے لگا ہے کہ ان صوفیہ کو آرام پہنچائے اور ان کو تمام افکارِ دنیوی سے آزاد کردے تاکہ وہ اپنے آپ کو اللہ تعالی کے لیے خالص کرسکیں۔ یہ لوگ لِلْعَبْدِ الْمَمْلُوكِ الْمُصْلِحِ أَجْرَانِ (۴)

---

(۱) جو شخص کسی جماعت سے مشابہت رکھا وہ انہی میں سے ہے۔ سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب فی لبس الشہرۃ (۴/ ۴۴، ح: ۴۰۳۱)

(۲) صحیح البخاري، کتاب الادب، باب علامة حب اللہ عزوجل (۸/ ۳۹، ح: ۶۱۶۸)

(۳) صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب فضل مجالس الذکر (۴/ ۲۰۶۹، ح: ۲۶۸۹)

(۴) خیر خواہ غلام کے لیے دو اجر ہے۔ صحیح البخاري، کتاب العتق، باب العبد اذا احسن عبادۃ ربہ ونصح سیدہ (۳/ ۱۴۹، ح: ۲۵۴۸)

کے تحت ثواب پائیں گے۔ اس پر اللہ کے رسول ﷺ کی وہ حدیث دلیل ہے جو حضرتِ انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ انھوں نے فرمایا: ایک سفر میں ہم اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ تھے، ہم میں سے کچھ لوگ روزہ دار تھے اور کچھ بے روزہ، سخت گرمی کا دن تھا، ہم نے ایک جگہ پڑاؤ کیا، تو ہم میں سے بعض لوگ اپنے ہاتھوں سے سورج کی تپش سے بچ رہے تھے اور جن کے پاس چادریں تھیں انھوں نے چادروں سے سایہ کر لیا تھا اور اس سائے میں بیٹھ گئے تھے۔ جو لوگ روزہ دار تھے وہ سائے میں سو گئے، لیکن جو بے روزہ تھے انھوں نے خیمے گاڑے، سواریوں کو پانی پلایا۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا: آج بے روزہ والے ثواب میں سبقت کر گئے۔ (۱)

ج۔ مکار اور فریبیوں کا گروہ

انھیں ہی مستصوف کہا جاتا ہے۔ ان میں دو طرح کے لوگ شامل ہیں:

مکار جاہل: یہ علم و عمل سے کورے، جاہلوں کی جماعت ہے، جنھیں علوم و احوال صوفیہ سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا، نہ ہی ان کے پاس صوفیہ کے منہج کا توارث ہے، نہ ان کے اخلاق کی نشانی، نہ تو وہ صوفیہ سے کسی بھی درجے کا تشبہ رکھتے ہیں، نہ ہی ان سے سچی محبت جو ان کے لیے مدار نجات بن جائے، نہ وہ خدام صوفیہ میں ہیں اور نہ وہ ان لوگوں کی جماعت میں ہیں جو خدام صوفیہ کی مشابہت اختیار کرتے ہوئے بہ تکلف ہی سہی صوفیہ کی خدمت کرنے والے ہیں۔ صرف حصول دنیا کے لیے صوفیہ کا راگ الاپتے ہیں، ان کے نعرے بلند کرتے ہیں لیکن ان کے پاس صوفیہ کی دولت کے نام پر صرف چند رسوم و رواج ہوتے ہیں جن کے ذریعے وہ لوگوں کو اپنے دامِ تزویر میں پھنساتے ہیں۔

اس گروہ کے بعض لوگ پیری مریدی بھی کرتے ہیں خلافتیں بھی بانٹتے ہیں اور بعض وہ ہیں جو تصوف کی صرف چند رسومات ہی کو غلو کی حد تک مضبوطی کے ساتھ پکڑے ہوئے ہیں تاکہ ان کے ذریعہ وہ اپنی دنیا بنا سکیں اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کر سکیں، ایسے لوگ صوفیہ کے نام پر تجارت کرنے والے اور دین کے رہزن ہیں۔

علمائے سو: یہ گروہ علم ظاہر تو رکھتا ہے مگر عمل سے خالی ہوتا ہے یا عمل تو کرتا ہے لیکن تزکیہ باطن نہ ہونے کی وجہ سے حقیقت میں ان کو صوفیہ سے وراثت میں ان کے عقائد و معمولات اور علوم و احوال ہاتھ نہیں لگے ہیں۔ انھوں نے ذوق ایمانی سے دوری اور مقام احسان سے ناآشنائی کی بنیاد پر فقہ کے چند ظاہری احکام و مسائل کو ہی اصل تصوف سمجھ رکھا ہے اور اکابر صوفیہ کے نام کو صرف حصول دنیا کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ ان کے یہاں پیری مریدی کا بازار خاص طور سے بہت

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب اجر المفطر فی السفر اذا تولی العمل (۲/ ۷۸۸، ح:۱۱۱۹)

گرم رہتا ہے۔ خلافتیں خوب تقسیم کی جاتی ہیں۔ یہ بھی مستصوفین کا ایک گروہ ہے جنہوں نے صوفیہ کی اعلی روش کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ یہ لوگ اپنے اکابر کو چھوڑ کر دوسرے اکابر پر اعتراض کرنے میں جلد بازی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور تصوف واحسان پر اپنی اجارہ داری کے مدعی ہیں۔

۲۔طبقات صوفیہ کا تعین

جس طرح فقہائے ظاہر کے طبقات ہیں اسی طرح فقہائے باطن کے بھی طبقات ہیں۔بعض تو ایسے صوفیہ ہوتے ہیں جو عین شریعت تک واصل ہوتے ہیں اور وہیں سے بلا واسطہ احکام حاصل کرتے ہیں جہاں سے مجتہدین مطلق حاصل کرتے ہیں۔ امام عبد الوہاب شعرانی میزان الشریعہ الکبریٰ میں نقل فرماتے ہیں:

> حمد اللہ کے لیے ہے جس نے شریعت مطہرہ کو ایسا سمندر بنایا ہے کہ علوم نافع کی تمام ندیاں اور وادیاں اسی سے نکلتی ہیں۔ پھر اس سے دلوں کی زمین پر نہریں نکالیں اور ان سے قریب اور براہ تقلید دور کے علما کو سیراب کیا، اپنے خاص بندوں میں سے جسے چاہا اسے چشمۂ شریعت پر مطلع فرما دیا، مختلف بلاد وامصار میں پھیلے احادیث وآثار سے آگاہ کیا اور کشف کے توسط سے شریعت کے چشمۂ اول سے آشنا کیا جس سے مختلف ادوار واحوال میں ہر طرح کے اقوال متفرع ہوتے ہیں۔ یہ خاص بندے شریعت عظمی کے چشمۂ اول سے براہ راست سیرابی کے معاملے میں مجتہدین امت کے شریک ہوتے ہیں، اگرچہ ان کی نظر ان مجتہدین کے بہ نسبت محدود ہوتی ہے اور زمانی اعتبار سے یہ موخر ہوتے ہیں۔(۱)

جب کہ بعض دوسرے صوفیہ اس درجے کے نہیں ہوتے۔ طبقاتی طور پر فقہائے باطن یعنی صوفیہ کو بھی اسی طرز پر تقسیم کیا جا سکتا ہے جس طرز پر فقہائے ظاہر کو تقسیم کیا گیا ہے مثلاً (۱) مجتہد شریعت (۲) مجتہد طریقت (۳) مجتہد مسائل طریقت (۴) اصحاب ترجیح (۵) اصحاب تخریج (۶) اصحاب تمیز (۷) مقلدین۔

صوفیہ میں جو لوگ مجتہدین شرع کے درجے پر ہوتے ہیں وہ بھی بعض مصالح شریعت کی بنا پر اپنے آپ کو فقہائے مجتہدین فی الشرع کی جانب منسوب کرتے ہیں اور حنفی، شافعی، مالکی یا حنبلی کہلاتے ہیں لیکن جو اس درجے پر نہیں ہوتے بلکہ بعد کے درجات میں سے کسی درجے پر فائز ہوتے ہیں وہ من وجہ مقلد اور من وجہ مجتہد ہوتے ہیں جیسا کہ اوپر کی تقسیم سے ظاہر ہے،

---

(۱) میزان الشریعۃ (ص:۵)

یہیں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ صوفی جو بھی ہوگا وہ اگر مقلد ہوگا تو مقلد محض اور ناقل غیر عاقل نہیں ہوگا بلکہ کم سے کم صاحبِ بصیرت اور عاقل ضرور ہوگا، جو مقلد محض ہوگا وہ صوفی نہیں بلکہ متصوف ہوگا۔

یوں ہی یہ بات بھی واضح رہے کہ کسی بھی زمانے میں مذکورہ بالا طبقات میں سے کسی بھی طبقے کے صوفی پائے جاسکتے ہیں۔ کیوں کہ رحمت الٰہی کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **وَ فَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ**(یوسف:٧٦) (ہر علم والے سے اوپر ایک علم والا ہے)، اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان قیامت تک کے لیے ہے اور یہ سلسلہ قیامت تک چلتا رہے گا کہ ہر علم والے سے بڑھ کر علم والے آتے رہیں گے۔ یوں ہی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا** (بقرہ:١٠٦) ہم جب بھی کوئی آیت اور نشانی منسوخ کرتے ہیں تو اس سے بہتر یا اسی جیسی نشانی لاتے ہیں۔) اور اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے: **مَثَلُ أُمَّتِي مَثَلُ الْمَطَرِ لَا يُدْرٰى أَوَّلُهُ خَيْرٌ أَمْ آخِرُهُ** (١) میری امت کی مثال بارش کے قطرے کی سی ہے، کسے پتا کہ اس کا اول بہتر ہے یا آخر۔

کون کس طبقے کا صوفی ہے اس کا تعین بھی خود اجتہادی مسئلہ ہے اور اس میں اختلاف بھی ہوسکتا ہے جس طرح کہ فقہاے ظاہر کے طبقات کے تعین میں اختلاف ہوا ہے اور ہوتا رہے گا ۔البتہ صوفیہ کی اس طبقاتی تقسیم کا فائدہ یہ ہوگا کہ ہمیں ان کی کتابوں کا استنادی مقام ومرتبہ متعین کرنے اور ان کے اقوال وافعال پر حکم لگانے میں آسانی ہوگی۔

٣۔اخبارِ صوفیہ کے درجات کی معرفت

اخبارِ صوفیہ سے یہاں ہماری مراد یہ ہے کہ راویانِ تصوف نے اپنے مشائخ سے جو بھی چیزیں نقل کی ہیں وہ تین طرح کی ہیں: (١) اقوال (٢) افعال (٣) تقریرات۔ تقریر سے ہماری وہی مراد ہے جو محدثین کے نزدیک معتبر ہے کہ کوئی کام کسی شیخ کی موجودگی میں کیا گیا اور شیخ نے اس کی تائید کی یا اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ قول وفعل وتقریر کی معتبریت واولیت کے سلسلے میں ہم انھی اصولوں کو پیشِ نظر رکھیں گے جن کو اربابِ اصول نے استنباط واحکام کے لیے برتا ہے۔

٤۔راویانِ اخبارِ مشائخ کے طبقات کا علم

جس طرح محدثین کے یہاں راویانِ حدیث کے مختلف طبقات ہیں اور ہر طبقے کا الگ حکم ہے، اسی طرح کتبِ تصوف میں مندرج اخبارِ صوفیہ کے راویوں کے بھی کئی طبقات ہیں اور اسی کی

---

(١) سنن الترمذي، كتاب الامثال (٤/ ٤٤٩، ح:٢٨٦٩)

روشنی میں صوفیہ کی جانب منسوب مختلف اخبار پر صحت وضعف کے لحاظ سے حکم لگایا جائے گا اور اسی کو پیشِ نظر رکھ کر ان اخبار سے مسائلِ تصوف مستنبط کیے جائیں گے۔ اسی لیے محدثین کے طرز پر ہم بھی راویانِ احادیثِ مشائخ کو درج ذیل طبقات میں تقسیم کرتے ہیں۔ (۱) ضبط میں کامل، اپنے شیخ کی خدمت میں زیادہ رہنے والا، فقیہ اور اشارات کا عارف ہو (۲) ضبط میں کامل، اپنے شیخ کی خدمت میں زیادہ رہنے والا ہو، لیکن فقیہ اور اشارات کا عارف نہ ہو (۳) فقیہ، صاحبِ اشارہ اور ضبط میں کامل ہو، لیکن شیخ کی صحبت میں کم رہنے والا ہو (۴) ضبط میں کامل تو ہو، لیکن شیخ کی صحبت کم پائی ہو اور فقیہ بھی نہ ہو (۵) شیخ کی صحبت میں زیادہ رہنے والا ہو، لیکن تام الضبط نہ ہو (۶) شیخ کی صحبت میں رہنا بھی کم نصیب ہوا ہو اور تام الضبط بھی نہ ہو (۷) تام الضبط بھی نہ ہو، شیخ کی صحبت میں بھی کم رہے اور ساتھ ہی اس پر جرح بھی زیادہ ہوئی ہو۔

ہم نے یہاں رایوں کو ان طبقات میں تقسیم تو کر دیا ہے لیکن اس کی معرفت بھی کتب تذکرہ وتراجم کے مطالعے اور منقول اخبارِ مشائخ کے اندر پائے جانے والے عللِ خفیہ قادحہ کے عارفین صوفیہ کی صحبت کے بغیر ممکن نہیں۔ البتہ اس طبقاتی تقسیم کا فائدہ یہ ہوگا کہ اگر کبھی کوئی ایسا قول وفعل وتقریر ہمارے سامنے آئے گا جس پر کوئی اعتراض ہوگا تو اس وقت اس اصول کی روشنی میں تحقیق کر کے ہم کوئی حکم لگانے کے اہل ہوں گے۔

۵۔ روایت میں راوی کے قیاس کی معرفت

بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ کوئی راوی جب کوئی واقعہ بیان کرتا ہے تو اس میں وہ اپنے قیاس کو بھی شامل کر لیتا ہے۔ اس کی کئی مثالیں موجود ہیں، مثلاً صحیح مسلم کی ایک روایت ہے، اس میں یہ بیان ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جب ازواجِ مطہرات سے ناراض ہوکر علاحدگی اختیار کر لی تو یہ مشہور ہوگیا کہ آپ نے اپنی ازواج کو طلاق دے دی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ خبر سنی تو مسجد نبوی میں تشریف لائے اور خدمتِ رسالت میں حاضر ہوکر معاملے کی تحقیق کی تو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں! میں نے طلاق نہیں دی۔ (باب الایلاء)

یہاں غور کریں کہ مسجد نبوی میں صحابۂ کرام جمع ہیں اور سب بیان کر رہے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے طلاق دے دی، صحابہ ثقہ اور عادل ہیں اس کے باجود تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ واقعہ ایسا نہیں تھا بلکہ یہ راوی کا قیاس تھا۔ اب اس پر توجہ کریں کہ جب بارگاہِ رسالت سے متعلق واقعے کے راویوں کے یہاں اس کا امکان ہے تو کیا صوفیہ کے واقعات کے راویوں کے یہاں اس کا امکان نہیں ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ مطالعۂ تصوف کے وقت اگر کوئی چونکا دینے والی بات سامنے آئے تو اس اصول کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس بات کی تحقیق کی

جائے کہ خبرِ شیخ کے بجائے یہ راوی کا قیاس تو نہیں ہے۔ اس قاعدے کو مدِ نظر رکھنے سے بہت سی غلط فہمیوں کا خاتمہ ہوگا اور بہت سی گھتیاں سلجھتی نظر آئیں گی۔

٦۔ درجۂ استنباط کا علم

فقہائے ظاہر کی طرح صوفیہ بھی فقہا ہیں، جس طرح فقہا؛ دین کے ظاہری مسائل کا استنباط واستخراج قرآن وحدیث سے کرتے ہیں اسی طرح صوفیہ بھی دین کے باطنی آداب و مسائل کا استنباط کرتے ہیں اور جس طرح نصوص شرعیہ کے درجات مثلا عبارۃ النص ،اشارۃ النص ، دلالۃ النص ،اور اقتضاء النص اور ان سے مستنبط ہونے والے احکام مثلاً فرض، واجب وغیرہ مختلف ہوتے ہیں، اسی طرح اگر ہم صوفیہ کی کتابوں میں تصوف کا کوئی مسئلہ پڑھیں تو سب کو ایک ہی درجے کا حکم نہ سمجھیں بلکہ یہ ضرور سمجھنے کی کوشش کریں کہ طریقت کا یہ مسئلہ کس درجۂ استنباط سے تعلق رکھتا ہے تاکہ اس پر عمل اور اس کے انکار کی صورت میں اسی حساب سے حکم لگایا جاسکے یا اگر کوئی بات ظاہر النص یا عبارۃ النص کے مطابق معلوم نہ ہو تو اس کو غلط ٹھہرانے کی بجائے یہ جانیں کہ یہ مسئلہ کسی اور طریقے پر مستنبط ہوگا۔ استنباط کے درجات کو سمجھنے کے لیے ہم اصول فقہ کی کتابوں سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس حقیقت سے آگاہ کرتے ہوئے صاحب آداب المریدین فرماتے ہیں:

ولهم أيضا مستنبطات من علوم مشكلة على الفقهاء وذلك مثل العوارض والعوائق وحقائق الأذكار وتجريد التوحيد ومنازل التفريد وخبايات السر وتلاشي المحدث إذا قوبل بالقديم، وغيوب الأحوال، وجمع المتفرقات، والإعراض عن الأغراض، بترك الاعتراض. فهم مخصوصون بالوقوف على المشكل من ذلك بالمنازلة والمباشرة والهجوم ببذل المهج، حتى طالبوا من ادعي حالا منها بدلائلها وتكلموا في صحيحها وسقيمها. (١)

صوفیہ نے ان علوم میں اجتہادات واستنباطات اور استخراج کیے جو فقہا کے لیے مشکل ہیں مثلا عوارض، اسباب وموانع ،حقائق اذکار، تجرید توحید، منازل تفرید، سرّ کے رموز ودقائق ،قدیم کے مقابلے میں حوادث کا فنا، احوال کے اسرار، تفرقہ سے نکل کر جمع کی کیفیت کا حصول، اعتراض چھوڑ کر اغراض سے اعراض ، یہ وہ علوم احوال ہیں جن کی مشکلات سے آگہی صوفیہ کی خصوصیت ہے اور وہ بھی اس طرح کہ وہ خود

---

(١) آداب المریدین، فصل: الکلام علی فروع الدین واحکامہ (ص:١٨)

ان مقامات تک رسائی حاصل کرتے ہیں، بلا واسطہ ان کا تجربہ کرتے ہیں اور اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے ان مقامات کو طے کرتے ہیں، چنانچہ اگر کوئی ان احوال کا دعویٰ کرتا ہے تو صوفیہ اس سے دلیل مانگتے ہیں اور صحیح وسقیم احوال پر کلام کرتے ہیں۔

کتب تصوف کے مطالعے کے وقت طریقت کا کوئی مسئلہ پڑھنے کے بعد کسی قسم کی ژولیدگی رہ جانے کی صورت میں اس پہلو کی رعایت ہم کو بہت ساری الجھنوں سے بچا سکتی ہے اور کسی شیخ کامل کی طرف رجوع کرنے پر آمادہ کر سکتی ہے۔

۷۔احکام طریقت کے مدارج کا علم

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ درجۂ استنباط میں اختلاف کی وجہ سے احسان وسلوک کے احکام کے درجات بھی مختلف ہوں گے، چنانچہ احکام طریقت کے مدارج کو درج ذیل طریقے پر تقسیم کیا جا سکتا ہے: (۱) فرض (۲) واجب (۳) سنت (۴) مستحب (۵) مباح (۶) حرام (۷) مکروہ تحریمی (۸) مکروہ تنزیہی (۹) خلاف اولیٰ۔

چنانچہ جب طریقت کا کوئی مسئلہ سامنے آئے تو اس بات کی معرفت از حد ضروری ہے کہ یہ مسئلہ طریقت میں کس درجے کا ہے تا کہ اسی کے مطابق حکم لگایا جا سکے اور باہم خلط ملط اور پھر اس سے پیدا ہونے والی فکری کجی سے اپنے آپ کو بچایا جا سکے۔

۸۔کتب صوفیہ کے انواع کی معرفت

جس طرح صوفیہ کی اقسام ہیں اسی طرح ان کی کتابوں کے بھی انواع ہیں۔بعض کتابیں تو وہ ہیں جن میں صوفیہ کے احوال اور مذاہب پر محدثانہ انداز میں گفتگو کی گئی ہے ان کو ہم مسانید کہہ سکتے ہیں جیسے رسالۂ قشیریہ، اللمع وغیرہ۔

بعض وہ ہیں جن میں صوفیہ کے اصول و مذاہب کو کلامی یا اصولی انداز میں بیان کیا گیا ہے جیسے التعرف لمذہب اہل التصوف، آداب المریدین، عوارف المعارف وغیرہ یا کتب فقہ کے متون وشروح کے طرز پر گفتگو کی گئی ہے اور صوفیہ کے مذہب و مسلک کی عقلی ونقلی تفہیم کی گئی ہے جیسے قوت القلوب، احیاء العلوم، مجمع السلوک وغیرہ۔

کچھ کتابیں وہ ہیں جو اصلا صوفیہ کے تراجم اور طبقات سے بحث کرتی ہیں لیکن اس میں ضمنا صوفیہ کے مذہب کے احکام بھی آ گئے ہیں، جیسے امام سلمی کی طبقات الصوفیہ وغیرہ۔

کچھ وہ کتابیں ہیں جن کا تعلق صوفیہ کے ملفوظات ومکتوبات سے ہے جن کو ان کے مریدین وخلفا یا تلامذہ نے جمع کیا ہے جیسے فوائد الفواد شریف، مکتوبات صدی، لطائفِ اشرفی، مکتوبات قدوسیہ، مکتوبات امام ربانی وغیرہ۔

کتب صوفیہ کے انواع کی معرفت سے ہمیں صحیح طریقۂ استفادہ کا سلیقہ بھی معلوم ہوگا اور ساتھ ہی ان کتابوں کا مقام و مرتبہ بھی متعین کرنے اور پھر ان پر حکم لگانے میں بھی آسانی ہوگی۔

۹۔کتب صوفیہ کے درجات کی معرفت

کتب صوفیہ کے انواع کی معرفت کے بعد مصنف کی جانب ان کتابوں کے انتساب اور مصنف سے ان کی صحت روایت کے اعتبار سے ہمیں ان کتابوں کے درجات کا جاننا ضروری ہے۔

کتب صوفیہ کی تمام انواع کو دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔(۱) ظاہر الروایۃ (۲) نادر الروایۃ

(۱) ظاہر الروایۃ میں وہ کتابیں شامل ہوں گی جن کے مصنف کی جانب انتساب پر اہل علم کے مابین کوئی شبہ نہ پایا جاتا ہو، جیسے امام قشیری کی رسالۂ قشیریہ، شیخ ابو طالب مکی کی قوت القلوب، امام غزالی کی احیاء العلوم، محبوب الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کا ملفوظ فوائد الفواد اور حضرت شیخ شرف الدین یحیی منیری کی مکتوبات صدی، حضرت شیخ احمد سرہندی کی مکتوباتِ امام ربانی وغیرہ دوسری معتبر کتابیں اور ملفوظات۔

(۲) نادر الروایۃ میں وہ کتابیں شامل ہوں گی جن کے مصنف کی جانب انتساب میں اہل علم کو کوئی شبہ ہو مثلا سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی کی غنیۃ الطالبین اور امام غزالی کی مکاشفۃ القلوب وغیرہ۔

خصوصاً ملفوظات کی معتبریت کے باب میں صحت نقل و روایت کے علاوہ اس بات کی سب سے زیادہ اہمیت ہے کہ ملفوظات کے جامع نے صاحب ملفوظ سے اس پر نظر ثانی کروایا ہے یا نہیں، مثلا فوائد الفواد ایسا ملفوظ ہے جس پر جامع ملفوظ حضرت حسن علا سنجری نے صاحب ملفوظ حضرت محبوب الٰہی سے نظر ثانی کروالیا تھا، اس طرح کے ملفوظ دوسرے ملفوظات سے زیادہ معتبر ہوں گے۔

کتب صوفیہ کے درجات کی معرفت کا فائدہ یہ ہوگا کہ صوفیہ کے مذہب و مسلک کی معرفت میں کتب ظاہر الروایۃ پر اعتماد کیا جائے گا اور اگر کوئی بات بظاہر خلاف شرع سامنے آئے گی تو ان میں تاویل کی جائے گی اور سمجھ میں نہ آنے کی صورت میں نہ تو اسے قبول کیا جائے گا اور نہ ہی رد، بلکہ حتی الامکان سکوت کیا جائے گا اگر وہ کتاب کسی مستند صوفی کی ہو۔

اس کے برخلاف کتب نادر الروایۃ کی جانب صوفیہ کے اصول و مذہب کے لیے اولا رجوع نہیں کیا جائے گا اور خلاف شرع کوئی بات سامنے آنے کی صورت میں ہمیں اسے رد کر دینے کا مکمل اختیار ہوگا۔

۱۰۔نوعیت کلام کی معرفت

عام طور سے صوفیہ کرام و بزرگان دین کی تمام باتوں کو نقل کرتے وقت لکھا جاتا ہے: ’’فلاں

بزرگ ارشاد فرماتے ہیں'' یہ تعبیر اگر چہ عام ہے اور ہدایت فرمانے، حکم دینے اور کہنے کے معانی کو شامل ہے لیکن صوفیہ کے خاص محاورے اور اصطلاح میں قابل غور ہے کیوں کہ صوفیہ کے یہاں ''ارشاد'' کا معنیٰ ''قول محکم'' ہے، ان کے تمام اقوال ارشاد نہیں ہوا کرتے کیوں کہ ان کے اقوال پر بھی کلام الٰہی اور حدیث رسول کا رنگ ہوتا ہے، قرآن کریم اور احادیث رسول میں تمام اقوال کا تعلق محکمات سے نہیں بلکہ ان میں کچھ متشابہات بھی ہیں، خود قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ** (آل عمران: ۷)(۱)

پھر متشابہ آیتیں بھی دو طرح کی ہوتی ہیں ایک تو وہ جن کا معنی سرے سے معلوم نہیں مثلا الم ۔ حٰمٓ عٓسٓقٓ وغیرہ جن کو آیات مقطعات بھی کہا جاتا ہے، دوسرے وہ جن کا ظاہری لغوی حسی معنی تو معلوم ہوتا ہے لیکن وہ مراد لینا درست نہیں ہوتا مثلا وجہ اللہ، ید اللہ وغیرہ۔

اسی طرح احادیث کریمہ میں بھی بعض کا تعلق متشابہات سے ہے اور اس کے حقیقی معانی ہمیں معلوم نہیں مثلاً

اَلْحَجَرُ الْاَسْوَدُ يَمِيْنُ اللهِ (۲) حجر اسود اللہ کا داہنا ہاتھ ہے۔

اور بعض کا تعلق مبہمات اور موہمات سے ہے جیسے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

إِنَّ الْجَنَّةَ لَا تَدْخُلُهَا عَجُوزٌ (۳) کوئی بوڑھی جنت میں نہیں جائے گی۔

یوں ہی صوفیہ کے اقوال و افعال بھی محکمات اور متشابہات پر مشتمل ہوتے ہیں، محکمات کو صوفیہ کی اصطلاح میں ارشادات کا نام دیا جاتا ہے جبکہ متشابہات کی کئی قسمیں ہوتی ہیں اور سب کے جداگانہ نام ہیں۔ چنانچہ صوفیہ کے متشابہ اقوال و اعمال کی چار قسمیں ہیں: ۱۔ مبہمات، ۲۔ موہمات، ۳۔ ہفوات، ۴۔ شطحات۔

ان کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

(۱) مبہمات: ان اقوال کو کہا جاتا ہے جس میں متعدد احتمالات ہوں، جن کی وجہ سے ان میں ابہام پیدا ہو گیا ہو، لیکن اس کے باوجود وہاں صحیح احتمال کو سمجھنا اور مراد لینا آسان ہو۔

جیسے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان: **إِنَّ الْجَنَّةَ لَا تَدْخُلُهَا عَجُوزٌ** (کوئی بوڑھی جنت

---

(۱) اسی ذات کریم نے آپ پر کتاب اتاری، اس میں کچھ آیتیں محکم ہیں اور کچھ متشابہ۔

(۲) صحیح ابن خزیمۃ، کتاب المناسک (۲/ ۱۲۹۴، ح: ۲۷۳۷) حاکم/ المستدرک (۱/ ۶۲۷، ح: ۱۶۸۱) محققین نے اسے حسن لغیرہ کہا ہے اور بعض لوگوں نے اسے ضعیف مانا ہے۔

(۳) ترمذی/ الشمائل المحمدیۃ، باب ما جاء في صفۃ مزاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (ص: ۱۹۷، ح: ۲۴۱)

میں نہیں جائے گی)اس میں ایک معنی جو ظاہر ہے وہ یہ کہ کوئی بوڑھی جنت میں نہیں جائے گی، لیکن دوسرا معنی کہ کوئی بوڑھی ہونے کی حالت میں جنت میں نہیں جائے گی، اس کو آسانی سے سمجھا اور مراد لیا جاسکتا ہے۔اس ذیل میں بعض صوفیہ کے اس قول کو بھی رکھا جاسکتا ہے جس میں انہوں نے فرمایا کہ سلوک طے کرتے ہوئے سالک ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں تکلیف شرعی ساقط ہوجاتی ہے یہ جملہ مبہمات مشائخ کے قبیل سے ہے،اس کا ایک معنی جو ظاہر ہے یہ ہے کہ سالک کے لیے ایسا کوئی مقام بھی ہے جہاں شرعی احکام کی پابندی ختم ہوجاتی ہے لیکن یہ مردود ہے۔اس کا ایک دوسرا معنی بھی ہے جو پہلے معنی کی طرح ظاہر تو نہیں لیکن آسانی سے مراد لیا جاسکتا ہے اور بلا تکلف سمجھا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ سالک دوران سلوک ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں احکام شرعیہ کی ادائیگی میں پائی جانے والی کلفت ومشقت ختم ہوجاتی ہے اور اس مقام پر پہنچنے کے بعد سالک احکام شرعیہ کی بجا آوری میں ایمانی حلاوت اور عرفانی لذت پانے لگتا ہے۔(۱)

(۲) موہمات: ان اقوال کو کہا جاتا ہے جن میں متعدد احتمالات ہوں اور ان کے صحیح معنی اور صحیح احتمال تک آسانی سے ذہن نہ پہنچتا ہو بلکہ تفکر وتدبر کے بعد ہی اس کے صحیح معنی تک رسائی ہو سکتی ہو۔جیسے کسی صوفی کا یہ قول کہ اس راہ میں ابلیس بھی دوست ہوجاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ قول بظاہر وحشت ناک ہے اور اس کی کوئی صحیح تاویل سمجھ میں نہیں آتی لیکن غور وفکر کے بعد اس کا ایک صحیح پہلو اس وقت سامنے آتا ہے جب ہم حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کو پڑھتے ہیں جس میں وہ خود بیان کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو صدقے کے مال کی حفاظت پر متعین کیا تھا، چنانچہ ایک رات ایک شخص نظر آیا جو جلدی جلدی غلہ سمیٹ رہا تھا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس کو پکڑ لیا، اس پر وہ شخص گریہ وزاری کرنے لگا، اس کی یہ حالت دیکھ کر حضرت ابو ہریرہ نے اس کو چھوڑ دیا، اگلے روز حضور کے دریافت کرنے پر انہوں نے سارا ماجرا کہہ سنایا، حضور نے فرمایا وہ جھوٹا ہے وہ کل پھر آئے گا چنانچہ وہ دوسری اور پھر تیسری شب بھی آیا اور ہر بار اس نے بہانے بنائے، تیسری بار اس نے حضرت ابو ہریرہ سے کہا کہ اے ابو ہریرہ! مجھے چھوڑ دو میں تم کو ایسی بات بتاتا ہوں جس سے تم کو فائدہ ہوگا اور پھر اس نے بتایا کہ اے ابو ہریرہ سونے سے پہلے آیت الکرسی پڑھ لیا کرو، حضرت ابو ہریرہ صبح کو آئے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سارا واقعہ سنایا، حضور نے فرمایا کہ وہ ابلیس تھا، اس نے سچ کہا اگرچہ وہ بہت بڑا جھوٹا ہے۔(۲)

---

(۱) دیکھیے؛ مجمع السلوک، جلد اول، زیر بحث: طلب علم کی فضیلت

(۲) صحیح بخاری، باب الوکالۃ

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی شیطان اپنے مقصد کی تحصیل کے لیے خیر کی جانب بھی رہنمائی کرتا ہے۔ اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے خیر کے راستے میں حضرت ابو ہریرہ کی مدد کی، اب اس تناظر میں اگر یہ کہا جائے کہ اس راہ میں ابلیس بھی دوست ہو جاتا ہے تو یہ قول غلط معلوم نہیں ہوتا۔ ویسے اس قول کی دیگر درست تاویلات بھی موجود ہیں۔

(۳) ہفوات: ان افعال کو کہا جاتا ہے جو خلاف شرع معلوم ہوں اور بظاہر ان کی کوئی تاویل بھی سمجھ میں نہ آتی ہو، جیسے حضرت شبلی کا بیٹے کی موت پر داڑھی منڈوالینا۔

اس بارے میں جب حضرت شبلی سے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ میری بیوی نے بیٹے کے غم میں سر کے بال منڈوا لیے اس لیے میں نے بیوی کی موافقت میں داڑھی منڈوالی، ظاہر ہے حضرت شبلی جیسی شخصیت سے یہ متوقع نہیں ہے کہ انہوں نے ایسا اس لیے کیا ہو جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے۔

جب لوگوں نے اصل حقیقت سے آگاہ کرنے پر اصرار کیا تو آپ نے فرمایا کہ مجھے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث پہنچی ہے کہ جو لوگ تذکیر کرتے ہیں اور خود غافل ہوتے ہیں تو وہ لعنت کے مستحق ہوتے ہیں اور مجھ کو معلوم تھا کہ بیٹے کی موت کے بعد لوگ میرے پاس تعزیت کے لیے آئیں گے اور یہ دنیا دار لوگ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کہہ کر تذکیر کریں گے جب کہ ان کے قلوب غیر اللہ میں مشغول ہوں گے اور اس طرح لعنت کے مستحق ہوں گے، اس لیے میں نے ایسا عمل انجام دے دیا کہ لوگ مجھ سے نفرت کرنے لگیں اور میرے پاس تعزیت کے لیے نہ آئیں اور اس طرح میں نے ایک چھوٹی آفت اختیار کر کے لوگوں کو ایک بڑی آفت سے بچا لیا۔(۱)

ایسے بھی فقہ کا ایک مشہور قاعدہ ہے: **اَلْعَبْدُ إِذَا ابْتُلِيَ ببليتين فليختر الأهون** (بندہ جب دو بلاؤں میں گرفتار ہو جائے تو ہلکی بلا کو اختیار کر لے۔)

(۴) شطحات: ان اقوال کو کہتے ہیں جو خلاف شرع معلوم ہوتے ہیں اور جن میں کسی تاویل قریب و بعید کی گنجائش نظر نہیں آتی، جیسے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی جانب یہ قول منسوب ہے کہ آپ نے فرمایا: **انا مقیم القیامۃ** (میں قیامت قائم کرنے والا ہوں) اس طرح کے اقوال کے بارے میں حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی نے تحفہ اثنا عشریہ میں ذکر کیا ہے کہ آپ نے حالت سکر میں اس طرح کے کلمات کہے ہیں۔(۲)

حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی فرماتے ہیں:

---

(۱) مرج البحرین (فارسی)، شیخ عبد الحق محدث دہلوی، ص: ۴۸، ۴۹

(۲) عقائد العزیز، مخدوم محمد عزیز اللہ شاہ صفی پوری، ص: ۶۵

صوفیہ کے متشابہات کے تعلق سے علما کے تین گروہ ہیں۔

(۱) پہلا گروہ وہ ہے جو ان پر انکار کرتا ہے، اور پھر ان کی بھی دو جماعتیں ہیں، ایک وہ جماعت جو حقیقی طور سے ان صوفیہ پر انکار کرتی ہے اور ایسے اقوال وافعال کو جہل وجنون سے تعبیر کرتی ہے۔ یہ چیز اس جماعت کے لیے رحمت وبرکت سے محرومی اور سوئے خاتمہ کا سبب بن سکتی ہے۔ دوسری وہ جماعت جو سدذرائع کی نیت سے انکار کرتی ہے اور فی نفسہ وہ ان صوفیہ کے موافق اور حامی ہوتی ہے۔ (۲) دوسرا گروہ وہ ہے جو نہایت غالی ہے، یہ اس طرح کے تمام اقوال وافعال کو ظاہرا بھی درست اور صحیح سمجھتا ہے۔ (۳) تیسرا گروہ وہ ہے جو افراط وتفریط سے پاک ہے، یہ صاحبان اعتدال ہیں، ان کا موقف یہ ہے کہ ایسے اقوال وافعال درحقیقت درست ہیں مگر بظاہر قبیح ہیں اور بظاہر قبیح ہونے کی وجہ ان حضرات کا غلبۂ حال اور اختیار کا کھودینا ہے۔ لہٰذا ایسے اقوال وافعال کو فقط تسلیم کیا جائے جیسا کہ کہا گیا ہے **أسلم تسلم** (۱)

چنانچہ صوفیہ کے اقوال وافعال میں صرف ارشادات ہی مکمل طور سے قابل عمل ہوتے ہیں، باقی رہے متشابہات تو وہ اپنی تمام قسموں کے ساتھ مؤول ہیں اور ان کے ظاہری معانی قابل عمل نہیں اور نہ ہی ان سے کسی چیز کے جواز وعدم جواز پر استدلال درست ہے۔ اس لیے کتب تصوف کے مطالعے کے دوران یا ویسے بھی کبھی کسی صوفی کا کوئی عمل سامنے آئے تو یہ ضرور غور کیا جائے کہ وہ ظاہری طور پر بھی شریعت وطریقت کے مطابق ہے یا نہیں، اگر ظاہری طور پر بھی معیار شریعت پر ہو تو اس کا تعلق ارشادات سے ہوگا ورنہ متشابہات سے اور متشابہات کے ظاہر کی تقلید نہیں کی جائے گی بلکہ اس کے صحیح معانی مراد لینے کی کوشش کی جائے گی، ان کے ہر قول وفعل کو محکمات وارشادات میں شمار کرنا اور ان کے ظاہر کی تقلید کرنا غلط ہے۔

اس تعلق سے شیخ ابن تیمیہ کا اعترافی بیان دیکھیے، وہ لکھتے ہیں:

وفي كلام أهل التصوف عبارات موهمة في ظاهرها بل وموحشة أحيانا ولكن تحتمل وجها صحيحا يمكن حملها عليه، فمن الإنصاف أن تحمل على الوجه الصحيح (۲)

---

(۱) مرج البحرین فارسی، شیخ عبد الحق محدث دہلوی، ص ۳۵-۳۷

(۲) مجموع الفتاویٰ، ج:۵، ۳۳۷

اہل تصوف کے کلام میں ظاہراً ایہام پیدا کرنے والی بعض وحشت ناک عبارتیں ہوتی ہیں لیکن ان میں ایسے صحیح پہلو کا بھی احتمال ہوتا ہے جسے مراد لینا ممکن ہوتا ہے، اس لیے انصاف یہ ہے کہ ان عبارتوں کو انہی صحیح معانی پر محمول کیا جائے۔

یہ بہت ہی اہم اصول ہے، اگر اس کو پیش نظر رکھا جائے تو صوفیہ کرام کے حوالے سے بہت ساری بدگمانیوں سے بچا جا سکتا ہے۔

۱۱۔اقوال وافعال میں بشری پہلوؤں کی رعایت

چند بشری احوال ایسے بھی ہیں جن میں شریعت نے بندوں کو معذور قرار دیا ہے اور ان احوال میں جو اقوال وافعال سرزد ہوتے ہیں ان پر شریعت کی گرفت نہیں ہوتی، انہی بشری احوال میں غلبہ حال، نسیان اور سہو بھی ہے۔

۱۔**غلبۂ حال:** غلبۂ حال کوئی بری چیز نہیں بلکہ فی نفسہ محمود ہے، یوں ہی مغلوب الحال فی نفسہ خطا کار نہیں بلکہ معذور اور حسن نیت کی بنا پر عنداللہ ماجور ہوتا ہے۔ کیوں کہ مغلوب انسان یا تو الحب للہ میں مغلوب ہوتا ہے یا البغض للہ میں، اور قرآن واحادیث میں الحب للہ اور البغض للہ پر مؤمنین کی تعریف کی گئی ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: **مَنْ أَحَبَّ لِلّٰهِ، وَ أَبْغَضَ لِلّٰهِ، وَأَعْطَى لِلّٰهِ، وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْإِيمَانَ** (۱) اللہ کی محبت یا اللہ کے لیے شدید محبت یا اللہ کے لیے شدید نفرت یہ ایمان کا حصہ ہے، ایسی شدت محبت اور نفرت کو بھی غلبۂ حال کا نام دیا جاتا ہے، بسا اوقات غلبۂ حال کے زیر اثر کوئی شخص ایسا عمل کرتا ہے جو شریعت کے عمومی منہج کے مطابق نہیں ہوتا، ایسے شخص کو لعن طعن نہیں کیا جا سکتا، ایسا شخص اپنے عمل میں معذور و ماجور ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: **قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا** (۲) یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے عمل میں مقتدا نہیں ہوتا، البتہ مغلوبانہ احوال کو ذکر کرنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے دوسروں کے جذبوں کو مہمیز لگتی ہے اور دین کے لیے اپنی کم ہمتی کا اندازہ ہوتا ہے چنانچہ طالبان مولیٰ کے نفس کو مقہور کرنے اور ان کے حوصلوں کو ایڑ لگانے کے لیے صالحین کے غلبۂ حال والے واقعات ذکر کیے جاتے ہیں اور مقصود صرف نفس کو زیر کرنا اور حوصلوں کو مہمیز کرنا

---

(۱) جس نے اللہ کے لیے محبت کی، اللہ کے لیے عداوت کی، اللہ کے لیے عطا کیا، اللہ کے لیے منع کیا، اس نے ایمان مکمل کرلیا۔ سنن ابوداؤد کتاب السنۃ، الدلیل علی زیادۃ الایمان ونقصانہ (۴/ ۲۲۰، ح: ۴۶۸۱)

(۲) ہر انسان اپنے شاکلے کے مطابق عمل کرتا ہے تو آپ کا رب بہتر جانتا ہے کہ کون زیادہ ہدایت پر ہے۔ (بنی اسرائیل/ ۸۴)

ہے، نہ کہ غلبۂ حال اختیار کرنے کی دعوت دینا۔

علامہ قطب الدین دمشقی قدس سرہ اس حقیقت کو بے نقاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

و ما أوردناه في فضائل الجوع ربما يومی إلى أن الإفراط فيه مطلوب، وهيهات! ولكن من أسرار حكمة الله تعالى في الشريعة أن كل مايطلب الطبع فيه الطرف الأقصى وكان فيه فساد، جاء الشرع بالمبالغة في المنع منه على وجه يومي عند الجاهل إلى أن المطلوب مضادة مايقتضيه الطبع بغاية الإمكان، والعَالِم يُدرك أن المقصود الوسط، لأن الطبع إذا طلب غاية الشبع فالشرع ينبغي أن يمدح غاية الجوع حتى يكون الطبع باعثا، والشرع مانعا، فيتقاومان فيحصل الاعتدال۔(۱)

بھوکے رہنے کی فضیلت میں ہم نے جو کچھ ذکر کیا ہے بسا اوقات اس سے اس بات کا وہم ہوتا ہے کہ اس معاملے میں افراط وشدت اور مکمل طور سے کھانا چھوڑ دینا شریعت کو مطلوب ہے، حالاں کہ ایسی بات نہیں ہے۔ البتہ احکام شریعت کے حوالے سے اللہ کی ایک حکمت یہ ہے کہ طبیعت جس چیز کی طرف انتہائی حد تک مائل ہو، افراط وغلو کی طالب ہو اور اس درجے میں اس چیز کے اندر فساد ہو تو شریعت اتنی شدت اور غلبے کے ساتھ اس سے روکتی ہے کہ جاہل اس سے یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ شریعت کا مطلوب ہر ممکن حد تک اس طبعی تقاضے کی مخالفت ہے، جب کہ اہل علم یہ سمجھتے ہیں کہ شریعت کی جانب سے منع کرنے کا مقصود یہ ہے کہ میانہ روی اختیار کی جائے۔ اس لیے کہ طبیعت مکمل طور سے شکم سیر ہونے کا تقاضا کر رہی ہے، اسی غرض سے شریعت اس کے برخلاف مکمل طور سے بھوکے رہنے کی مدح وثنا کرتی ہے، تاکہ طبیعت انتہائی شکم سیری کا تقاضا کرے اور شریعت اس سے مکمل طور سے روکے، اس طرح طبیعت وشریعت دونوں آمنے سامنے آجائیں اور دونوں کے ٹکراؤ سے اعتدال حاصل ہو جائے۔''

اس لیے ہمارے لیے یہ درست نہیں کہ سب کے لیے ہم ان احوال کا حصول واجب قرار دے دیں، یا اس کی وجہ سے ہم یہ کہیں کہ فلاں کا یہ طریقہ تو جادۂ شریعت سے خارج ہے۔ اس کا طریقہ آپ کی حالت کے مطابق جادۂ شریعت سے خارج ہو سکتا ہے لیکن خود اس کے حال کے مطابق نہیں، مثلاً کسی کو گرمی کے زمانے میں ملیریا ہو جائے اب ظاہر ہے کہ وہ رضائی پر رضائی

---

(۱) الرسالۃ المکیۃ، فصل فی دوام الصوم (ص: ۷۴)

اوڑھنے پر مجبور ہوگا لیکن دوسرا شخص جو اس کے حال سے واقف نہیں ہوگا اس پر اعتراض کرے گا اور اسے جادۂ عقل سے ہٹا ہوا سمجھے گا البتہ جو اس کے حال سے واقف ہوگا، وہ اس پر اعتراض نہیں کرے گا اور اسے معذور قرار دے گا۔ اسی طرح دین میں مغلوب الحال شخص کا معاملہ ہے۔ چنانچہ کتب تصوف کے مطالعے کے وقت اگر کوئی ایسا قول و فعل پڑھیں جو بظاہر شریعت کے مخالف ہو تو غور کریں کہ کہیں یہ کسی مرد خدا کا غلبۂ حال تو نہیں تاکہ ہم اعتراض و انکار کی نحوست سے بچ سکیں۔

خیر القرون میں بھی غلبۂ حال کے بہت سے واقعات ملتے ہیں۔ مثلاً حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کے ہاتھ میں سونے کی ایک انگوٹھی دیکھی تو آپ نے اسے اتار کر پھینک دیا اور فرمایا تم میں سے کوئی شخص آگ کے انگارے کو اپنے ہاتھ میں لینے کا قصد کرتا ہے؟ رسول اللہ ﷺ کے تشریف لے جانے کے بعد اسی شخص سے کہا گیا: جاؤ اپنی انگوٹھی لے لو اور اس سے نفع حاصل کرو، اس نے کہا: **وَاللّٰہِ، لَا آخُذُہٗ أَبَدًا وَقَدْ طَرَحَہٗ رَسُولُ اللّٰہِ** ﷺ (۱) خدا کی قسم جس چیز کو اللہ کے رسول ﷺ نے پھینک دیا ہو اس کو میں کبھی نہیں اٹھاؤں گا۔

اس روایت میں غور کریں کہ سونا پہننا اسلام میں حرام ہے، سونا رکھنا اور اس سے نفع حاصل کرنا نہیں، لیکن صحابی رسول نے پھر بھی اسے نہیں اٹھایا جب کہ بظاہر یہ مال ضائع کرنا ہے جو اسلام میں حرام ہے لیکن وہ صحابی اس وقت اتباع رسول اور مخالفت نفس میں مغلوب تھے، اس لیے ایسا فعل ان سے سرزد ہوا اور وہ اپنے اس عمل کی بنا پر ماجور ہیں۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر جب عروہ بن مسعود نے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے گفتگو کرتے ہوئے یہ کہا کہ "**واللہ لاریٰ وجوھا وانی لاریٰ اوباشا من الناس خلیقا ان یفروک ویدعوک** "اللہ کی قسم! میں ایسے چہروں اور ایسے اوباش لوگوں کو یہاں دیکھ رہا ہوں جو آپ کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے، اس جملے کو سن کر حضرت ابوبکر ضبط نہ کر سکے اور محبتِ خدا اور رسول اور بغضِ اعدائے دین کے جذبات سے مغلوب ہو کر آپ نے ترکی بہ ترکی اسے جواب دیا اور فرمایا: **امصص بظر اللات والعزیٰ أنحن نفر عنہٗ وندعہٗ**۔ اے بتوں کو چومنے، چاٹنے والے! کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم اپنے رسول کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔(۲)

سیدنا صدیق اکبر نے اس کی جن لفظوں میں زجر و توبیخ کی وہ غلبۂ حال میں نکلا ہوا جملہ تھا۔ اس کی

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب اللباس والزینۃ، باب طرح خاتم الذہب (۳/ ۱۶۵۵، ح: ۲۰۹۰)

(۲) صحیح البخاری، باب الشروط فی الجہاد والمصالحۃ

بنا پر یہ حکم نہیں لگایا جاسکتا کہ گالی دینا اسلام میں جائز ہے؛ کیوں کہ کسی نص سے استنباطِ احکام قیاس واستدلال کے لیے ضروری ہے کہ جس نص پر قیاس کیا گیا ہے وہ خاص نہ ہو اور خود اس اصل کا حکم خلافِ قیاس نہ ہو۔(۱)
اس اعتبار سے جب ہم غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مغلوب الحال شخص کا حال اس کی ایک خاص حالت ہے اور اس کا جواز صرف اسی کے حق میں تسلیم کیا جائے گا جو اسی حال میں ہوگا اور جو اس حال میں نہ ہو اس کے لیے اس کا جواز نہیں ہوگا۔ مغلوب الحال کا حکم عام اس لیے بھی نہیں ہوگا کہ اس کا جو حال ہے وہ خود اصل حکم کے خلاف ہے، پھر اس پر دوسروں کو کیسے قیاس کیا جائے گا۔ مثلا سیدنا صدیق اکبر کا عروہ کو برا کہنا خلافِ قیاس ہے؛ اس لیے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: **ان اللہ لایحب کل فحاش متفحش**۔ اللہ تعالیٰ فحاش اور فحش گوئی کرنے والے کو محبوب نہیں رکھتا۔(۲)

یوں ہی غلبۂ حال کے بعض واقعات کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مقام مدح میں بھی ذکر کیا ہے ، چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ایک آدمی تھا جو اپنی جان پر ظلم کرتا رہا، بہت زیادہ گناہوں میں ملوث رہا لیکن جب اس کی موت کا وقت قریب آیا تو اس نے اپنے بیٹوں سے کہا جب میں مرجاؤں تو مجھے جلا دینا، پھر میرے جلے ہوئے جسم کو پیس دینا، پھر میری راکھ ہوا میں اڑا دینا، اللہ کی قسم اگر میرے رب نے میری گرفت کی تو وہ مجھے ایسا عذاب دے گا کہ اس جیسا عذاب کبھی کسی کو نہ دیا ہوگا۔ جب وہ مرگیا تو اس کے ساتھ ایسا ہی کیا گیا، اللہ تعالیٰ نے زمین کو حکم دیا کہ اس کے اندر موجود اس شخص کے بکھرے ہوئے اجزا کو جمع کردے، زمین نے وہ اجزا جمع کردیے تو وہ پورے جسم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہو گیا اللہ تعالیٰ نے اس سے فرمایا: اس کام پر کس چیز نے تجھ کو آمادہ کیا تھا؟ اس نے کہا اے میرے رب! تیری خشیت نے تو اللہ تعالیٰ نے اس کو بخش دیا۔(۳)

اس واقعہ میں غور کریں کہ کسی ایمان والے کا یہ وصیت کرنا کہ اس کو جلا کر، پیس کر اور راکھ بنا کر اڑا دیا جائے یہ ایک ناجائز عمل ہے، لیکن یہ عمل چونکہ غلبۂ خشیت کی وجہ سے تھا اس لیے ناپسندیدہ نہیں ہوا بلکہ اس کی مغفرت کا ذریعہ بن گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مقام مدح میں اس واقعہ کو اپنے صحابہ سے ذکر بھی فرمایا۔

بزرگان دین کے پر مشقت ریاضات ومجاہدات اور ان کے مغلوبانہ اقوال وافعال کو جو

---

(۱) المستصفی للغزالی، ج:۲، باب:۴

(۲) المعجم الکبیر، باب الاکف

(۳) بخاري، کتاب أحادیث الانبیاء، باب ماذکر عن بنی اسرائیل (۴/۱۶۹، ۳۴۵۲) مسلم، کتاب الرقاق، باب فی سعۃ رحمۃ...، (۴/۲۱۰۹، ح:۲۷۵۶)

بظاہر جادۂ شریعت سے خارج معلوم ہوتے ہیں اگر اس حدیث کی روشنی میں سمجھا جائے تو ان کے تعلق سے بہت سی الجھنوں اور سوئے ظن کا خاتمہ ہوسکتا ہے، اسی طرح بزرگان دین سے غلبۂ وجد اور طرب و مستی کے عالم میں جو کلمات صادر ہوتے ہیں ان کو اس حدیث کے پس منظر میں بھی سمجھنا چاہیے جس میں آیا ہے کہ ایک بندہ غلبۂ مسرت کی وجہ سے **اللهُمَّ أَنْتَ رَبِّيْ وَأَنَا عَبْدُكَ** (اے اللہ! تو میرا رب ہے اور میں تیرا بندہ ہوں۔) کہنے کے بجائے **اللّٰهُمَّ أَنْتَ عَبْدِي وَأَنَا رَبُّك** (اے اللہ! تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب ہوں۔) کہہ بیٹھا لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے اس جملے پر شرک و کفر کا کوئی فتویٰ صادر نہیں کیا بلکہ صرف اس کو خاطی قرار دیتے ہوئے اس کا عذر بھی پیش کیا اور ارشاد فرمایا: **أَخْطَأَ مِنْ شِدَّةِ الْفَرَحِ۔** ''یہ شخص غلبۂ مسرت میں خطا کر گیا''(۱)

۲۔**نسیان:** بظاہر خلاف شریعت نظر آنے والے اقوال و افعال نسیان پر بھی مبنی ہو سکتے ہیں، اس لیے اعتراض و انکار اور ان کو گمراہ قرار دینے کے بجائے نسیان پر محمول کر کے بھی ان اقوال و افعال کی تقلید یا اس پر اعتراض و انکار سے بچا جا سکتا ہے، کیوں کہ نسیان پر شریعت میں کوئی مواخذہ نہیں اور کوئی بھی بندہ کتنا ہی بلند رتبہ کیوں نہ ہو اس پر نسیان طاری ہوسکتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا** (طٰہٰ: ۱۱۵) آدم پر نسیان طاری ہو گیا اور ہم نے ان کا ارادہ نہیں پایا۔ اس نسیان کی بنا پر حضرت آدم علیہ السلام سے بظاہر فعل معصیت کا صدور ہوا لیکن پھر بھی وہ مقربان الٰہی کی جماعت سے خارج نہیں ہوئے بلکہ حالت نسیان میں ہونے والی خطا کے احساس کے بعد جو انہوں نے توبہ کی اس سے ان کے رتبے میں اور اضافہ ہو گیا۔ کیوں کہ خود اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ہم نے ان کا کوئی ارادہ نہیں پایا اور ثواب و جزا کا ترتب تو نیت و ارادہ پر ہوتا ہے، اب جب کہ ارادہ نہیں پایا گیا تو ان کے عاصی ہونے کا کیا معنی!!

واضح رہے کہ سہو و نسیان کبھی فکر دنیا میں انہماک کے سبب ہوتا ہے تو کبھی فکر عقبی میں مشغولیت اور کبھی ذات باری میں استغراق کے سبب۔ پہلی قسم مذموم ہے، دوسری قسم مسعود، جب کہ تیسری قسم محمود ہے، پہلا درجہ عامۃ الناس کا ہے، دوسرا خواص کا اور تیسرا اخص الخواص کا۔

اگر مشائخ صوفیہ پر نسیان کسی امر دنیوی کی وجہ سے ہو تو اسے ذہول، اگر امر دینی کی وجہ

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب التوبہ، باب فی الحض علی التوبۃ والفرح بہ (۴/ ۲۱۰۴، ح: ۲۷۴۷) بہ الفاظ: **لَلّٰهُ أَشَدُّ فَرَحًا بِتَوْبَةِ عَبْدِهِ حِينَ يَتُوبُ إِلَيْهِ، مِنْ أَحَدِكُمْ كَانَ عَلَى رَاحِلَتِهِ بِأَرْضِ فَلَاةٍ، فَانْفَلَتَتْ مِنْهُ وَعَلَيْهَا طَعَامُهُ وَشَرَابُهُ، فَأَيِسَ مِنْهَا، فَأَتَى شَجَرَةً، فَاضْطَجَعَ فِي ظِلِّهَا، قَدْ أَيِسَ مِنْ رَاحِلَتِهِ، فَبَيْنَا هُوَ كَذَلِكَ إِذَا هُوَ بِهَا، قَائِمَةً عِنْدَهُ، فَأَخَذَ بِخِطَامِهَا، ثُمَّ قَالَ مِنْ شِدَّةِ الْفَرَحِ: اللهُمَّ أَنْتَ عَبْدِي وَأَنَا رَبُّك، أَخْطَأَ مِنْ شِدَّةِ الْفَرَحِ۔**

سے ہوتو غلبہ اور اگر ذات باری میں استغراق کی وجہ سے ہوتو اسے سکر کہا جاتا ہے۔
اہل شعور اس فرق مراتب کو سمجھتے ہیں اور غافلین خود پر دوسروں کو بھی قیاس کرتے ہیں۔
۳۔سہو: بظاہر شریعت سے متصادم اقوال میں سہو کا پہلو بھی ہوسکتا ہے، اور سہو پر شریعت میں کوئی گرفت نہیں، کیوں کہ حقیقت میں یہ بھی نسیان کی ایک قسم ہے، البتہ نسیان اور سہو میں فرق یہ ہے کہ نسیان میں معلوم چیز اس طرح ذہن سے نکل جاتی ہے کہ از سر نو اس کو یاد کرنے کی ضرورت پڑتی ہے جب کہ سہو میں معلوم چیز قوت حافظہ سے اس طرح نکلتی ہے کہ ذرا سی تنبیہ سے انسان مطلع ہو جاتا ہے۔لہٰذا صوفیہ کے اقوال و افعال میں بھی سہو کے امکان کے پہلو کو ذہن میں رکھنا چاہیے۔

۱۲۔اصطلاح صوفیہ کی معرفت

ہر فن کی اپنی زبان اور اپنی اصطلاح ہوتی ہے اور یہ اصطلاحیں اسی لیے بنائی جاتی ہیں تا کہ فن کے مسائل کو جزئیات وکلیات اور اصول وفروع کی شکل میں علمی زبان عطا کی جائے۔ چنانچہ فقہ وحدیث کی اپنی اصطلاحات ہیں تو علم کلام اور تفسیر کی اپنی زبان۔اب اگر کوئی انسان فقہ کی کتاب پڑھتے وقت اس کی اصطلاحات کو سمجھے بغیر ہی کلام کرتا ہے تو یہ بڑی ناسمجھی ہوگی اور وہ خود بھی فقہ کے حوالے سے بڑی بدگمانیوں کا شکار ہو جائے گا۔یہی حال صوفیہ کا بھی ہے کہ مسائل تصوف پر مشتمل ان کی خاص اصطلاحات ہیں ان کو جانے بغیر کتب تصوف کا مطالعہ مقصود تک لے جانے کے بجائے منزل سے بھٹکا سکتا ہے۔امام ابوالقاسم قشیری فرماتے ہیں:

وهذة الطائفة يستعملون ألفاظاً فيما بينهم، قصدوا بها الكشف عن معانيهم لأنفسهم، والإجمال والستر على من باينهم في طريقتهم؛ لتكون معاني ألفاظهم مستبهمة على الأجانب، غيرة منهم على أسرارهم أن تشيع في غير أهلها (۱)

صوفیہ کی جماعت اپنے لیے ایسے الفاظ استعمال کرتی ہے جن کے معانی کا کشف صرف انہی پر ہو اور جو ان کے طریقے سے الگ ہیں ان پر وہ بات مجمل اور مخفی رہ جائے تا کہ ان الفاظ کے معانی غیروں پر مبہم رہ جائیں، وہ ایسا اس غیرت کی وجہ سے کرتے ہیں کہ کہیں ان کے رموز واسرار نا اہلوں تک نہ پہنچ جائیں۔

مثلاً ''فنا'' صوفیہ کی ایک اصطلاح ہے جس کے مختلف درجے ہیں، مختلف معانی ہیں اور وہ

---

(۱) الرسالۃ القشیریۃ، باب تفسیر الفاظ تدور بین ہذہ الطائفۃ (ص:۳۰)

سارے معانی شرعا درست ہیں مثال کے طور پر اپنے ارادے اور اپنی خواہش سے فنا، نفس کی پیروی سے فنا وغیرہ اور انہی معانی میں ایک معنی یہ بھی ہے کہ بندے پر ایک ایسی حالت طاری ہو جائے جس میں تجلیات الٰہیہ کا ایسا غلبہ ہو کہ خود اس کو اپنے وجود کی بھی خبر نہ رہ جائے بلکہ صرف وجود حق تعالیٰ رہ جائے، اور وہ اس وجود ازلی کی طرف پلٹ جائے جب کہ کَانَ اللّٰهُ وَ لَمْ یَکُنْ مَعَهٗ شَیْءٌ کا عالم تھا کہ اللہ تو موجود تھا لیکن اس نے ابھی کسی کو جامۂ وجود عطا نہیں کیا تھا، اس کو شیخ ابن تیمیہ نے فنائے شہودی کہا ہے، یہ معنی بھی شرعا درست ہے، اب اگر کوئی صوفیہ کی اس اصطلاح سے واقف نہیں ہوتا ہے تو اس اصطلاح کو حلول سمجھ بیٹھتا ہے اور صوفیہ کو حلولی قرار دیتا ہے۔ جب کہ ان کا حلول واتحاد سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں۔ اس حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہوئے حافظ ابن قیم جوزیہ لکھتے ہیں:

فاياک ثم إياک و ألفاظ المجملة المشتبهة التی وقع اصطلاح القوم عليها، فإنها أصل البلا، وهی مرد الصديق و الزنديق، فاذا سمع الضعيف المعرفة والعلم بالله لفظ اتصال، وانفصال، ومسامرة، ومكالمة وأنه لا وجود فی الحقيقة إلا وجود الله وأن وجود الكائنات خيال ووهم وهو بمنزلة وجود الظل القائم بغيره، فسمع منه ما يملأ الآذان من حلول واتحاد وشطحات، والعارفون من القوم أطلقوا هذه الألفاظ ونحوها، وأرادوا بها معانی صحيحة فی نفسها فغلط الغالطون فی فهم ما أرادوا ونسبوهم إلى الحادهم وكفرهم۔

صوفیہ کی اصطلاح میں آنے والے مجمل اور مشتبہ الفاظ سے مکمل طور سے ہوشیار رہو، اس لیے کہ وہ بلاؤں کی جڑ ہے- انہیں کی وجہ سے آدمی صدیق سے زندیق ہو جاتا ہے- اسی لیے اللہ کی کم معرفت اور اس کا کم علم رکھنے والا بندہ جب اتصال، انفصال، مسامرۃ (بات چیت) اور مکالمہ کے لفظ کو سنتا ہے اور یہ سنتا ہے کہ حقیقت میں صرف اللہ کا وجود ہے اور کائنات کا وجود وہم وخیال ہے، وہ ظلّی وجود کے درجے میں ہے جو غیر سے قائم ہے، تو اس سے حلول، اتحاد اور شطحات جیسی کانوں پر گراں بار باتیں سننے میں آتی ہیں، جب کہ صوفیۂ عارفین نے ان الفاظ کو بول کر بذاتہ صحیح معانی مراد لیے ہیں، ان کی مراد کو سمجھنے میں غلطی کرنے والے غلطی کر گئے اور ان کو کفر والحاد سے منسوب کر دیا-(۱)

۱۳- دلائل صوفیہ کے درجات

کسی بھی موقف کو ثابت کرنے کے لیے عام علمائے دین کی طرح صوفیہ بھی قرآن وسنت

---

(۱) مدارج السالکین، فصل قال الدرجۃ الثالثۃ صفاء اتصال (۳/ ۱۵۲)

اوراجماع سے تمام طرق استنباط کی رعایت کرتے ہوئے استدلال کرتے ہیں، یوں ہی وہ فقہا کے طرز پر قیاس بھی کرتے ہیں، کہیں وہ استحسان اور مصالح مرسلہ کا بھی سہارا لیتے ہیں اور کہیں وہ کشف کا بھی استعمال کرتے ہیں، اوراس میں ان کو کوئی باک نہیں ہوتا کیوں کہ وہ کشف جو قرآن وسنت اور دین کی کسوٹی پر کھرا اترتا ہے وہ ان کے لیے ایسے ہی دلیل کا درجہ رکھتا ہے جیسے فقہا کے لیے قیاس، اور جس طرح قیاس صاحب قیاس اور ان کے متبعین کے لیے دلیل ہوا کرتا ہے عالَم کے لیے نہیں، یوں ہی کشف بھی صاحبانِ کشف اور ان کے متبعین کے لیے دلیل ہوتا ہے عالَم کے لیے نہیں اور نہ وہ اپنے کشف پر عمل کے لیے دوسروں کو پابند بناتے ہیں، ویسے بھی قیاس ثمرۂ عقل ہے اور کشف ثمرہ روح اور روح بہر حال عقل سے اعلیٰ ہے لہٰذا اس کے ثمرات بھی عقل کے ثمرات سے اعلیٰ ہوں گے، ہاں یہ ضرور ہے کہ دونوں جگہ التباس کا امکان موجود ہے۔ اس کے ساتھ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ عقل پرست (Rationalists) قیاس کو ترجیح دیتے ہیں جب کہ اصحاب حال (Spiritualists) کشف کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں، صوفیہ کے اس منہج سے ناآشنائی کی بنا پر بھی بہت سے لوگ ان پر اعتراض کرتے ہیں اور غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کشف صوفیہ کے استشہاد سے متعلق شیخ ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

> ارباب اشارات جو لفظی مدلول کو ثابت رکھتے ہوئے اشاری معنی قیاس واعتبار کے طور پر سمجھتے ہیں، یہ فقہا کی طرح ہیں، اگر اشارہ درست اور صحیح ہو تو یہ معنی لینا درست ہے۔(۱)

ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

> اس بات میں کوئی شبہہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ اولیا اور صالح بندوں کے دلوں پر ان کے قلوب کی طہارت کی وجہ سے وہ علوم کھولتا ہے جو دوسروں پر نہیں کھولتا۔(۲)

یوں ہی صوفیہ اپنی کتابوں میں استدلال کے طور پر نہیں بلکہ تحریر وتوضیح کے طور پر بعض روایات اور واقعات ذکر کرتے ہیں اور ان کو ذکر کرتے وقت ان کے مختلف الفاظ ہوتے ہیں مثلاً ''حکایت ہے کہ...''، ''منقول ہے کہ...''، ''خبروں میں آیا ہے...''، ''کہا گیا ہے...'' وغیرہ، اس طرح کے الفاظ کے بعد وہ جو روایتیں اور واقعات ذکر کرتے ہیں ان کے حوالے سے ان کا یہ دعوی نہیں ہوتا کہ وہ سچے ہیں یا جھوٹے، بلکہ وہ محض قصے ہو سکتے ہیں جن کا خارج میں سرے سے کوئی وجود ہی نہ ہو اور بطور مثل ومثال ہو سکتے ہیں۔ ان واقعات سے ان کا مقصود کسی امر غیر ثابت کا اثبات

---

(۱) مجموع الفتاویٰ، کتاب توحید الربوبیۃ ج:۱/ جز:۲،ص:۱۸

(۲) مجموع الفتاویٰ، ج:۸، جز:۱۳،ص:۱۰۹

یا کسی نہی کی حرمت پر استدلال نہیں ہوتا، صوفیہ احکام کے کسی بھی درجے میں بطور استدلال اس قسم کے واقعات کو پیش نہیں کرتے بلکہ وہ ان واقعات کو احکام شریعت وطریقت میں سے کسی بھی ثابت شدہ امر کی مزید تفہیم وتوضیح یا ترغیب وترہیب کے لیے ذکر کرتے ہیں یا پھر ان واقعات وروایات و امثال میں کوئی لطیف بات ہوتی ہے جو سالک کے کسی حال وواقعہ کے مناسب یا اس کی شرح کرنے والی ہوسکتی ہے یا ان میں کوئی ایسا اشارہ ہوتا ہے جو راہ سلوک میں مہمیز کرنے والا ہوتا ہے اس لیے ان کو ذکر کرتے ہیں۔ بعد میں رسم پرست لوگ ان روایات وواقعات کو قرآن وحدیث کی طرح محکم سمجھ کر ان سے احکام میں استدلال شروع کر دیتے ہیں اور اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی گم راہی کا ذریعہ بنتے ہیں۔ یوں ہی جو لوگ صوفیہ کے منہج سے ناواقف ہوتے ہیں وہ لوگ اس طرح کی روایات کو دیکھ کر چیں بجبیں ہوجاتے ہیں اور ان پر انکار شروع کر دیتے ہیں۔

صوفیہ کی کتابوں میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ نفس وشیطان کی مخالفت اور حکم ربانی کی اطاعت وفرماں برداری کے سلسلے میں قرآن واحادیث صحیحہ سے استدلال کے علاوہ بعض ایسے واقعات بھی ذکر کر دیتے ہیں جن میں سالک کے لیے کوئی نکتہ تو موجود ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی اس میں کوئی ایسا پہلو بھی ہوتا ہے جس میں کوئی شرعی نقص ہوتا ہے لیکن وہ نفس وشیطان کی مخالفت میں ایسے مغلوب و مدہوش ہوتے ہیں کہ اس میں موجود شرعی نقص سے غلبۂ حال میں غافل ہوکر اس میں موجود نکتے کو پانے کے لیے تیزی سے بڑھتے ہیں۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ اس میں واقع شرعی نقص میں گرفتار ہیں بلکہ اس وقت ان کی مثال اس فرماں بردار غلام کی ہوتی ہے جو اپنے آقا کی خدمت میں ہمہ وقت کمر بستہ اور اس کے حکم پر سبقت کرنے والا ہو اور اس کا آقا اس کو ایسی جگہ جا کر کسی چیز کو لانے کا حکم دے جہاں قدم پھسل جاتے ہوں لیکن وہ اپنی چابک دستی کی وجہ سے بغیر کسی لغزش کے اس کام کو انجام دے دے اور دوسرے غلام کے قدم وہاں پر پھسل جائیں۔ بالکل اسی طرح وہ صوفی جو اس طرح کے واقعات میں موجود نکات کی طرف لپکتا ہے وہ تو اپنا مقصود حاصل کر لیتا ہے اور تیز رفتار سالکین بھی اپنی مراد حاصل کر لیتے ہیں لیکن ناقصین پھسل جاتے ہیں۔ یہ نکتہ بہت اہم ہے جسے صوفیہ کی کتابوں کے مطالعہ اور ان سے استفادہ کے وقت لازمی طور پر پیش نظر رکھنا چاہیے۔

۱۴۔ عام خاص اور مطلق ومقید کی معرفت

کسی بھی کلام کو سمجھنے میں عام خاص اور مطلق ومقید کی فہم کا بڑا رول ہے۔ چنانچہ جس طرح فقہ ظاہر میں عام خاص اور مطلق ومقید کو بڑا اہم مقام حاصل ہے ویسے ہی صوفیہ کے کلام کی صحیح فہم کے لیے بھی صوفیہ کے عام وخاص اور مطلق ومقید کی معرفت بہت ضروری ہے۔ بسا اوقات صوفیہ کی کوئی بات لفظ عام میں ہونے کے باوجود وہ مخصوص منہ البعض ہوتی ہے لیکن

اسے عام سمجھ لیا جاتا ہے اور پھر لوگ غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں لیکن جو لوگ علم تصوف سے تعلق رکھنے والے ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ کون سے مسائل خاص ہیں اور کون سے عام، یہی معاملہ مطلق ومقید کا بھی ہے کہ فقہ کی طرح تصوف میں بھی مطلق ہمیشہ اپنے اطلاق پر نہیں ہوتا بلکہ بسا اوقات مقید ہوتا ہے اور کبھی اپنے اطلاق پر بھی جاری ہوتا ہے۔اس جانب توجہ دلاتے ہوئے حافظ ابن قیم لکھتے ہیں:

فاعلم أن فی لسان القوم (أی الصوفیة) من الاستعارات وإطلاق العام وإرادة الخاص، وإطلاق اللفظ وإرادة الإشارة دون حقیقة معناه، ما لیس فی لسان أحد من الطوائف غیرهم۔ ولهذا یقولون نحن أصحاب إشارة لا أصحاب عبارة والإشارة لنا والعبارة لغیرنا۔ وقد یطلقون العبارة التی یطلقها الملحد ویریدون بها معنی لا فساد فیه۔ وصار هذا سببا لفتنة طائفتین: طائفة تعلقوا علیهم بظاهر عباراتهم فبدّعوهم وضلّلوهم، وطائفة نظروا إلی مقاصدهم ومغزاهم فصبوا تلک العبارات وصححوا تلک الإشارات فطالب الحق یقبله ممن کان ویرد ما خالفه علی ما کان۔

ذہن نشین رہے کہ صوفیہ کے یہاں استعارات ہوتے ہیں، وہ عام بول کر خاص مراد لیتے ہیں اور لفظ بول کر اشارہ مراد لیتے ہیں، اس کے حقیقی معنی مراد نہیں لیتے - یہ باتیں دوسری جماعتوں میں نہیں پائی جاتیں، اسی لیے وہ کہتے ہیں: ہم اہل اشارہ ہیں، اہل عبارت نہیں، اور یہ کہ ہمارے لیے اشارہ ہے اور دوسروں کے لیے عبارت- وہ لوگ کبھی ملحدین کی عبارتیں بول کر ایسے معانی مراد لیتے ہیں جن میں کوئی فساد نہیں ہوتا اور یہ چیز دو جماعتوں کے لیے آزمائش کا سبب بنی۔ایک وہ جماعت جس نے ان کی ظاہری عبارت کو لے کر ان کو بدعتی اور گم راہ قرار دے دیا، دوسری وہ جماعت جنہوں نے ان کے مقصود ومراد کو دیکھتے ہوئے ان عبارات سے وہ اشارہ لینا صحیح قرار دے دیا۔حق کا طلب گار حق کو قبول کرتا ہے جہاں سے بھی آئے اور جو حق کے مخالف ہو اس کو رد کر دیتا ہے خواہ وہ جس بنیاد پر بھی ہو- (۱)

صوفیہ کی اصطلاح میں کبھی بت سے مراد مرشد لیا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ استعاراتی معنی ہے، کیوں کہ بت اور مرشد دونوں ہی محبوبیت میں شریک ہیں، بت کافروں کا محبوب ہے اور مرشد مرید

---

(۱) مدارج السالکین، فصل قال الشیخ لیس فی المقامات شیء (۳/۳۳۱)

صادق کا۔اور جیسے فنا و بقا، اتصال وانفصال کے الفاظ صوفیہ کے یہاں اپنے عموم کے ساتھ بولے جاتے ہیں لیکن ان کی مراد عام نہیں ہوتی بلکہ ان کی مراد خاص ہوتی ہے جو شرعی طور پر صحیح ہوتی ہے۔

اسی طرح صوفیہ کے یہاں یہ کہا جاتا ہے کہ دو پیر والا کامیاب نہیں ہوتا یا دو پیر سے بیعت درست نہیں ، یہاں لفظ تو مطلق بولا گیا ہے لیکن مراد مقید ہے۔ اور مفہوم یہ ہے کہ دوسرے شیخ سے بیعت ہونے والا اس صورت میں کامیاب نہیں ہوتا جب کہ اس کا پہلا شیخ زندہ ہو اور اس سے فیض اٹھانا بھی ممکن ہو، لیکن اگر شیخ سے فیض اٹھانا ظاہری طور پر ممکن نہ ہو کیوں کہ وہ وفات پا چکا ہے یا دور ہے اور وہاں پہنچنا ممکن نہیں یا پہنچنا دشوار ہے تو دوسرے شیخ سے بیعت درست ہے اور ایسا مرید ضرور کامیاب ہوگا۔ صوفیہ کے یہاں پیر ارادت کے ساتھ پیر تربیت ، پیر صحبت ، پیر تبرک ، پیر خلافت وغیرہ کا ذکر اس حقیقت کو مزید واضح اور موکد کرتا ہے۔

اس لیے مطالعۂ تصوف کے وقت اس اصول کو بھی مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

۱۵۔ رسوم تصوف کے حقائق کی معرفت

جس طرح فقہائے ظاہر بہت سے نئے اعمال کو شریعت سے متصادم نہ ہونے بلکہ مقاصد شریعت کی تحصیل میں معاون ہونے کے سبب بدعت حسنہ کے زمرے میں قرار دیتے ہیں اسی طرح صوفیہ بھی مقاصد طریقت کی تحصیل میں معاون ہونے اور شریعت کے مخالف نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے نئے اعمال و رسوم کو بدعت حسنہ یا سنت حسنہ کے خانے میں رکھتے ہیں، اس طرح کے اعمال ہر زمانے میں ان صوفیہ کے اعلیٰ مقاصد سے بے خبر لوگوں کے یہاں بحث و جدال کا موضوع بنے رہے، اور ایسا کیوں نہ ہوتا کہ فقہائے ظاہر کے نزدیک جو اعمال بدعت حسنہ ہیں وہ خود بھی اختلاف آرا کے شکار رہے ہیں، جب کہ ان کے مقاصد تک رسائی آسان ہے۔ فقہائے باطن کے پیش نظر رہنے والے مصالح کا ادراک فقہائے ظاہر کے مصالح کے ادراک سے کہیں مشکل ہے، اس لیے صوفیہ کے یہاں پائی جانے والی کسی رسم پر اعتراض و انکار میں جلدی کرنے کے بجائے ان کے حقائق تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے، کیوں کہ جب عام مومنین کے افعال پر بدگمانی حرام ہے تو جن کو مقربان الٰہی کے زمرے میں شامل سمجھا جاتا ہو اور جن کے راستے کی پیروی کا حکم دیا گیا ہو ان سے بدگمانی تو اور زیادہ قبیح ہوگی۔

مثلاً صوفیہ متقدمین کے مراسم میں ایک رسم مقراض رانی یا موتراشی ہے۔ یہ بظاہر ایک لغو عمل معلوم ہوتا ہے لیکن صوفیہ کے یہاں یہ ظاہری عمل ایک بڑے باطنی حقیقت کا اشاریہ ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی شیخ کے ہاتھ پر بیعت کر کے میدان سلوک اور قرب ربانی کی راہ میں قدم رکھتا ہے تو شیخ بیعت کے بعد اس کی مونچھوں کے اور سر کے چند بال تراش دیتا ہے۔ بال

چوں کہ زینت کا حصہ ہے اور اس میں ایک قسم کا کبر بھی پوشیدہ ہے، اب مقراض رانی یا موتراشی سے یہ اشارہ ہے کہ اب یہ شخص کبر کی راہ ترک کر کے تواضع کی راہ اختیار کر چکا ہے۔ موتراشی سے ایک اشارہ یہ بھی ہوتا ہے کہ جیسے وہ جانور جس کو حج کے موقع پر قربانی کے لیے خاص کیا جاتا ہے یا ویسے بھی قربانی کے لیے خاص کیا جاتا ہے، اس میں کوئی نہ کوئی نشانی بنا دی جاتی ہے، جس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ قربانی کا جانور ہے اسی طرح بیعت کے بعد مرید کی موتراشی کر کے شیخ یہ اشارہ دیتا ہے کہ یہ وہ بندہ ہے جس نے اپنے نفس کو قرب ربانی کے لیے مجاہدے کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھانے کے لیے تیار کر لیا ہے۔(۱) اسی طرح اور دوسرے صوفیانہ رسوم میں ایسے اعلیٰ باطنی و عرفانی معانی پوشیدہ ہوتے ہیں، جن کے ادراک کے بغیر صوفیہ کی رسموں کی اہمیت کو سمجھنا دشوار ہے اور یہ معرفت صرف مختلف بلاد و امصار کے عرف کے ادراک اور مشائخ صوفیہ کی صحبت سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔

مراسم تصوف کے حقائق کی معرفت کے بعد بھی اگر ہمارا دل مطمئن نہ ہو تو ہمیں ایسے اقوال و اعمال کو فقہائے ظاہر کے اجتہادات کی طرح سمجھ کر چھوڑ دینا چاہیے اور تفسیق و تضلیل کی راہ اختیار نہیں کرنی چاہیے۔ بالفرض صوفیہ اگر اپنی اس نکتہ آفرینی میں خطا پر بھی ہوں، تب بھی حد ادب لازم ہے، کیوں کہ اگر فقہائے ظاہر خطائی الاجتہاد کے سبب گمراہ نہیں ہوتے تو فقہائے باطن خطائی الاجتہاد کے سبب کیوں کر گمراہ ہو سکتے ہیں۔

۱۶۔ صوفیہ کے علوم و حقائق کی معرفت

ہر فن کے کچھ دقائق و حقائق ہوتے ہیں جن سے اس فن کے ماہرین آشنا ہوتے ہیں، ان کی صحبت میں رہے بغیر دوسروں کو ان کی معرفت نہیں ہو پاتی اور صحبت کے بغیر اگر ان کو حاصل کرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں تو اکثر غلط فہمی اور مقصود سے دوری کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا، تصوف کے دقائق و حقائق کی معرفت کے سلسلے میں تو صحبت اور بھی ضروری ہوتی ہے، کیوں کہ دوسرے فنون کے دقائق و حقائق عقل کا فیضان ہوتے ہیں، جب کہ صوفیہ کے دقائق و حقائق روحانی فیوض اور ربانی الہامات ہوتے ہیں جو مصفی و مزکی قلوب پر انعام الٰہی کے طور پر اترتے ہیں۔

چوں کہ تجلی کی تکرار نہیں ہوتی اور نہ قرب الٰہی کی انتہا ہے، نہ قلوب کے احوال یکساں ہوتے ہیں، اس لیے یہ دقائق و حقائق گوناگوں اور نوع بنوع ہوتے ہیں، اب ایسے میں ان دقائق کی معرفت اور زیادہ مشکل ہو جاتی ہے۔ جو لوگ اس حقیقت سے آشنا نہیں ہوتے وہ بسا اوقات ان کا سرے سے انکار کر دیتے ہیں یا پھر اپنے وضع کردہ محدود عقلی معیارات پر پرکھنے کی کوشش

---

(۱) دیکھیے لطائف اشرفی (۱/ ۹۱-۹۴)

کرتے ہیں اوران کے ان اصولوں کے مطابق درست نہ ہونے کی صورت میں وہ ان علوم وحقائق کا ہی سرے سے انکار کر دیتے ہیں ۔ یہ خطا صحبت صوفیہ سے محرومی کے سبب پیدا ہوتی ہے، اس لیے صوفیہ کے احوال طریقت وحقیقت سے تعلق رکھنے والے مسائل اور علوم ومعارف اگر ہماری سمجھ میں نہ آئیں تو ہمیں اپنی کم عقلی بلکہ روحانی زوال کو مورد الزام ٹھہرانا چاہیے جس کی وجہ سے ہم ان اعلیٰ ربانی وروحانی حقائق کے ادراک سے عاجز ہیں اوران کو سمجھنے کے لیے کسی مرد کامل کی صحبت اختیار کرنی چاہیے۔ کیوں کہ کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ جب تک ان کو چکھا نہ جائے تو ان سے آشنائی نہیں ہو پاتی۔

مثلاً صوفیہ کو حاصل ہونے والے کشفی اورلدنی علوم اوراعلیٰ علوم واحوال جن کا تذکرہ کتب صوفیہ میں ملتا ہے جیسے محبت، اس کے درجات اور اس کے اثرات، خوف وخشیت اور اس کے درجات واثرات وغیرہ۔ یہ سب ایسے معارف ہیں جن کی حقیقت تک رسائی کے لیے ہمیں یا تو خود میدان سلوک میں قدم رکھنا ہوگا یا پھر مشائخ صوفیہ اوراہل دل کی صحبت اختیار کرنی ہوگی۔

۱۷۔مصالح مرسلہ کی رعایت

مصلحت مرسلہ فقہا کی اصطلاح میں بندگان خدا کی وہ مصلحت ہے جسے مجتہد کسی حکم میں سمجھتا ہے لیکن شریعت میں اس کے اعتبار اور عدم اعتبار پر کوئی دلیل موجود نہیں ہوتی ۔ (الاستصلاح والمصالح المرسلۃ، شیخ مصطفیٰ زرقاء،ص:۳۹) صحابہ کرام خصوصا خلفائے راشدین نئے مسائل میں مصالح مرسلہ کی بنا پر فتوے دیا کرتے تھے۔گویا زمانہ کے بدلتے ہوئے احوال شرعی احکام کے استنباط کا ایک اہم ذریعہ ہیں۔

جس طرح فقہاے ظاہر بندے کے ظاہر کو قرب خداوندی کے لائق بناتے ہیں اسی طرح صوفیہ بندے کے باطن کو آراستہ کر کے تقرب الی اللہ کے راستے پر گامزن کرتے ہیں، وہ باطن کو مکمل طور سے پاک کرنا چاہتے ہیں۔اس مقصد کی تکمیل کے لیے دوران سلوک صوفی ومرشد اپنے مرید کے حق میں کبھی ایسے مصالح محسوس کرتا ہے جن پر نہ تو صاحب شریعت کی جانب سے کوئی نص ہوتی ہے، نہ ہی قیاس کے لیے کوئی نظیر احسانی ہوتی ہے لیکن وہ مصلحت کسی نص شرعی یا اجماع کے متعارض بھی نہیں ہوتی ایسی صورت میں فقہائے ظاہر کے طرز پر وہ بھی مصالح مرسلہ کی بنا پر بعض احکام طریقت جاری کرتے ہیں۔

یہ مصالح کبھی تو ضروریات کی قبیل سے ہوتے ہیں کہ سالک کی حیات روحانی اور ایک احسانی معاشرے کی تشکیل اور قیام کے سلسلے میں ان سے بے نیازی ممکن نہیں ہوتی ،فقہا کے یہاں اس کی مثال جیسے عہدِ صدیقی میں جمع قرآن، عہدِ فاروقی میں شراب نوشی کی سزا اسی (۸۰) کوڑے کا تعین، حدیث کی صحت وضعف کی تحقیق کے لیے فن جرح وتعدیل کی ایجاد۔کبھی ان مصالح

کا تعلق حاجات سے ہوتا ہے کہ جس سے بے نیازی ممکن تو ہوتی ہے لیکن اس میں حرج اور مشقت پائی جاتی ہے، اربابِ فقہ کے یہاں اس کی مثال جیسے حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں بیت المال کے اخراجات سے خراسان کے راستوں میں مسافر خانوں کی تعمیر۔ اور کبھی ان مصالح کا تعلق تحسینات یعنی ایسے امور سے ہوتا ہے جن سے سالک کی حیات روحانی میں حسن و زینت پیدا ہوتی ہے۔ اہلِ فقہ وافتا کے یہاں اس کی مثال جیسے بیت المال کے اخراجات سے راستوں میں تعمیر کردہ مسافر خانوں وغیرہ میں اقامت کی اعلیٰ سہولیات کی فراہمی وغیرہ۔

اس لیے جب صوفیہ کی کتابوں میں بعض احکام طریقت ایسے نظر آئیں جن پر کوئی نص شرعی موجود نہ ہو لیکن وہ احکام، نصوص شرعی سے متعارض بھی نہ ہوں تو اس پر اعتراض کرنے کے بجائے مصالح مرسلہ کے پہلو کو پیش نظر رکھا جائے اور انکار کرنے کے بجائے فقہ احسانی کے مصالح مرسلہ کے دقائق تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی جائے کیونکہ فقہ اسلامی کے مصالح مرسلہ تک رسائی خود ہی مشکل ہوتی ہے تو فقہ احسانی کے مصالح تک رسائی کتنی دشوار گزار ہوگی، اس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔

۱۸۔ متفق علیہ اور مختلف فیہ مسائل کی رعایت

واصلین الی اللہ چوں کہ مجتہد فی الطریقۃ ہوتے ہیں، اس لیے ان کے یہاں فقہ احسانی میں بھی کچھ مسائل متفق علیہ ہوتے ہیں اور کچھ مختلف فیہ۔ اور یہ اختلاف اصول استنباط، ان کی رعایت اور ان کے انطباقات واطلاقات کی عملی کوششوں کی جہتیں؛ عقلی سطح اور طبائع میں اختلاف کی وجہ سے ہوا کرتا ہے۔ اس طرف قرآن کریم کی اس آیت سے اشارہ بھی ملتا ہے: **قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ** (بنی اسرائیل: ۸۴) فقہائے اسلام کی طرح ان تمام فقہائے احسان کی پرخلوص کوشش یہی ہوتی ہے کہ بندے کو مولیٰ سے ملا دیا جائے، مختلف طرق وسلاسل کے اوراد ووظائف اور تزکیہ نفس کے طریقوں کے حوالے سے پائے جانے والے اختلاف کو اسی پس منظر میں سمجھا جا سکتا ہے۔ کتب تصوف اور احوال صوفیہ کے مطالعے کے وقت سلوک الی اللہ کی عملی کوششوں کے سلسلے میں اگر صوفیہ کے ارشادات مختلف ہوں تو ہمیں ان سے بدگمانی اور تنفر کے بجائے مندرجہ بالا پہلو کو پیش نظر رکھنا چاہیے، اس سے نہ صرف یہ کہ صوفیہ کرام کی اجتہادی عظمتیں منکشف ہوں گی، ان کے حقائق ومعارف کا ادراک ہوگا بلکہ صوفیہ کرام کے فرمان: **الطرق إلى الله بعدد أنفاس الخلائق** کا راز بھی فاش ہوگا اور بندگان الٰہی کو قرب ربانی سے سرفراز کرنے کے سلسلے میں ان مرشدین کرام کی پرخلوص جدوجہد کا بھی اندازہ ہوگا۔

۱۹۔ احتیاط اور تحقیق کے پہلو کی رعایت

صوفیہ کے سلسلے میں ایک بات عام طور سے کہی جاتی ہے کہ وہ احتیاط اور عزیمت پر عمل

کرتے ہیں اور یہ بات اپنی جگہ درست بھی ہے، لیکن اس سلسلے میں یہ حقیقت بھی ذہن نشین رکھنے کی ہے کہ خود احتیاط وعزیمت کے سلسلے میں صوفیہ کے اذواق ومشارب الگ الگ ہوتے ہیں، چنانچہ کسی کے نزدیک اس پہلو میں عزیمت اور احتیاط ہوتا ہے جو دوسرے کے نزدیک رخصت ہے۔

یہاں یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ احتیاط پر عمل کرنے کا قاعدہ صوفیہ کے یہاں اس وقت جاری ہوتا ہے جب کہ صوفی کی متعلقہ مسئلے میں اپنی کوئی تحقیق نہ ہو اور وہ خود صاحب رائے نہ ہو، لیکن وہ صوفی اگر اس مسئلے میں خود محقق اور صاحب رائے ہو تو وہ اس پر عمل کرتا ہے، ہاں اگر تحقیق پر عمل کرنے کی صورت میں کسی مضرت کا خدشہ ہوتا ہے یا تحقیق پر عمل ترک کرنے کی صورت میں کسی زیادہ بڑی احسانی ودعوتی منفعت کی امید ہوتی ہے تو وہ اس پر عمل ترک بھی کر دیتے ہیں۔

اگر کوئی صوفی فقہ احسانی میں کسی ایسے پہلو پر عمل کرتا نظر آئے جس میں بظاہر رخصت کا پہلو ہو تو اس صوفی پر منہج صوفیہ سے انحراف کا الزام لگانے کی بجائے احتیاط و تحقیق دونوں پہلو کو سامنے رکھنا چاہیے تاکہ ہم اپنے آپ کو صوفیہ پر اعتراض وانکار کی نحوست سے بچا سکیں اور ان کے معاملے میں عدل وانصاف پر قائم رہ کر اپنے آپ کو عنداللہ مجرم بنانے سے محفوظ رکھ سکیں۔

۲۰۔ عالم واقعہ: مثال والہام کا پہلو

کتب صوفیہ میں بعض ایسے محیر العقول واقعات ملتے ہیں جن کو عام حالت میں عقل انسانی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی، اس وجہ سے بعض لوگ اس طرح کے واقعات کا سرے سے انکار ہی کر دیتے ہیں۔

جب کہ اس طرح کے واقعات میں غور وفکر کرنے کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ صوفی کی ذات ایک روحانی شخصیت ہے، اس لیے اس کے ذریعے انجام دیے گئے افعال واعمال کی فہم میں بعض روحانی احوال کی رعایت ضروری ہے مثلا صوفیہ کی کتابوں میں اس طرح کے واقعات ملتے ہیں کہ کسی مرید کے لیے کعبۃ اللہ کو حاضر کر دیا گیا۔ اس طرح کے واقعات کو سن کر اور پڑھ کر اعتراض کے بجائے ہمیں اس پہلو پر غور کرنا چاہیے کہ عالم مثال میں اس کی نگاہوں کے سامنے کعبۃ اللہ کو حاضر کر دیا گیا ہو یا بطور کرامت اس مرید کی آنکھوں سے حجابات اٹھا دیے گئے ہوں اور اس نے ارکان حج کو انجام دیا ہو، یا کسی بزرگ نے کسی ایسے بزرگ کا دیدار کیا جس کا زمانہ بہت پہلے گزر چکا ہو، اب ظاہر ہے کہ یہ بات عقلا ناممکن ہے۔ لیکن عالم واقعہ میں یہ بات ممکن ہے۔ ممکن ہے کہ اس بزرگ کی روحانیت جسم مثالی کے ساتھ حاضر ہوئی ہو، یہ بھی ذکر ملتا ہے کہ کسی بزرگ نے کسی کو اپنی عمر کا کچھ حصہ دے دیا۔ شرعی طور پر یہاں بھی اس بات کا امکان موجود ہے کہ اس بزرگ نے اللہ سے دعا کی ہو کہ اے اللہ فلاں شخص کو میری زندگی کا ایک حصہ عطا فرما، اللہ

نے ان کی دعا قبول کر لی اور یہ الہام کیا کہ آپ اس شخص سے کہہ دو کہ میں نے تم کو اپنی عمر کا اپنا حصہ عطا کر دیا۔ اب ظاہر ہے کہ یہ ساری باتیں بطور کرامت ممکن ہے، اللہ تعالیٰ کسی کی بھی دعا کسی بھی وقت قبول کرسکتا ہے اور کسی کے قلب میں الہام فرما سکتا ہے۔

چنانچہ اس طرح کے واقعات اگر کتب صوفیہ میں ملیں تو ان پر اعتراض کرنے کے بجائے عالم مثال، عالم واقعہ، عالم خواب اور کرامت والہام کے امکانات کو مدنظر رکھا جائے تو ہمیں صوفیہ کی روحانی زندگی کے احوال وتصرفات کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

۲۱۔منامی پہلو کی رعایت

خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے(۱) خواب کبھی تو بالکل واضح ہوتا ہے اور کبھی محتاج تعبیر اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس میں بعض حصے بظاہر قابل اعتراض بھی ہوتے ہیں، ایسے خواب میں خصوصاً تعبیر کی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ کتب تصوف میں بعض واقعات ایسے ملتے ہیں جو کبھی محدثانہ حیثیت سے موضوع معلوم ہوتے ہیں اور کبھی تاریخی اعتبار سے غلط نظر آتے ہیں، غیر نبی معصوم نہیں اور کسی سے بھی خطا کا امکان ہی نہیں بلکہ واقع ہے اور اس پر تاریخی شہادتیں موجود ہیں۔ اہل علم تو ان خطاؤں کو دیکھ کر ان شخصیات پر زبان طعن دراز نہیں کرتے بلکہ اس سے ان کے اندر خود احتسابی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور مخلوق کے بالمقابل ہر عیب سے خالق کی پاکی کے یقین میں مزید توانائی پیدا ہوتی ہے لیکن عام لوگ ان لغزشوں کی بنا پر ان شخصیات سے بدظن ہوجاتے ہیں اور پھر شیطان اس درجہ گمراہ کرتا ہے کہ وہ ان کی حق بات قبول کرنے سے بھی سرتابی کرتے ہیں۔ اس لیے صاحبان علم کی یہ ذمہ داری ہے کہ اگر مقتدا شخصیتوں کا کوئی قول وفعل نظر آئے جو خطا معلوم ہو تو عام لوگوں کو گمرہی سے بچانے اور وسوسۂ شیطانی کے سد باب کے لیے ان اقوال وافعال کی ممکنہ توجیہ و تاویل کریں کیوں کہ ہمیں مومنوں سے حسن ظن رکھنے کا حکم دیا گیا ہے چنانچہ کتب تصوف میں اگر کوئی ایسا واقعہ نظر آئے جو روایت ودرایت کے اعتبار سے موضوع ہو تو ہمیں اس علم کے ساتھ کہ یہ واقعہ موضوع ہے یہ پہلو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ہوسکتا ہے کہ وہ واقعہ عالم خواب کا ہو کیوں کہ خواب میں کچھ بھی دیکھنا ممکن ہے اور خواب دیکھنے والے پر اس خواب کی کیفیت اتنی قوی ہو کہ اسے یہ احساس ہی نہ رہ جائے کہ وہ واقعہ خواب کا ہے اور پھر اسے بطور حدیث روایت کر دے۔

یوں ہی کتب تصوف میں اگر کوئی ایسا قصہ نظر آئے جو تاریخی اعتبار سے غلط معلوم ہو تو وہاں بھی ہمیں اس اعتراف کے ساتھ کہ یہ قصہ تاریخی نقطۂ نظر سے درست نہیں ہمیں یہ گوشہ بھی

---

(۱) صحیح البخاري، کتاب التعبیر، باب: الرؤیا الصالحة جزء من ستة وأربعین جزءا من النبوة (۹/ ۳۰)

ذہن میں رکھنا چاہیے کہ ہوسکتا ہے کہ وہ قصہ عالم خواب کا ہو اور کسی ناقل سے بعد میں لفظ خواب لکھنے سے رہ گیا ہو اور پھر نقل در نقل کا سلسلہ چلتا رہا یا قارئین وسامعین کی فہم پر اعتماد کرتے ہوئے لفظ خواب کو حذف کر دیا گیا ہو۔

حضرت داعی اسلام مدظلہ نے ایک موقعہ پر فرمایا کہ حضرت رتن ہندی کی صحابیت محدثین ومورخین کے نزدیک زیر بحث رہی ہے۔اس کے باوجود بہت سے علما ومشائخ نے ان سے تبرکاً روایت بھی لی ہے۔آپ کا ظہور چھٹی صدی ہجری کے اخیر میں ہوا، وفات ساتویں صدی کے شروع میں ہوئی۔آپ کا صحابی ہونا عقلاً بعید، عادۃً محال اور نقلاً خلاف واقع ہے۔ چوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا:**إِنَّ رَأْسَ مِائَةٍ، لاَ يَبْقَى مِمَّنْ هُوَ الْيَوْمَ عَلَى ظَهْرِ الأَرْضِ أَحَدٌ** (متفق علیہ) آج کے دن جو لوگ یہاں موجود ہیں سو سال کے بعد ان میں سے کوئی باقی نہیں رہے گا۔ اس لیے ان کی صحابیت کسی طور پر درست معلوم نہیں ہوتی۔دوسری طرف ان سے بہت سے علما ومشائخ نے تبرکاً روایت کی ہے۔

میں بہت دنوں تک اس مسئلے میں غور وخوض کرتا رہا، بالآخر اس کی توجیہ یہ سمجھ میں آئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان کی صحبت تو واقعی قطعاً ثابت نہیں، البتہ وہ خود ثقہ اور عادل ہیں، اس لیے ان سے بعض علما نے چند حدیثیں روایت کیں اور عدم صحابیت کے باوجود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقلِ روایت کی یوں توجیہ ہوسکتی ہے کہ حضرت رتن ہندی نے عالم واقعہ میں خود کو عہد رسالت میں پایا ہو، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مختلف جنگوں میں شریک رہے ہوں، یہ سب کچھ عالم واقعہ میں ہوا ہو، لیکن اس کی کیفیت ایسی شدید غالب رہی ہو کہ وہ پورے طور پر اس کیفیت سے کبھی باہر نہیں نکل سکے اور زندگی بھر ان کے ذہن پر یہ بات عین واقعہ کے طور چھائی رہی اور وہ اسے بیان کرتے رہے۔اس طرح کے واقعات دوسرے بعض مشائخ کے ساتھ پیش آئے ہیں۔

چوں کہ اس طرح کے واقعات میں طالبین کے لیے بعض ایسے نکات ہوتے ہیں جو ان کو راہ مولی میں ثابت قدمی پر مہمیز کرتے ہیں اس لیے ان کو ذکر کیا جاتا رہا ہے۔

۲۲۔کشف یا الہام کے ذریعے ترجیح کا امکان

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ شریعت وطریقت کے مسئلے میں جواز وعدم جواز کے دونوں پہلو دلائل کی طرف نظر کرتے ہوئے برابر ہوتے ہیں لیکن صوفیہ اپنی جانب سے ان میں سے کسی ایک پہلو کو ترجیح کر دیتے ہیں، اور ترجیح پر بظاہر کوئی دلیل شرعی قائم نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے لوگ چیں بجبیں ہو جاتے ہیں۔ جب کہ در اصل ہوتا یہ ہے کہ اس طرح کی صورتوں میں صوفیہ کے قلب میں کسی ایک پہلو کی ترجیح کا الہام ہوتا ہے یا اس حوالے سے کوئی کشف ہوتا ہے اور اس بنا پر وہ کسی

ایک پہلو کو ترجیح دے دیتے ہیں اور کشف والہام کے ذریعے مسئلے کی ترجیح شرعاً درست ہے، اس کا اعتراف شیخ ابن تیمیہ نے بھی کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

اگر سالک ظاہری شرعی دلائل میں اجتہاد کرے اور ترجیح کی کوئی صورت نظر نہ آئے اور اس وقت ترجیح کے کسی پہلو کا الہام ہو جائے، اس وقت اس کی نیت صالح اور قلب تقویٰ سے معمور ہو تو یہ الہام اس کے حق میں دلیل ہے اور یہ بہت سے کمزور قیاس، ضعیف احادیث اور بے جان استصحاب سے قوی ہے۔(۱)

۲۳۔اقوال کے زمانے کی معرفت

کتب صوفیہ کے مطالعہ کے وقت اکابر صوفیہ کے ایک ہی مسئلے میں دو ایسے اقوال واحوال سامنے آتے ہیں جو باہم متضاد معلوم ہوتے ہیں یا ایک ہی مسئلے میں دو صوفی کے الگ الگ اقوال ہوتے ہیں اور اس طرح تضاد سامنے آتا ہے۔ اس طرح کے اقوال کے درمیان سے تضاد دور کرنے کے لیے اگر اس پہلو پر غور کر لیا جائے کہ ممکن ہے کہ اس مسئلے میں ایک قول اس وقت کا ہو جب وہ صوفی مبتدی یا متوسط تھا منتہی وواصل نہیں ہوا تھا اور دوسرا قول اس زمانے کا ہو جب وہ منتہی وواصل ہو چکا تھا، تو ایسی صورت میں تعارض دور ہو جائے گا۔

۲۴۔اختلاف اشخاص کی بنا پر اختلاف اقوال کی معرفت

کتب صوفیہ میں ایک ہی مسئلے میں اختلاف اقوال کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ایک قول مبتدی کے لیے ہو اور دوسرا متوسط کے لیے اور تیسرا منتہی کے لیے۔ مثلاً حضرت سری سقطی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے: اَلتَّوْبَۃُ أَن لَّا تَنْسَیٰ ذَنْبَکَ۔ (توبہ یہ ہے کہ تم اپنے گناہ کو فراموش نہ کرو)۔ اور حضرت جنید بغدادی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے اَلتَّوْبَۃُ أَن تَنْسَیٰ ذَنْبَکَ۔ (توبہ یہ ہے کہ تم اپنے گناہ کو بھلا دو۔)

بظاہر ان دونوں اقوال میں تعارض ہے لیکن درحقیقت دونوں میں کوئی تعارض نہیں، پہلا قول مبتدی کے لیے ہے اس کو چاہیے کہ وہ ہمیشہ اپنے گناہوں کو اپنی نگاہ کے سامنے رکھے تاکہ گناہ کرنے کی جرأت نہ پیدا ہو اور گناہ کی شامت سے خوف پیدا ہو۔ دوسرا قول منتہی وواصل کے لیے ہے کہ اس کی توبہ یہ ہے کہ اب اس کی نگاہوں کے سامنے توبہ قبول فرمانے والے کے علاوہ کوئی نہ ہو، اگر وہ اب بھی گناہوں کے خیال میں الجھا ہوا ہے تو وہ ابھی واصل کہاں ہے؟(۲)

---

(۱) مجموع الفتاویٰ، علم السلوک، ص: ۴۲ ج: ۶

(۲) مجمع السلوک، جلد اول، زیر بحث: اصول صوفیہ

ان ہی دونوں اقوال کو ہم اقوال کے زمانے کی معرفت کے ضمن میں بھی پیش کر سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ پہلا قول صوفی کے اس زمانے کا ہے جب وہ مبتدی تھا کہ اس نے اپنے حال کی عکاسی کی ہے، جبکہ دوسرا قول صوفی سے اس وقت صادر ہوا جب وہ سلوک کی منزلیں طے کر کے مقام قرب سے ہم کنار ہو چکا ہے اور اس نے اپنے حال کی عکاسی کرتے ہوئے کہا ہے۔

۲۵۔اختلاف جہات کی معرفت

فقہ اسلامی کو سمجھنے کے لیے اختلاف جہات کو جاننا ضروری ہوتا ہے کیوں کہ ایک چیز ایک جہت سے حرام ہو سکتی ہے جب کہ دوسری جہت سے فرض، اسی طرح فقہ احسانی میں درک حاصل کرنے کے لیے بھی اختلاف جہات کی معرفت اشد ضروری ہے، مثلاً صوفیہ کا ارشاد ہے: **من عرف اللہ کَلَّ لسانہ** جب کہ دوسرا قول ہے: **من عرف اللہ طال لسانہ**۔ دونوں اقوال میں بظاہر تضاد ہے لیکن درحقیقت نہیں، حضرت مخدوم شاہ مینا قدس سرہ ان دونوں اقوال کے مابین سے رفع تعارض فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ پہلے قول کا تعلق معرفت ذات سے ہے جب کہ دوسرے کا معرفت صفات سے۔(۱)

۲۶۔وقوع شبہہ کا امکان

کبھی صوفیہ سے بعض اقوال ایسے بھی صادر ہوتے ہیں جو ان کے شبہے میں پڑ جانے اور حق کے ملتبس ہو جانے کی بنا پر ہوتے ہیں مثلاً کبھی کوئی صوفی یہ بول پڑتا ہے کہ میں نے اللہ کو دیکھا لیکن درحقیقت ہوتا یہ ہے کہ وہ اللہ کو نہیں دیکھتا بلکہ اپنے اعمال صالحہ میں سے کسی عمل کا نور دیکھتا ہے اور شبہے میں پڑ کر یہ گمان کر بیٹھتا ہے کہ اس نے اللہ کو دیکھ لیا۔ اس مقام پر مرشد کی سخت ضرورت ہوتی ہے، وہ رہنمائی کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ جو اس نے دیکھا ہے نور خدا نہیں بلکہ اس کے فلاں عمل کا نور ہے۔ مذکور ہے کہ حضرت خواجہ ابوسعید ابوالخیر قدس سرہ کے کسی مرید نے ایک مرتبہ رأیت ربی کہہ کر نعرہ مارا تو آپ نے اس کو متنبہ کیا اور فرمایا کہ جو تم نے دیکھا ہے وہ تمہارے وضو کا نور ہے۔(۲)

کبھی کوئی صوفی یہ کہہ اٹھتا ہے کہ میں نے چشم سر سے رب تعالیٰ کو دیکھا جب کہ دنیا میں چشم سر سے اللہ تعالیٰ کا دیدار ممکن نہیں، یہاں بھی وہ شبہے میں پڑ جاتا ہے اور حق اس پر ملتبس ہوتا ہے اس لیے اس طرح کی بات اس کی زبان سے نکلتی ہے، قطب ربانی سیدنا شیخ عبد القادر جیلانی قدس سرہ سے استفادہ کر کے شیخ ابن تیمیہ اس موضوع کا خلاصہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

(۱) مجمع السلوک، جلد دوم، زیر بحث: حقیقت معرفت

(۲) مکتوبات صدی، ص: ۵۷ب

اس میں کبھی کبھی بعض سالکین کو شبہہ ہوجاتا ہے، وہ اپنے دل سے کچھ چیزوں کا مشاہدہ کرتے ہیں تو یہ گمان کر لیتے ہیں کہ وہ خارج میں موجود ہے اور اسی بنا پر متقدمین و متاخرین کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ معرفت، ذکر الٰہی اور محبت الٰہی ان کے دل میں غالب ہوجاتی ہے تو دل کو حاصل ہونے والی حالت کی وجہ سے وہ اپنے شہود سے غائب ہوجاتے ہیں اور یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ انھوں نے آنکھوں سے دیدار کر لیا ہے حالاں کہ دیدار الٰہی دنیا میں صرف دل سے ممکن ہے۔(۱)

اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ صوفیہ کی بات تو فی نفسہ بالکل درست ہوتی ہے لیکن کلام کے پس منظر اور گفتگو کے شان نزول کو نہ سمجھنے کی وجہ سے دوسرا شخص شبہے میں پڑ جاتا ہے اور جلد بازی میں صوفیہ پر حکم لگا دیتا ہے۔ چنانچہ ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ ان کے پاس یہ استفتا آیا کہ ایک شخص اکثر یہ جملہ کہتا ہے میں تیرا بندہ نہیں، تو میرا رب نہیں، پھر میں تیری اطاعت کیوں کروں؟ فقہائے زمانہ عموماً کفر کا فتویٰ صادر کر چکے تھے لیکن جب مسئلہ ان کے پاس آیا تو انھوں نے پوچھا کہ یہ جملہ کون کہتا ہے؟ پتہ چلا کہ ایک شخص ہے جو صوفی سے مشہور ہے وہ ایسا کہتا ہے۔ وہ بزرگ ان کے پاس گئے اور اس سے پوچھا کہ آپ ایسا کیوں کہتے ہیں یہ تو کفریہ جملہ ہے؟ اس نے جواب دیا کہ جب میرا نفس مجھ کو اپنی اطاعت کی رغبت دلاتا ہے تو اس وقت میں اس سے کہتا ہوں کہ تو میرا رب نہیں، میں تیرا بندہ نہیں پھر تیری اطاعت کیوں کروں۔ اب آپ ہی بتائیں کہ یہ ایمان ہے یا کفر؟

اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس صوفی کے جملے کو سن کر لوگ اس لیے شبہے میں گرفتار ہوئے کہ ان کو کلام کی وجہ معلوم نہیں تھی، ورنہ وہ جملہ فی نفسہ بالکل درست تھا۔

ایسا ہی شبہ کبھی کبھی کسی شرعی حکم کے انجام نہ دینے پر بھی ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی عورت حالت حیض میں ہو اور دوسرے کو یہ معلوم نہ ہو کہ وہ اس وقت کس حالت میں ہے تو وہ بھی اس پر ترک صلاۃ کا شرعی الزام لگائے گا، لیکن ایسا شبہ اس لیے پیدا ہوا کہ اس کو صورت حال سے آگاہی نہیں ہے۔ یوں ہی بعض مغلوب صوفیہ پر ظاہری طور پر ترک صلاۃ کی وجہ سے لوگ ترک صلاۃ کا شرعی الزام عائد کرتے ہیں، لیکن حقیقت میں وہ اس الزام سے بری ہوتے ہیں اور دراصل لوگ شبہے میں گرفتار ہوتے ہیں اور ان کو اس صوفی کے حوالے سے حقیقت امر کی معرفت نہیں ہوتی، مثلاً حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ کے ایک مرید جن کا نام قضیب البان تھا، وہ اپنے

---

(۱) مجموع الفتاویٰ: ج: ۳، جزء: ۵، ص: ۲۴۱-۲۴۲

شیخ کی صحبت میں ہمہ وقت جسم ظاہری کے ساتھ نہیں رہتے تھے لیکن جسم مثالی سے ہمیشہ اپنے شیخ کی خانقاہ میں موجود رہتے، اب دیکھنے والے یہ سمجھتے کہ وہ خانقاہ میں موجود ہیں اور چوں کہ وہ جسم حقیقی سے یہاں موجود نہیں تھے اور نماز جسم ظاہری پر فرض ہے جسم مثالی پر نہیں، اس لیے ان کو نماز ادا کرتے ہوئے نہیں دیکھا جاتا اور لوگ ان کو تارک الصلاۃ سمجھتے، لوگوں نے اس مسئلے کو سیدنا غوث اعظم سے ذکر کیا تو آپ نے حقیقت سے پردہ اٹھایا اور فرمایا کہ وہ جسم مثالی سے خانقاہ میں رہتے ہیں، اس لیے ان پر نماز فرض نہیں۔ یہ شبہے کی ایک صورت ہوگئی۔(۱)

ایک دوسرا واقعہ جس سے ایک اور شبہے کی وضاحت ہوتی ہے، یہ ہے کہ ایک بزرگ تھے حضرت معشوق طوسی، وہ بظاہر تارک الصلاۃ تھے، ایک مرتبہ علما ان کو زبردستی تیار کر کے نماز کے لیے لے گئے، آپ نے فرمایا کہ میں نماز تو پڑھوں گا مگر سورۂ فاتحہ نہیں پڑھوں گا، لوگوں نے کہا یہ کیسے ہوگا ،اصرار کیا گیا تو فرمایا کہ اچھا سورۂ فاتحہ تو پڑھوں گا مگر اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ہیں کہوں گا، لوگوں نے کہا یہ کیسے ہوگا، آخر کار آپ نے تکبیر تحریمہ کہہ کر سورۂ فاتحہ کی تلاوت شروع کی لیکن جیسے ہی اِیَّاكَ نَعْبُدُ کے جملے کو ادا کرنا چاہا تو ہر بن مو سے خون کے فوارے پھوٹ پڑے۔

ایسا کیوں ہوا، دراصل ان پر خشیت الٰہی کی تجلی پڑنے کی وجہ سے ایک حال طاری ہو گیا تھا کہ میں اللہ کی بارگاہ میں کھڑے ہو کر کیسے اِیَّاكَ نَعْبُدُ کہوں جب کہ میں بندگی تو نفس کی کرتا ہوں، استعانت بھی اسی سے کرتا ہوں، یہ اللہ کی بارگاہ میں کھڑے ہو کر کذب بیانی ہوگی، اور یہ حال اتنا غالب تھا کہ اس کی وجہ سے یہ جملہ ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے، اسی وجہ سے آپ نے خود اس مسئلے کی وضاحت کی اور فرمایا کہ مجھ کو چھوڑ دو میں حائضہ عورت کی طرح ہوں۔(۲)

شبہے کی ایک تیسری صورت یہ ہے کہ فرض کیجیے ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے اور عین نماز کی حالت میں اس پر ذات وصفات کی کوئی تجلی پڑی اور اختیار کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ غلبۂ حال میں داخل ہو گیا یہاں تک کہ وہ بعد میں بھی خود کو حالت نماز میں ہی تصور کرنے لگا، اب ظاہر ہے کہ جس وقت اس پر تجلی پڑی تھی وہ نماز کی حالت میں تھا لیکن اس وقت اگر چہ وہ نماز کی حالت میں نہیں ہے لیکن غلبۂ حال کی وجہ سے خود کو عین نماز کی حالت میں ہی سمجھ رہا ہے اور اس طرح اس سے ترک صلاۃ ہو رہا ہے، لیکن ایسے شخص کو دیکھنے والے یہی سمجھیں گے کہ یہ تارک صلاۃ ہے جب کہ حقیقت میں وہ تارک صلاۃ نہیں بلکہ وہ معذور ہے اور لوگ اس کی حالت سے ناواقفیت کی وجہ سے شبہے میں گرفتار ہیں۔

شبہے کی ایک چوتھی صورت یہ ہے کہ فرض کریں ایک شخص نے خواب یا عالمِ واقعہ میں یہ دیکھا

---

(۱) نفحات الانس، ص: ۴۷۷

(۲) فوائد الفواد، ص: ۱۰۰۹-۱۰۱۱،

کہ وہ اٹھا، اس نے اہتمام سے وضو کیا اور جا کر مسجد میں نماز ادا کی اور پھر واپس آ گیا۔ عالم خواب یا عالمِ واقعہ کا یہ قصہ اس کی قوت خیالیہ پر ایسا غالب ہوا کہ جب وہ بیدار ہوا تو جو نماز اس نے عالم خواب یا واقعہ میں ادا کی تھی اس کا وقت باقی تھا لیکن پھر بھی اس نے وہ نماز ادا نہیں کی کیوں کہ اسے یقین تھا کہ وہ نماز ادا کر چکا ہے۔ اس کے ذہن و دماغ میں عالم خواب یا عالم واقعہ کا حادثہ اس طرح چھایا تھا کہ اس کو یہ احساس ہی نہیں رہا کہ وہ واقعہ عالم خواب یا عالم واقعہ کا ہے، بیداری اور ہوش وحواس کا واقعہ نہیں ۔ اب اس کو دیکھنے والے لوگ یہ سمجھیں گے کہ اس نے نماز ترک کر دی حالانکہ وہ تو یہاں معذور ہے، اور لوگوں کا اس پر اعتراض حقیقت حال سے ناواقفیت کی وجہ سے ہے۔

لوگوں کی جانب سے شبہے میں پڑنے کی یہ چند امکانی صورتیں پیش کی گئیں ہیں، ان کے علاوہ اور بہت سی صورتیں ہو سکتی ہیں۔

لہٰذا وقوع شبہہ کے ہر پہلو کی رعایت کرتے ہوئے حکم لگانے میں جلد بازی سے گریز کرنا چاہیے اور اہل اللہ پر اعتراض سے اپنے آپ کو بچانا چاہیے۔ واضح رہے کہ ہماری یہ ساری گفتگو حقیقی صوفیہ کے بارے میں ہے، مدعیان تصوف کے بارے میں نہیں۔

۲۷۔ اصل حکم اور سد ذرائع کی رعایت

جس طرح کہ فقہائے ظاہر کبھی اصل حکم پر فتویٰ دیتے ہیں اور کبھی سد ذرائع پر مثلاً عورتوں کی مزارات پر حاضری کے سلسلے میں بعض فقہا اصل حکم پر فتویٰ دیتے ہوئے جواز کا قول کرتے ہیں اور بعض مفاسد کے پیش نظر اس کو ممنوع قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح صوفیہ بھی چونکہ فقیہ باطن ہونے کے ساتھ ساتھ فقیہ ظاہر بھی ہوتے ہیں اس وجہ سے ان کے یہاں بھی بعض مسائل میں اصل حکم پر عمل پایا جاتا ہے مثلاً آلات لہو ولعب کی حرمت لذاتہ نہیں بلکہ لغیرہ ہے آلات میں لذاتہ کوئی حرمت نہیں یہ فقہا کے یہاں مسلم ہے، اس لیے جہاں آلات لہو ولعب کا استعمال لہو ولعب کے لیے نہ ہو رہا ہو تو وہاں وہ اصل حکم پر عمل کرتے ہوئے ان آلات کے استعمال کے سلسلے میں جواز کے قائل ہوتے ہیں، لیکن فقہا عموماً سد ذرائع کے لیے حرمت کا فتویٰ دیتے ہیں۔ اب اگر کوئی عام انسان صوفیہ کی کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے فقہا کے ساتھ صوفیہ کا ٹکراؤ نظر آتا ہے، جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں، حقیقت یہ ہے کہ مسئلے کے دو پہلو تھے۔ فقہا نے سد ذرائع کے اصول کے تحت حکم لگایا جب کہ صوفیہ نے اپنے احوال اور اصل حکم کے پیش نظر عمل کیا۔

اسی طرح کبھی ایسا ہوتا ہے کہ فقہا کے یہاں کوئی مسئلہ اصل حکم کے لحاظ سے جائز وثابت اور مسنون ومستحب ہوتا ہے لیکن بعض احسانی احوال کے پیش نظر اور احسانی سد ذرائع کے مدنظر وقتی طور پر اس مسئلے میں ناجائز ہونے کا قول کرتے ہیں۔ مثلاً صوفیہ پر یہ الزام رہا ہے کہ وہ نکاح کی ترغیب

نہیں دلاتے یا کسی مرید کے لیے کسی صوفی کا یہ قول مل جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے مرید کو نکاح سے منع کر دیا، اب اس پر ظاہر بیں نگاہیں معترض ہو جاتی ہیں کہ یہ تو شریعت سے اعراض ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں، صوفیہ سب سے زیادہ سنت پر عمل میں سبقت کرنے والے ہیں، ہوتا دراصل یہ ہے کہ صوفیہ مرید سالک کے احوال میں یہ دیکھتے ہیں کہ فساد زمانہ اور فساد زناں کی وجہ سے اس کا نکاح کرنا اس کو تعلق باللہ میں کمزور کر دے گا اس لیے احسانی مصالح کی تحصیل اور احسانی مفاسد کے سد باب کے لیے اسے نکاح سے منع کرتے ہیں، ان کا حکم شخصی ہوتا ہے عمومی نہیں۔

مثلاً کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی طالب اپنے نفس کے تزکیے کے لیے کسی مرد صالح کے پاس حاضر ہوتا ہے اور پھر وہ اپنے مشن میں لگ جاتا ہے اور اس کی وجہ سے نکاح کی جانب اس طالب کی توجہ نہیں ہوتی اور نہ اس کے شیخ اس کو اس جانب متوجہ کرتے ہیں، کیوں کہ وہ ابھی علم الاحسان کی تحصیل میں مصروف ہے۔ لیکن یہی بات ناقدین کو بری لگ جاتی ہے اور وہ صوفیہ پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ نکاح پر نہیں ابھارتے، جب کہ ہر شئ کا ایک مقام ہوتا ہے اور ہر مقام کا ایک حکم۔ جب مریض جسمانی ہسپتال پہنچتا ہے تو ڈاکٹر اس کے سامنے علم کی فضیلت پر گفتگو نہیں کرتا بلکہ وہ اس مریض کی صحت کی بحالی میں لگا رہتا ہے لیکن اس کو فضیلت علم کا منکر نہیں کہا جاتا تو پھر کسی خیر کے ترک کی بنا پر صوفیہ پر یہ الزام کیوں دھرا جاتا ہے کہ وہ اس کے منکر ہیں۔

یوں ہی ایک طالب علم فقہ اسلامی کی تحصیل کے لیے مدارس کا رخ کرتا ہے تو وہاں کے اساتذہ نکاح کی فضیلت پر گفتگو نہیں کرتے، بلکہ تحصیل علم کی ترغیب دلاتے ہیں تو کیا ایسے میں ان فقہائے مدارس پر بھی وہی الزام چسپاں کیا جائے جو صوفیہ پر کیا گیا ہے؟

بات دراصل یہ ہے کہ طالب علم کے سامنے اگر نکاح کے فضائل ہی بیان کیے جائیں تو وہ ایک روز طلب علم چھوڑ کر نکاح کرنے کے لیے نکل جائے گا اور اس طرح ایک سنت کی تکمیل کی آڑ میں عظیم ترین فضائل ومناقب کی تحصیل سے محروم ہو جائے گا۔

اس لیے مطالعۂ تصوف کے وقت اصل حکم پر عمل اور سد ذرائع کے پہلو کا لحاظ از حد ضروری ہے اس پہلو کی رعایت سے ہمیں صوفیہ اور تصوف کو سمجھنے میں بہت مدد ملے گی۔

خلاصۂ گفتگو

کتب تصوف کے مطالعے اور صوفیہ کی صحبت سے نظری استفادے کے سلسلے میں یہ چند باتیں سرسری طور پر ذکر کر دی گئی ہیں۔ مطالعہ تصوف یا صوفیہ کی بابرکت مجالس سے فیض اٹھاتے وقت اگر ان باتوں کو پیش نظر رکھا جائے تو ہم بہت سی بدگمانیوں، الجھنوں اور غلط فہمیوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھتے ہوئے ان سے صحیح منہج پر استفادہ کر سکتے ہیں اور ان کے حوالے سے اعتدال وانصاف

والا موقف قائم کر سکتے ہیں۔اور اگر ہم نے ان باتوں کی رعایت نہیں کی اور اپنی فکر اور اپنے اصولوں کو ہی حاکم بنا کر فیصلے کیے تو ہمیں صوفیہ ہی نہیں بلکہ کسی بھی جماعت اور کسی بھی فن کے حوالے سے بدگمانیاں ہی حاصل ہوں گی اور کبھی بھی ہم صحیح نتیجے تک نہیں پہنچ سکیں گے، جب کہ صحیح فہم حاصل کرنے کے ذرائع کو استعمال نہ کرنا اور اس کے نتیجے میں غلط رائے قائم کر لینا ایک شرعی و اخلاقی جرم ہے اور اس کے ذرائع کو بروئے کار لا کر صحیح موقف قائم کرنا ایک شرعی و اخلاقی فریضہ اور دین و دیانت کا تقاضا ہے۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین و دیانت کے تقاضوں کو پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اللہ کے محسن بندوں کے علوم و معارف اور احوال و اسرار سے وافر حصہ عطا فرمائے، آمین۔

○○○

آفتاب رشک مصباحی

حدیث اتخاذ القبور مساجد: ایک علمی مطالعہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک حدیث مروی ہے، فرماتے ہیں:

''**قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: قاتل اللہ الیھود: اتخذوا قبور انبیائھم مساجد۔**''

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ یہودیوں کو ہلاک فرمائے کہ انھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو مسجد بنالیا۔ (۱)

حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے:

''**قال لعنۃ اللہ علیٰ الیھود والنصاریٰ، اتخذوا قبور انبیائھم مساجد، یحذر مثل ماصنعوا**'' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو یہود و نصاریٰ پر کہ انہوں نے اپنے انبیا کی قبروں کو مسجد بنالیا۔ تو جس طرح انھوں نے کیا (اے مسلمانو!) تم اس طرح کرنے سے بچو۔ یعنی یہود و نصاری کی طرح اپنے انبیا کی قبروں کو مسجد نہ بناؤ۔ (۲)

اسی طرح مسند احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ سے ایک حدیث مروی ہے:

''**قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: اللھم لا تجعل قبری وثنا، لعن اللہ قوما اتخذوا قبور انبیائھم مساجد**'' اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: اے اللہ! میری قبر کو بت نہ بنا، اللہ کی لعنت ہے اس قوم پر جس نے اپنے نبیوں کی قبروں کو مسجد بنالیا۔ (۳)

مذکورہ احادیث اور اسی طرح کی بعض دوسری احادیث جن میں قبروں کو مسجد بنانے سے منع کیا گیا ہے۔ اس کی ظاہری عبارت سے مسلمانوں کا ایک گروہ یہ معنیٰ لیتا ہے کہ جہاں کہیں بھی مسجد کے اندر قبر ہو وہاں نماز ادا کرنا منع ہے، بلکہ ان میں بعض نے تو یہاں تک تشدد اختیار کیا اور صاف کہہ دیا کہ ایسی مسجدوں سے قبریں مسمار کردی جائیں اور اگر قبروں کا مسمار کرنا ممکن نہ ہو تو سرے سے مسجد ہی کو شہید کردیا جائے۔

ڈاکٹر شیخ علی جمعہ سابق مفتی جمہوریہ مصر، تحریر فرماتے ہیں:

''یحرم المتشددون الصلوٰۃ بالمسجد الذی ألحق به ضریح رجل صالح ویصرّحون بوجوب هدم الضریح أوالمسجد وهم بذٰلک یخالفون اجماع المسلمین ویستفزون مشاعرهم۔ ''یعنی متشددین ایسی مسجدوں میں نماز ادا کرنے کو حرام قرار دیتے ہیں جس میں کسی مرد صالح کی قبر بنائی گئی ہو اور وہ یہ بھی تصریح کرتے ہیں کہ ایسی قبروں کا یا ایسی مسجدوں کا ڈھا دینا واجب ہے۔ وہ لوگ اپنے اس نظریے سے اجماع مسلمین کی مخالفت کرتے ہیں اور ان کے جذبات کی تحقیر کرتے ہیں۔ (۴)

اب آیئے دیکھیں کہ ان احادیث کا مفہوم و مقصود وہی ہے جو ان متشددین نے سمجھا یا اس کا مقصود کچھ اور ہے؟ تلاش و جستجو کے بعد ہم ان احادیث کے چند مطالب پر اطلاع پاتے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

اول: خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تفسیر کے مطابق منہی عنہ السجود للقبور ہے یعنی قبروں کا سجدہ کرنا ہے۔

ایک حدیث حضرت سلمان سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

''یاسلمان! لاتسجدلی، أرأیت لومت أکنت ساجدا لقبری، لاتسجد لی واسجد للحی الذی لایموت۔ ''اے سلمان! تم مجھے سجدہ مت کرو، تمہارا کیا خیال ہے کہ میری وفات ہو جائے تو تم میری قبر پر سجدہ کرو گے؟ تم مجھے سجدہ نہ کرو، بلکہ اسے سجدہ کرو جو زندہ ہے اور اسے کبھی موت نہیں آنے والی ہے۔ (۵)

مذکورہ روایت میں غور کرنے سے جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ کہ حضور علیہ السلام کا سلمان کو سجدہ کرنے سے منع کرنا شرک کی وجہ سے نہیں تھا ورنہ آپ فرماتے: اے سلمان! تم نے مجھے سجدہ کیا شرک کیا، کفر کیا، لہٰذا تجدید ایمان کرو اور پھر سے اسلام قبول کرو، بلکہ سجدہ کرنے سے اس لیے منع فرمایا کہ سجدہ کا مستحق صرف اور صرف مولیٰ تعالیٰ کی ذات ہے۔

دوم: نہی وارد ہے مسئلہ وثنیت کے تعلق سے، مطلب یہ کہ قبر کے ساتھ بتوں کا سا معاملہ نہ کرو۔

علامہ ابن رجب ''فتح الباری'' میں ''لاتجعل قبری وثناً'' کے تحت لکھتے ہیں:

ابن عبدالبر ''وثن'' کی تفسیر ''صنم'' سے کرتے ہیں اور ''لاتجعل قبری وثنا'' کا معنی بیان کرتے ہیں ''لاتجعل قبری صنما یصلی ویسجد نحوہ یعبد'' یعنی میری قبر کو بت نہ بناؤ کہ کوئی وہاں نماز ادا کرے، اسے سجدہ کرے اور اس طرف رخ کرکے اس کی عبادت کرے اور جو بھی اس

طرح کرے اس پر اللہ تعالیٰ کا سخت غضب ہو۔

حضور اکرم ﷺ اپنے صحابہ اور تمام امت کو اگلی امتوں کے افعال قبیحہ سیئہ سے روکتے تھے کہ وہ لوگ اپنے انبیا کی قبروں پر نماز پڑھتے تھے، اور اسے قبلہ اور مسجد بناتے تھے، نیز اسی طرح جس طرح بت پرست بتوں کا سجدہ کرتے تھے اور ان کی عبادت کرتے تھے، یہود و نصاری بھی اپنے نبیوں کی قبروں کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کرتے تھے، اور یہ شرک اکبر ہے، جس پر اللہ تعالیٰ نے غضب فرمایا، حضور سید عالم ﷺ اپنے صحابہ اور اپنی امت کو اگلوں کے ان ہی افعال شرکیہ سے آگاہ فرماتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے غضب سے ڈراتے تھے۔(٦)

تو اصل معاملہ یہ تھا کہ یہود و نصاریٰ نے بت پرستوں کی طرح اپنے انبیا کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا تھا جس سے حضور سید عالم ﷺ نے اپنی امت کو منع فرمایا کہ تم قبور انبیا کو مسجود اور قبلہ نہ بناؤ۔

صاحب فتح القدیر لکھتے ہیں:

"قاضی بیضاوی فرماتے ہیں: جب یہود اپنے انبیا کی قبروں کا ان کی غایت تعظیم کی وجہ سے سجدہ کرنے لگے، انہیں قبلہ بنالیا، نماز میں انہیں کی طرف متوجہ ہونے لگے اور حد سے بڑھ کر ان پاک قبروں کو بت بنالیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت بھیجی اور مسلمانوں کو اس فعل قبیح سے منع کیا گیا کہ اے مسلمانو! تم اپنے انبیا کی قبروں کو مسجود نہ بناؤ، قبلہ نہ بناؤ اور ان کے ساتھ بتوں کا سا معاملہ نہ کرو۔(۷)

متشددین کے اس تشدد نے کہ جس مسجد میں قبر ہو اس قبر یا اس مسجد کو ڈھادینا واجب ہے، اس بات کی مکمل وضاحت کردی کہ یہ حضرات ایسی جگہوں پر نماز پڑھنے کو شرک تصور کرتے ہیں، تو آیئے دیکھیں کہ کیا حقیقت میں غیر اللہ کو مطلق سجدہ شرک ہے؟

یہاں پر یہ بات اچھی طرح واضح ہوجائے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو کبھی بھی کفر و شرک کا حکم نہیں دیتا اور نہ کبھی ایسا ہوا کہ کفر و شرک کسی شریعت میں جائز رہا ہو اور ہماری شریعت میں حرام ہوگیا ہو۔ ایسا کبھی نہیں ہوا بلکہ کفر و شرک ہمیشہ ہر شریعت میں حرام رہا ہے اور آج بھی یہ حرام ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"و اذ قلنا للملئکۃ اسجدوا لاٰدم فسجدوا الا ابلیس، ابی و استکبر و کان من الکافرین۔" اور (یاد کرو) جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے کہ منکر ہوا، غرور کیا اور کافروں میں سے ہوگیا۔(۸)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم دیا، اگر مطلق سجدہ شرک و کفر ہوتا تو اللہ تعالیٰ کبھی بھی اس کا حکم نہ دیتا کیوں کہ وہ شرک و کفر کا حکم نہیں دیتا ہے۔

اسی طرح سورہ یوسف میں اللہ کا فرمان ہے:

”**ورفع ابویه علیٰ العرش وخروا له سجدا وقال یٰابت هذا تاویل رؤیای من قبل۔**“ اپنے ماں باپ کو تخت پر بٹھایا اور سب اس کے لیے سجدے میں گرے اور یوسف نے کہا: اے میرے والد! یہ میرے پہلے خواب کی تعبیر ہے۔(۹)

مفسر قرآن علامہ سید نعیم الدین مرادآبادی **وخروا له سجدا** کے تحت تحریر فرماتے ہیں۔

”یعنی والدین اور بھائی سب۔“(۱۰)

ہمارا عقیدہ ہے کہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام معصوم ہیں، ان سے گناہ کبیرہ اور صغیرہ کا ارتکاب نہیں ہوسکتا چہ جائے کہ کفر وشرک کا، اگر مطلق سجدہ کفر وشرک ہوتا تو ایک نبی دوسرے نبی کے سامنے ہرگز سجدے میں نہ گرتے اور یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک نبی کے سامنے ایک نبی اپنی تمام اولاد کے ساتھ سجدے میں چلے گئے، بلکہ خود سید عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم فتح مکہ سے پہلے کعبہ کی طرف سجدہ کرتے تھے جبکہ کعبہ میں تین سو ساٹھ (۳۶۰) بت تھے (۱۱)۔ تو اگر کسی کی جانب مطلق سجدہ کرنا کفر وشرک ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے صحابہ کے ساتھ اس کعبہ کی جانب ہرگز سجدہ نہ کرتے جس میں تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے، ہاں! کسی شئے کی جانب سجدہ کرنا اس وقت کفر وشرک ہوگا جب عبادت کے قصد سے ہو کہ جس کی جانب سجدہ کر رہا ہے اس کی عبادت کی نیت اور اس کا ارادہ بھی ہو تب تو بلاشبہ کفر وشرک ہے ورنہ نہ کفر ہے نہ شرک۔

متشددین نے ان احادیث سے ایک معنی یہ بھی لیا کہ قبروں پر مسجد بنانا درست نہیں اور نہ ہی مسجد میں کسی کو دفن کرنا روا۔

اب ان کی اس سمجھ پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں اور دیکھیں کہ کیا معاملہ ایسا ہی ہے کہ: نہ تو قبروں پر مسجد بنانا درست ہے اور نہ ہی مسجد میں کسی کو دفن کرنا روا؟

اسد الغابہ میں ایک طویل حدیث ہے جس میں یہ صاف صاف ہے کہ ابوبصیر بیمار پڑے پھر ان کا انتقال ہوگیا تو حضرت ابوجندل نے ان کی تجہیز وتکفین کی، نماز جنازہ پڑھی، دفن کیا اور ان کی قبر پر مسجد بنائی، اور ان تمام واقعات کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر دی گئی اور آپ نے بنائے مسجد پر منع نہ فرمایا(۱۲) اگر کسی قبر پر مسجد بنانا منع ہوتا تو آپ علیہ السلام خاموش نہ رہتے اور ضرور منع فرماتے۔

اسی طرح جب خود سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال ہوگیا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین اختلاف ہوگیا کہ آپ علیہ السلام کو دفن کہاں کیا جائے؟ بعض نے کہا جنت البقیع میں دفن کیا جائے، بعض نے کہا منبر شریف کے پاس دفن کیا جائے، بعض نے کہا مسجد نبوی شریف میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جہاں نماز ادا فرماتے تھے یعنی مصلی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس دفن کیا جائے، ابھی

صحابہ کرام اختلافی گفتگو فرما ہی رہے تھے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تشریف لے آئے اور آپ نے فرمایا کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ فرماتے سنا کہ:

''ماقبض نبی الا دفن حیث یقبض۔'' (۱۳)

بہر حال نبی علیہ السلام کی جہاں روح قبض کی گئی وہیں آپ دفن کئے گئے یعنی حجرۂ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا میں، مگر بعض صحابہ کا یہ مشورہ دینا کہ منبر شریف کے پاس دفن کیا جائے، مصلیٰ شریف کے پاس دفن کیا جائے اور یہ دونوں مسجد کے اندر ہیں جس پر کسی نے بھی انکار نہ کیا، یہاں تک کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی نہ فرمایا کہ تم مسجد نبوی میں دفن کرنے کی بات کرتے ہو اور نبی علیہ السلام نے مسجد میں دفن کرنے سے منع فرمایا ہے، لہٰذا اس میں کسی کا دفن کرنا درست نہیں، بلکہ نبی علیہ السلام کے فرمان کے مطابق آپ کو وہاں دفن کیا جہاں آپ کی روح قبض کی گئی، اگر مسجد میں دفن کرنا منع ہوتا تو اولاً صحابہ کرام ہی مسجد میں دفن کرنے کا مشورہ نہ دیتے اور اگر بعض صحابہ نے یہ مشورہ دے بھی دیا تو اجلہ صحابہ اور خود حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ضرور منع فرماتے اور ایسا مشورہ دینے سے روکتے، حالاں کہ ان تمام صحابہ میں سے کسی نے بھی نہ منع کیا اور نہ اس کو غلط ٹھہرایا، اس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ مسجد میں کسی نیک صالح شخص کو دفن کرنا منع نہیں ہے۔

اخیر میں ہم یہ بھی دیکھتے چلیں کہ ایسی مسجدوں میں جہاں کسی مرد صالح کی قبر ہو نماز پڑھنی درست ہے یا نہیں؟

ہم اپنے محدود مطالعہ کی روشنی میں جس نتیجے پر پہنچتے ہیں وہ یہ ہے کہ ایسی مسجدوں میں نماز ادا کرنا درست ہے، روا ہے، جائز ہے۔ اس کی متعدد مثالیں مل جائیں گی۔ طوالت کے خوف سے ہم صرف چند مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔

پہلی مثال یہ ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال ہوا اور آپ کو حجرۂ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا میں دفن کیا گیا تو حضرت عائشہ اپنے حجرہ میں جہاں آپ دفن کئے گئے نماز ادا کرتی تھیں، پھر جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وصال ہوا وہ بھی حجرۂ عائشہ میں نبی علیہ السلام کے پہلو میں دفن کئے گئے حضرت عائشہ اسی حجرہ میں اب بھی نماز ادا کرتی رہیں، یہاں تک کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا وصال ہو گیا، وہ بھی حجرۂ عائشہ میں سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک پہلو میں دفن کئے گئے، اب حجرۂ عائشہ میں تین قبریں ہو گئیں، ایک نبی علیہ السلام کی، دوسری حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اور تیسری قبر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی، مگر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بدستور اسی حجرے میں جہاں تینوں قبریں تھیں نماز ادا کرتی رہیں۔ (۱۴)

دوسری مثال یہ ہے کہ جب حضرت عمر بن عبد العزیز کا دور خلافت آیا اور آپ امیر المومنین

بنائے گئے، تو آپ نے مسجد نبوی شریف کی توسیع کی، کیوں کہ نمازیوں کی کثرت کی وجہ سے مسجد تنگ پڑ رہی تھی، جب آپ نے مسجد کی توسیع کی تو حجرۂ عائشہ جہاں حضور اکرم ﷺ اپنے دونوں محبوب صحابہ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے ساتھ محو استراحت ہیں، کو داخل مسجد کر دیا جس پر سوائے سعید بن مسیب کے کسی نے اعتراض نہ کیا، حالاں کہ اس توسیع مسجد سے مدینہ شریف کے فقہاء سبعہ بھی واقف تھے (۱۵) اور بعد توسیع سب وہاں نماز ادا کرتے تھے، حضرت سعید بن مسیب کا اعتراض صرف اس بات پر تھا کہ مسجد نبوی شریف میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے، نہ مزار نبوی میں کوئی تبدیلی ہو بلکہ دونوں کو اپنی حالت پہ رہنے دیا جائے، نہ کہ انہیں نماز ادا کرنے پر اعترض تھا، اگر نماز ادا کرنے پر اعتراض ہوتا تو خود بھی نماز ادا نہ کرتے حالانکہ وہ خود بھی وہاں نماز ادا کرتے تھے، اگر ایسی مسجدوں میں جہاں کسی مرد صالح کی قبر ہو نماز درست نہ ہوتی تو ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اپنے حجرہ میں کیوں نماز ادا کرتی رہیں؟ پھر عمر بن عبدالعزیز کے زمانے میں بعد توسیع مسجد نبوی شریف فقہاء سبعہ اور دیگر مسلمین اس مسجد میں کیوں کر نماز ادا کرتے رہے؟

لہٰذا ان تمام نفوس قدسیہ کا مسجد نبوی شریف میں نماز ادا کرتے رہنا اس بات کی روشن دلیل ہے کہ ایسی مسجدوں میں نماز درست اور روا ہے نہ کہ ناجائز وحرام۔

آخری مثال یہ ہے کہ مسجد حرام شریف میں بہت سے انبیاء کرام علیہم السلام کی قبریں ہیں، خود حضور ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

''**مابين زمزم والحطيم تسعون نبيا موتى۔**'' حرم شریف کے اندر زمزم اور حطیم کعبہ کے بیچ نوے (۹۰) انبیائے کرام علیہم السلام کی قبریں ہیں۔ (۱۶)

اسی طرح مسجد اقصیٰ میں آدم علیہ السلام اور دیگر انبیائے کرام کی قبریں ہیں۔ مسجد خیف میں ستر (۷۰) انبیائے کرام علیہم السلام کی قبریں ہیں۔ مسجد حلب میں یحی بن زکریا علیہما السلام کی قبر ہے۔ جبل احد کے دامن میں حضرت ہارون علیہ السلام کی قبر ہے، وادئ عتیق کے دامن میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی قبر ہے۔ (۱۷) اور یہ تمام وہ مقدس جگہیں ہیں جہاں ابتدا سے ہی علما، فقہا، محدثین اور صوفیہ سلف تا خلف آج تک سب کے سب نماز ادا کرتے چلے آرہے ہیں، اور کسی نے بھی ان مساجد اور مقامات مقدسہ کو مسمار کرنے کی بات کی اور نہ ہی یہ کہا کہ ان اماکن مقدسہ میں نماز ادا کرنا ناجائز وحرام ہے، گویا سلف تا خلف سب کا اس پر اجماع قائم ہو گیا کہ ایسی جگہوں پر نماز ادا کرنا درست اور جائز ہے، اب جو لوگ ایسی جگہوں پر ادائے صلوٰۃ کو ناجائز وحرام قرار دیتے ہیں یا ان مقامات مقدسہ کو ڈھانے کو واجب گردانتے ہیں وہ ان چودہ سو سالہ اجماع مسلمین کے خلاف حکم دیتے ہیں اور اسلام میں ایک بدعت کی راہ نکالتے ہیں۔ جس کا اسلام سے

کوئی واسطہ نہیں کیونکہ ہر بدعت گمراہی ہے۔

خلاصہ یہ کہ مسجد کے اندر کسی مرد صالح کا دفن کرنا جائز ہے، نیز ایسی جگہوں پر نماز ادا کرنا بھی درست ہے، ہاں! اگر مصلیٰ اور قبر کے درمیان دیوار یا مشابہ دیوار کوئی چیز حائل نہ ہو تو قبر کے سامنے نماز ادا کرنا منع ہے اور اگر مصلیٰ اور قبر کے درمیان کوئی ایسی چیز حائل ہو جس کی وجہ سے قبر نگاہوں سے پوشیدہ ہو جائے تو ایسی صورت میں وہاں نماز ادا کرنا درست ہے۔ جب کہ صاحب قبر کی عبادت کا قصد وارادہ نہ ہو، اور اگر صاحب قبر کی عبادت کی نیت (جس کا بہتر طور پر جاننے والا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے) سے ایسی جگہوں پر نماز ادا کرتا ہے تو یہ بلا شبہ کفر اظہر اور شرک اکبر ہے۔ العیاذ باللہ تعالیٰ

حوالہ جات

(۱) صحیح البخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب الصلوٰۃ فی البیعۃ، ج:۱ ص:۹۵، دار طوق النجاۃ، مصر

(۲) صحیح المسلم، کتاب المسجد، باب النہی عن بناء المسجد علی القبور، ۲:۶۷، دار الجیل بیروت

(۳) مسند احمد، ج:۱۲، ص:۳۱۴، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت

(۴) المتشدد دون جھم ومناقشتہم قضایاھم۔ ۸۲، دار المقطم للنشر والتوزیع، القاہرہ، مصر

(۵) مسند فردوس، ج:۵، ص:۳۸۷

(۶) فتح القدیر لابن رجب، کتاب الصلوٰۃ، باب قبلۃ اھل المدینۃ، ج:۲، ص:۴۴۱، دار ابن الجوزی السعودیۃ

(۷) فتح القدیر، ج:۴، ص:۴۶۶، المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ، مصر

(۸) القرآن الکریم، سورہ: بقرہ، آیت:۳۴

(۹) ایضا، سورہ: یوسف، آیت:۱۰۰

(۱۰) خزائن العرفان فی تفسیر القرآن، ص:۴۴۵، فرید بکڈپو پرائیوٹ لمیٹیڈ، دہلی

(۱۱) حکم الصحابۃ العلیۃ علی القبور الصوفیۃ، ص:۲۸۲، دار المقطم للنشر والتوزیع، القاہرہ

(۱۲) اسد الغابۃ، ج:۱، ص:۱۱۶۴

(۱۳) السنن لابن ماجہ، کتاب الجنائز، باب ذکر دفنہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ۱/۵۲۰، دار الفکر، بیروت

(۱۴) المتشدد دون جھم ......ومناقشۃ اھم قضایاھم، ص:۸۵

(۱۵) ایضاً، ص:۸۵

(۱۶) انتصار اولیاء الرحمن علی اولیاء الشیطان، ص:۳۵، مکتبہ دار الشفقۃ، استانبول ترکیہ

(۱۷) حکم الصحابۃ العلیۃ علی القبور الصوفیۃ، ص:۳۲۰۔۳۲۱، دار المقطم، القاہرہ، مصر

○○○

خلافت کے شرائط، حقوق اور واجبات

خلافت کا لفظی معنی نیابت ہے۔ اللہ تعالی نے سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنا نائب وخلیفہ بنایا اور ان کی جائے سلطنت زمین کو قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً۔ (البقرۃ:۳۰) گویا انسان کو اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کے لیے اپنا نائب وجا نشیں بنایا۔ اس امانت عظمی کو زمین وآسمان اور ان میں آباد مخلوقات کے سامنے پیش کیا گیا لیکن اس بار امانت کو اٹھانے سے سب نے انکار کردیا مگر جذبۂ الٰہی میں سرشار انسان نے، سود وزیاں سے بے پرواہ ہوکر اس امانت کبریٰ کو قبول کرلیا۔ قرآن نے اس کی ترجمانی اس طرح فرمائی ہے:

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا (الاحزاب:۷۲)

ہم نے اپنی امانت آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تو سب نے اس بار گراں کو اٹھانے سے انکار کردیا اور سب کے سب ڈر گئے، لیکن اسے انسان نے اٹھالیا اور انسان بڑا ظالم بڑا جاہل تھا۔

اسی لیے پروردگار عالم نے انسان کو تمام مخلوقات سے بہتر اور اعلیٰ صفات کا حامل بنا کر پیدا فرمایا: لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ (التین:۴) ہم نے انسان کو سب سے عمدہ سانچے میں ڈھالا ہے۔ تاکہ نیابت کے حقوق مکمل طور سے ادا کرسکے۔ ایک دوسرے مقام پر فرمایا: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا (الاسراء:۷۰) ہم نے اولاد آدم کو کرامت بخشی، انھیں بحر وبر کی وسعتیں عطا کردیں، پاکیزہ غذاؤں سے نوازا اور اپنی بے شمار مخلوقات پر اسے فضیلت بخشی۔

اللہ رب العزت کی حقیقی نیابت تو انبیا علیہم السلام نے فرمائی اور جب نبوت کا دروازہ بند ہوگیا تو نبی کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم کی نیابت علما ومشائخ کے ذمے آئی اور یہی لوگ اس امانت کے

وارث وامین ٹھہرے۔

خلافت کی تعریف

امامت اور خلافت کے الفاظ اور تعبیر میں اگرچہ فرق ہے، مگر معنی اور مطلب سب کا ایک ہے، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب کی حیثیت سے دین کو قائم کرنا، اس کی حفاظت کا فریضہ سرانجام دینا اور دنیاوی معاملات میں لوگوں کے مصالح کے مطابق شریعت کی روشنی میں ان کی رہنمائی کرنا۔ ابنِ منظور افریقی لکھتے ہیں:

الإمام کل من ائتم به قوم، کانوا علی الصراط المستقیم أو کانو ضالین، والجمع: أئمة۔

والخلیفة إمام الرعیة (۱)

امام ہر اس شخص کو کہتے ہیں جس کی کوئی قوم پیروی کرے، چاہے وہ قوم ہدایت یافتہ ہو، یا گم راہ اور اس کی جمع ائمہ ہے۔

اور خلیفہ رعیت (لوگوں) کے مقتدا کو کہتے ہیں۔

علامہ سعد الدین مسعود تفتازانی فرماتے ہیں:

نیابتهم عن الرسول فی إقامة الدین بحیث یجب علی کافة الأمم الاتباع (۲)

امامت؛ اقامت دین کے سلسلے میں رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نیابت کو کہتے ہیں۔ اسی لیے تمام امت پر اس کی اتباع واجب ہے۔

قرآن وحدیث میں خلافت وامامت کا ذکر

اقامت دین کی غرض سے مسلمانوں کے اقتدار اعلی کے لیے قرآن و حدیث میں خلافت، امامت اور امارت جیسے تعبیرات ملتے ہیں:

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً (البقرۃ: ۳۰)

اس وقت کو یاد کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں۔

قَالَ إِنِّىۡ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَاماً (البقرۃ: ۱۲۴)

کہا: میں تم کو لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔

---

(۱) ابنِ منظور، جمال الدین محمد بن مکرم، لسان العرب: ۱۲ / ۲۴، دار صادر، بیروت

(۲) شرح العقائد النسفی، ص: ۱۰۸، میر محمد کتب خانہ کراچی

أَطِيعُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الأَمْرِ مِنكُمْ (النساء:۵۹)

اللہ و رسول کی اطاعت کرو اور اپنے امیر کی اطاعت کرو۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَى لَهُمْ (النور:۵۵)

تم لوگوں میں جو ایمان لائے اور نیک اعمال کیے، اللہ کا ان سے وعدہ ہے کہ ضرور ضرور انہیں زمین میں اپنا خلیفہ بنائے گا، جیسا کہ ان سے پہلے والوں کو بنایا اور ان کے لیے اس دین کو مضبوط و مستحکم فر دے گا، جسے ان کے حق میں پسند فرمالیا ہے۔

اس کے علاوہ بھی متعدد مقام پر انبیا اور ان کے وارثین کے لیے اس طرح کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمودات میں بھی الگ الگ تعبیرات استعمال ہوئے ہیں جیسے:

كُلُّكُمْ رَاعٍ فَمَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، فَالأَمِيرُ الَّذِي عَلَى النَّاسِ رَاعٍ وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْهُمْ (۱) تم میں کا ہر شخص ذمہ دار ہے اور اس سے اس کی ذمہ داری کے بارے میں سوال ہوگا۔ امیر لوگوں کا نگہبان و محافظ ہوگا، ان کے بارے میں اس سے سوال ہوگا۔

إِذَا خَرَجَ ثَلَاثَةٌ فِي سَفَرٍ فَلْيُؤَمِّرُوا أَحَدَهُمْ (۲) جب تین شخص کسی سفر پر نکلیں تو کسی ایک کو اپنا امیر بنالیں۔

مَنْ أَطَاعَنِي فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ، وَمَنْ عَصَانِي فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ، وَمَنْ أَطَاعَ أَمِيرِي فَقَدْ أَطَاعَنِي، وَمَنْ عَصَى أَمِيرِي فَقَدْ عَصَانِي (۳) جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی طاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی، اسی طرح جس نے میری طرف سے نامزد کیے ہوئے امیر کی پیروی کی اس نے میری پیروی کی اور جس نے اس کی پیروی سے روگردانی کی اس نے میری پیروی سے اعراض کیا۔

الْخِلَافَةُ بَعْدِي ثَلَاثُونَ سَنَةً، ثُمَّ تَكُونُ مُلْكًا (۴) میرے بعد خلافت تیس سال تک قائم رہے گی، اس کے بعد بادشاہت و ملوکیت کا دور ہوگا۔

---

(۱) الصحیح للامام البخاری (رقم الحدیث:۷۱۳۸)

(۲) سنن ابی داود (رقم الحدیث:۲۶۰۸)

(۳) الصحیح للامام البخاری (رقم الحدیث:۷۱۳۷) الصحیح للامام مسلم، (رقم الحدیث:۱۸۳۵)

(۴) صحیح ابن حبان (رقم الحدیث:۶۹۴۳)

خلافت کی قسمیں

فقہاے اسلام کے نزدیک خلافت یا امامت کی دو قسمیں ہیں؛ پہلے کو خلافت کبریٰ کہا جاتا ہے، جس پر متمکن شخص امت اسلامیہ کے سیاسی و اجتماعی امور سر انجام دیتا ہے، جب کہ دوسرے کا نام امامت یا خلافت صغری ہے، یہ مسلمانوں کی نماز با جماعت کی امامت ہے۔(۱)

صوفیہ و مشائخ کرام کے یہاں بھی امامت یا خلافت کی دو قسمیں ہیں؛ پہلے کو خلافت صغریٰ کہا جاتا ہے، جس پر متمکن شخص امت اسلامیہ کے ظاہری معاملات کی دیکھ بھال کرتا ہے، اسی لیے اس شخص کو امیر المومنین کہا جاتا ہے، جب کہ دوسرے کا نام خلافت کبریٰ یا غوثیت کبریٰ ہے۔ اس عظیم مسند پر فائز شخص کو قطب وقت، غوث زماں یا قیوم زماں جیسے القاب سے نوازا جاتا ہے۔

حضرت سید محمد حسینی گیسو دراز قدس اللہ سرہ کے ملفوظ میں ہے کہ نبی کریم ﷺ کی خلافت کی دو قسمیں ہیں: (۱) خلافت کبریٰ اور (۲) خلافت صغریٰ، خلافت کبریٰ خلافت باطنی ہے اور خلافت صغریٰ خلافت ظاہری (۲)

اسی کو صوفیہ وَلایت اور وِلایت سے بھی تعبیر کرتے ہیں، جس کے سپرد امور ظاہری ہوتا ہے اسے وَلایت حاصل ہوتی ہے، وہ متولی و جانشین کہلاتا ہے، جب کہ جسے وِلایت حاصل ہو گویا اس نے قرب الٰہی کا اعلیٰ مقام حاصل کر لیا، روحانیت کا شہ سوار بن گیا۔

سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا ارشاد فرماتے ہیں:

> جو کچھ اس کے اور خلق کے درمیان ہے اس کو وَلایت کہتے ہیں، لیکن جو کچھ اس کے اور حق کے درمیان ہے، وہ وِلایت ہے۔(۳)

بعض لوگ اس کی تعبیر خلافت تکوین اور خلافت ارشاد سے بھی کرتے ہیں۔

اس بات پر تمام ائمہ و مشائخ کا اتفاق ہے کہ خلافت باطنی یا خلافت کبریٰ باب العلم سیدنا علی کرمہ اللہ وجہہ سے ہی جاری رہا اور قیامت تک یہ سنت باقی رہے گی۔

مشائخ کے احوال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خلافت باطنی میں بھی بعض مشائخ مسند ارشاد پر جلوہ بار ہوتے ہیں، بعض منصب تکوین پر فائز ہوتے ہیں جب کہ بعض دونوں کے جامع ہوتے ہیں۔

مخدوم شیخ سعد قدس اللہ روحہ کا اس سلسلے میں ارشاد عالی ہے:

---

(۱) حاشیۃ ابن عابدین (۱/ ۵۴۸)

(۲) مجمع السلوک (۲/ ۱۶۰)

(۳) فوائد الفواد: ملفوظ حضرت نظام الدین اولیا، از حسن علا سجزی، ص: ۱۸۰

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے خلافت کبریٰ والے خلفا ہوئے اور اُن خلفا سے دوسرے خلفا ہوئے، ان خلفا کے خلفا ہوتے رہیں گے اور قیامت تک یہ سنت الٰہیہ جاری رہے گی۔(۱)

ان تمام اقسام کے لیے کچھ شروط و قیود ہیں، کچھ حقوق و واجبات ہیں، نماز کی امامت کا تفصیلی ذکر فقہا کی کتابوں میں ملتا ہے۔ خلافت ظاہری یا امارت مسلمین پر بحث متکلمین اور سیر و حدیث کی کتابوں میں درج ہیں لیکن قطبیت کبری اور ان کے نائبین کے لیے شرائط و واجبات کا ذکر صوفیہ نے مختلف مقامات پر کیا ہے مگر کسی بھی کتاب میں اس پر سیر حاصل گفتگو نہیں کی گئی ہے۔ پیر و مرشد کے اشارے پر پیران عظام کی ہمت کے صدقے ہم اس مضمون میں اسی خاص گوشہ پر روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ ان شاء اللہ

قطب اعظم یا غوثیت کبری کا ثبوت

قرآنی آیات و احادیث میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مقام پر خلافت سے صرف خلافت تکوین، امارت مسلمین یا حکومت و سلطنت ہی مراد ہے جب کہ دوسرے بعض مقام پر مسند ارشاد مراد لینا ہی بہتر ہے اس لیے ان میں سے کسی ایک کو تسلیم کرنا اور دوسرے سے صرف نظر کرنا عقل کا تقاضا نہیں ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

كَانَتْ بَنُو إِسْرَائِيلَ تَسُوسُهُمُ الأَنْبِيَاءُ، كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهُ نَبِيٌّ، وَإِنَّهُ لاَ نَبِيَّ بَعْدِي، وَسَيَكُونُ خُلَفَاءُ فَيَكْثُرُونَ،قَالُوا: فَمَا تَأْمُرُنَا؟ قَالَ:فُوا بِبَيْعَةِ الأَوَّلِ فَالأَوَّلِ، أَعْطُوهُمْ حَقَّهُمْ، فَإِنَّ اللهَ سَائِلُهُمْ عَمَّا اسْتَرْعَاهُم (۲)

بنی اسرائیل کی قیادت انبیا کرتے تھے، جب بھی کوئی نبی اس دنیا سے رخصت ہوتا دوسرا نبی ان کی جگہ لے لیتا، البتہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا اس لیے میرے بعد خلفا ہوں گے اور کثرت سے ہوں گے۔ صحابہ کرام نے دریافت کیا: آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ان میں سبقت کرنے والے کی وفاداری کرو، انھیں ان کا مکمل حق دو کیوں کہ اللہ تعالی ان سے ان کی رعایا کے بارے میں سوال کرے گا۔

إِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الأَنْبِيَاءِ، إِنَّ الأَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوا دِينَارًا وَلَا دِرْهَمًا، إِنَّمَا وَرَّثُوا الْعِلْمَ، فَمَنْ

---

(۱) مجمع السلوک، ج:۲/ص:۱۶۰

(۲) الصحیح للامام البخاری (رقم الحدیث:۳۴۵۵) الصحیح للامام مسلم (رقم الحدیث:۱۸۴۲)

أَخَذَهُ أَخَذَ بِحظٍّ وَافِرٍ (۱) علما نبیوں کے وارث ہوں گے، انبیا کی وراثت دینار و درہم کی نہیں ہے، ان کی وراثت علم ہے، جس نے علم حاصل کیا اس نے اپنے لیے خیر کثیر اکٹھا کر لیا۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرماتے ہیں:

اللّٰهُمَّ ارْحَمْ خُلَفَائِي, ثَلَاثَ مَرَّاتٍ, قِيلَ: يَا رَسُولَ اللهِ, وَمَنْ خُلَفَاؤُكَ؟ قَالَ: الَّذِينَ يَأْتُونَ مِنْ بَعْدِي, وَيَرْوُونَ أَحَادِيثِي, وَسُنَّتِي, وَيُعَلِّمُونَهَا النَّاسَ (۲) یا اللہ! میرے خلفا پر رحم فرما۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بات تین بار فرمائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا: یا رسول اللہ! آپ کے خلفا کون ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو میرے بعد آئیں گے، میری باتیں اور سنتیں بیان کریں گے اور لوگوں کو اس کا علم سکھائیں گے۔

ان حدیثوں میں غور کریں تو معلوم ہوگا کہ کار نبوت یعنی رشد و ہدایت اور دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دینے والے ہی حقیقت میں خلیفۂ رسول ہیں، وارث نبی ہیں اور ایسے لوگ تا قیامت ہوتے رہیں گے اور کثرت سے ہوں گے کیوں کہ سلطنت اسلامیہ کے سربراہ خلیفۂ راشد کے طور پر صرف چند لوگ ہی رہے ہیں جیسا کہ خود حدیث نبوی میں اس کی وضاحت موجود ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

الْخِلَافَةُ بَعْدِي ثَلَاثُونَ سَنَةً, ثُمَّ تَكُونُ مُلْكًا (۳) میرے بعد خلافت تیس سال تک قائم رہے گی اس کے بعد بادشاہت و ملوکیت کا دور ہوگا۔

اس سے بھی واضح حدیث یہ ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

تَكُونُ النُّبُوَّةُ فِيكُمْ مَا شَاءَ اللهُ أَنْ تَكُونَ, ثُمَّ يَرْفَعُهَا إِذَا شَاءَ أَنْ يَرْفَعَهَا, ثُمَّ تَكُونُ خِلَافَةٌ عَلَى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ, فَتَكُونُ مَا شَاءَ اللهُ أَنْ تَكُونَ, ثُمَّ يَرْفَعُهَا إِذَا شَاءَ اللهُ أَنْ يَرْفَعَهَا, ثُمَّ تَكُونُ مُلْكًا عَاضًّا, فَيَكُونُ مَا شَاءَ اللهُ أَنْ يَكُونَ, ثُمَّ يَرْفَعُهَا إِذَا شَاءَ أَنْ يَرْفَعَهَا, ثُمَّ تَكُونُ مُلْكًا جَبْرِيَّةً, فَتَكُونُ مَا شَاءَ اللهُ أَنْ تَكُونَ, ثُمَّ يَرْفَعُهَا إِذَا شَاءَ أَنْ يَرْفَعَهَا, ثُمَّ تَكُونُ خِلَافَةً عَلَى مِنْهَاجِ نُبُوَّةٍ, ثُمَّ سَكَتَ (۴)

جب تک اللہ چاہے گا نبوت رہے گی اور جب نبوت ختم ہو جائے گی تو منہج نبوت پر خلافت کا

---

(۱) سنن ابن ماجہ (۱/ ۸۱، رقم الحدیث: ۲۲۳) سنن الترمذي (۵/ ۴۸، رقم الحدیث: ۱۶۸۲)

(۲) طبرانی/ المعجم الاوسط (۶/ ۷۷، رقم الحدیث: ۵۸۴۶) أمالي الشجري (۱/ ۲۵)، والطیوریات (رقم الحدیث: ۱۶۵)

(۳) صحیح ابن حبان (رقم الحدیث: ۶۹۴۳)

(۴) مسند احمد بن حنبل (رقم الحدیث: ۱۸۴۰۶)

دور شروع ہوگا اور جب اللہ چاہے گا وہ بھی ختم ہوجائے گا، اس کے بعد ظالم بادشاہت کا دور شروع ہوگا پھر جب اللہ چاہے گا یہ بھی ختم ہوجائے گا اس کے بعد جابر بادشاہت کا دور آئے گا اور اللہ جب چاہے گا یہ بھی ختم ہوجائے گا اور خلافت راشدہ قائم ہوگی اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاموش رہے۔

اس حدیث سے واضح ہوگیا کہ خلافت ظاہری علی منہج نبوت زیادہ دنوں تک نہیں رہے گی پھر بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ خلفا کثرت سے ہوں گے اور ہمیں معلوم ہے کہ حکومت وسلطنت امور نبوت کا ایک ادنی حصہ ہے اور نبی کا بنیادی کام مخلوق کا رشتہ اس کے خالق ومالک سے جوڑنا اور انھیں اخلاق حسنہ سے آراستہ کرنا رہا ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سابقین انبیا ورسل میں سے اکثر کے پاس حکومت نہیں رہی ہے اور جب نبیوں کے آنے کا سلسلہ بند ہوگیا تو علمائے ربانیین اور عارفین باللہ ہی امور نبوت کی حقیقی جانشینی کرتے رہے ہیں، اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں بھی اپنا وارث وخلیفہ فرمایا ہے۔

ان علمائے ربانیین میں جو سب سے اعلی وارفع ہوگا اسے قطب یا غوث وغیرہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

میرا شیخ ہی غوث اعظم ہے؟

یاد رہے کہ قطبیت کبری کا منصب کسی ایک ہی کو حاصل ہوتا ہے لیکن یہ معاملہ عالم باطن کا ہے کہ کون اس وقت اس منصب جلیلہ پر فائز ہے، حتمی طور سے کوئی بھی شخص کسی کے بارے میں یہ دعوی نہیں کرسکتا ہے کہ فلاں قطب ہے، نہ یہ باب اور منصب، نبوت کی طرح ادعا کا ہے کہ قطب یہ دعوی کرے کہ میں اس منصب پر فائز ہوں لیکن یہ مسلم ہے کہ اس ایک شخص کے علاوہ اس وقت کے سارے اولیا اس کے ماتحت اور زیر قدم ہوتے ہیں اور اس قطب کے مشن پر گامزن ہوتے ہیں، وہ قطب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقیقی نیابت کا فریضہ انجام دیتا ہے۔

اس لیے مریدین ومتبعین کو چاہیے کہ ہر ایک اپنے اپنے شیخ کو ہی قطب وقت، غوث زماں جانے اور مانے لیکن اپنی عقیدت کو شریعت کا درجہ نہ دیں اور دوسروں پر بھی یہ لازم نہ کریں کہ آپ کے شیخ کو وہ بھی آپ ہی کی طرح مانے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم کسی کے شیخ کی توہین نہ کریں بلکہ سارے مشائخ کی تعظیم وتوقیر کو لازم جانیں۔ جب انبیا میں تفریق جائز نہیں ہے تو ان کے نائبین میں کیوں کر روا ہوگی۔

یہاں ایک دوسری بات کی طرف بھی توجہ مبذول کرانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جب خلافت ظاہری یا خلافت تکوینی کا قیام منہج نبوت پر نہ ہو تو کیا اس وقت تک مقام ارشاد پر فائز شخص ہی کو ظاہر وباطن کا امام تسلیم کرلیا جانا نہیں چاہیے؟ تاکہ کم از کم گھر یا خانقاہ کی چہار دیواری یا ایک

محدود دائرے میں ہی صحیح معنوں میں اسلام کو قائم کیا جا سکے؟ اور آہستہ آہستہ پر امن اور حکیمانہ طریقے سے اس دائرے کو وسیع کرنے کی کوشش کی جاتی رہے۔

صوفیہ کے یہاں خلافت کا مفہوم

یہاں اس بات کی وضاحت انتہائی ضروری ہے کہ خلافت سے صوفیہ کیا مراد لیتے ہیں؟

مذکورہ بالا تحریر سے ہی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ صوفیہ کے نزدیک جانشینی کا مطلب صرف حکومت سنبھالنا نہیں ہے کیونکہ پیغمبر اسلام ہر چیز سے پہلے دین کے ہادی اور پیشوا تھے، دین کی حفاظت اور نشر و اشاعت، سب سے زیادہ دین کی معرفت رکھنا، سب سے زیادہ دین کے ساتھ مخلص اور اس پر عمل پیرا ہونا، آنحضرت کی بنیادی خصوصیات اور ذمہ داریوں میں سے تھا اسی لیے صوفیہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرض منصبی کے جانشینی کو خلافت کبری سے تعبیر کیا ہے۔ ہاں دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حیثیت مملکت اسلامیہ کے حاکم ہونے کی بھی ہے تو جو شخص اس منصب پر جلوہ بار ہوگا اس کو بھی صوفیہ خلیفہ و جانشیں ہی قرار دیتے ہیں لیکن اس کو خلافت صغری کا نام دیتے ہیں۔

قطبیت کبری ایک باطنی امر ہے لیکن ظاہری طور پر اس کی نیابت روئے زمین پر بے شمار اولیا کرتے ہیں وہ اپنے صواب دید اور اجتہاد یا باطنی اشارات کی بنیاد پر گاہ بگاہ یا انتقال سے پہلے اپنے خلفا و جانشیں مقرر کرتے ہیں ہم ذیل میں ان ہی اولیاے عظام کی نیابت و خلافت کے شرائط اور ان کے حقوق و واجبات پر روشنی ڈالتے ہیں۔

خلافت کی شرائط

صوفیہ کے یہاں بیعت و خلافت کا سلسلہ جاری ہے، ہر سلسلے، ہر درگاہ یا ہر شیخ کا کوئی نہ کوئی جانشیں ہوتا ہے آج کے دور میں خلافت یا جانشینی کے سلسلے میں بہت سی غلط فہمیاں اور غیر ضروری رسومات عام ہوگئیں ہیں، جن میں سے بعض پر تفصیلی روشنی ڈالی جائے گی۔

سب سے پہلے ہم یہاں پر اہلیت خلافت کے لیے شرائط بیان کرتے ہیں:

ا۔ اہل ایمان میں سے ہو

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَنْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلاً (النساء: ۱۴۱)

اللہ رب العزت کافروں کو مسلمانوں پر کوئی راہ نہ دے گا۔

اللہ تعالی نے تو وعدہ کر لیا ہے کہ دنیا و آخرت کی فلاح صرف مومنین کے لیے ہے، کوئی بھی کافر ان پر غلبہ نہیں پائے گا تو کیوں کر روا ہوگا کہ وہ امر خلافت جو نبوت کی وراثت ہے اس کو کسی کافر کے سپرد کر دیا جائے۔

۲۔مرد ہو

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

لَنْ يُّفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا اَمْرَهُمْ اِمْرَاَةً (۱) وہ قوم کبھی فلاح نہیں پا سکتی جو عورت کو اپنا حاکم بنائے۔

عورتوں میں فقہ و حدیث کی ماہرہ، بلند ہمت اور قربت الٰہی کے اعلیٰ درجات حاصل کرنے والی ضرور ہوں گی لیکن بطور خلافت انھیں کبھی نامزد نہیں کیا جائے گا کیوں کہ اللہ نے کبھی بھی کسی عورت کو نبی نہیں بنایا تو ان کی نیابت بھی کوئی عورت کیسے انجام دے سکتی ہے؟

۳۔عاقل و بالغ ہو

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْۤا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ (النساء:۵،۶)

اور کم عقلوں کو اپنے مال نہ دو جن کو اللہ نے تمہارے گزر بسر کا ذریعہ بنایا ہے، اور انھیں اس میں سے کھلاؤ، پہناؤ اور انھیں اچھی بات سمجھاؤ۔ اور انھیں آزماتے رہو یہاں تک کہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں، لیکن جب تم انھیں عقل میں پختہ پاؤ تو ان کو ان کے مال دے دو۔

درج بالا آیات میں یتیموں کو ان کے مال صرف اس وقت حوالے کرنے کا حکم دیا گیا ہے جب وہ عاقل و بالغ ہو جائیں۔ جب کسی کو اس کا مال اس وقت تک نہیں دیا جا سکتا جب تک کہ وہ عاقل و بالغ نہ ہو جائے تو اہلِ ایمان کی سیادت کی ذمہ داری کسی ایسے فرد کو کیوں کر دی جا سکتی ہے جو مجنون وصبی ہو، اسی طرح خلافت سے ان لوگوں کو بھی دور رکھا جائے گا جو موجودہ معاشرہ کی عام ذہنی سطح سے بہت ہی کم درجہ کی ذہانت رکھتے ہوں یعنی حد درجہ بے وقوف ہوں۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خلیفہ صرف اسی کو بنایا جائے گا جو پختہ عقل اور حد بلوغت کو پہنچ چکا ہو۔

۴،۵۔عالم وقادر ہو

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (البقرة:۲۴۷) اللہ تعالیٰ نے حضرت داود کو

---

(۱) الصحیح للامام البخاری (رقم الحدیث:۴۴۲۵)

وسعت علم اور قوت جسم زیادہ عطا کی ہے۔

اللہ جل شانہ نے بنی اسرائیل کے سامنے حضرت داؤد کو نبوت کے لیے منتخب کرنے کی وجہ جہاں علم میں وسعت والا بتایا ہے وہیں اپنے متبعین اور دشمن پر غلبہ وقدرت پانے اور ہیبت وسطوت قائم کرنے کے لیے عظیم جسمانی ساخت والا بھی بتایا ہے۔

یہ بات تو تمام اہل اسلام کے نزدیک مسلم ہے کہ ہر مسلمان پر عقائد ومعمولات میں سے ضروریات کا علم حاصل کرنا فرض ہے۔ سنن ونوافل اور فروعات کا علم تو حسب ضرورت حاصل ہو لیکن اسے چاہیے کہ مشائخ کی صحبت اور ان کی کتابوں سے ہمیشہ طلب میں لگا ہو، رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

لَنْ يَشْبَعَ الْمُؤْمِنُ مِنْ خَيْرٍ يَسْمَعُهُ حَتَّى يَكُونَ مُنْتَهَاهُ الجَنَّةُ (۱) مومن کبھی بھی کسی ایسے خیر سے آسودہ نہیں ہوتا جس کو وہ سن لیتا ہے یہاں تک کہ وہ جنت میں پہنچ جائے۔

وہ خود فرائض پر عمل کرتا ہو، حرام سے اجتناب کرتا ہو اور وہ اس بات پر بھی قادر ہو کہ حکمت ودانائی سے ان کی تبلیغ کر سکے اور عمل نا کرنے کی صورت میں اپنے متبعین ومحبین پر زجر وتوبیخ کر سکے۔ اللہ کے رسول ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ ، وَذَلِكَ أَضْعَفُ الْإِيمَانِ (۲) جو شخص کوئی حرام امر دیکھے اسے بزور ختم کرنے کی کوشش کرے، اگر وہ یہ نہیں کر سکتا تو زبان سے پند ونصیحت کرے اور اگر یہ بھی نہیں کر سکتا تو اس امر کو دل سے برا جانے، یہ ایمان کا ادنی درجہ ہے۔

۶، ۷، ۸۔ صالح، زاہد، متقی

اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ ، إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (العصر: ۲، ۳)

جو ایمان لائے، نیک عمل کیے، ایک دوسرے کو حق کی تاکید کی اور صبر کی وصیت کی، ان کے علاوہ ہر انسان گھاٹے میں ہے

اس سے واضح ہو گیا کہ جو فاسق وفاجر ہے وہ نقصان میں ہے، وہ کیسے مشائخ کی امانتوں کا

---

(۱) سنن الترمذی، ابواب العلم (رقم الحدیث: ۲۶۸۶)

(۲) الصحیح للمسلم، کتاب الامارۃ (رقم الحدیث: ۴۹)

متحمل ہوسکتا ہے؟ وہ کیسے ان کی نیابت کرتے ہوئے تبلیغ دین اور اشاعت اسلام کرسکتا ہے؟ صالح اور نیک بندوں کے درجات ہیں، بعض قطبیت اور صدیقیت جیسے اعلی مقام پر فائز ہوتے ہیں لیکن مشائخ نے یہ بیان کیا ہے کہ خلافت ارشاد کے لیے کم سے کم کسی شخص کا ان تین صفات سے مزین ہونا ضروری ہے تا کہ اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی انعام یافتہ لوگوں کی راہ پر چلا سکے۔

صالح وہ انسان ہے جو اللہ و رسول کی پیروی کرے یعنی ایمان کے بعد فرائض کی ادائیگی کرے، منہیات سے بچے اور مخلوق کے ساتھ حسن سلوک کرے، اس کی ذات سے لوگوں کو تکلیف نہ پہنچے بلکہ سلامتی پہنچے۔

زاہد وہ شخص ہے جو فرائض کی ادئیگی اور حرام سے بچتے ہوئے اپنی خواہشات کو ترک کردے۔ حب دنیا اور حب جاہ سے بے رغبت ہو۔

متقی وہ بندہ ہے جو ہر اس عمل کو ترک کردے جو اللہ کے لیے نہ ہو۔

خلافت کے مختلف فیہ شرائط

ان آٹھ متفقہ شرطوں کے علاوہ بھی علما و مشائخ نے کچھ اور شرطیں بھی ذکر کی ہیں جن کا ادراک ہر کسی کے لیے ممکن نہیں یا خلافت کے وقت ہی اس کا پایا جانا ضروری نہیں ہے اسی لیے ان کے شرط ہونے میں اختلاف ہے وہ شرطیں حسب ذیل ہیں:

خلافت کی خواہش سے بے نیاز ہو

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

تَجِدُوْنَ النَّاسَ مَعَادِنَ فَخِيَارُهُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُمْ فِي الْإِسْلَامِ إِذَا فَقِهُوْا وَ تَجِدُوْنَ مِنْ خَيْرِ النَّاسِ فِي هٰذَا الْأَمْرِ أَكْرَهُهُمْ لَهٗ قَبْلَ أَنْ يَّقَعَ فِيْهِ (۱)

تم لوگوں کو معدن (معدنی کان سے نکلی ہوئی چیز) کی مانند پاؤ گے جو جاہلیت میں اچھا ہوتا ہے وہی اسلام میں بھی اچھا ہوتا ہے جب وہ دین کی سمجھ پیدا کرلے اور تم اس امر خلافت کے لیے اسی شخص کو زیادہ موزوں پاؤ گے جو خلیفہ بننا ناپسند کرتا ہو۔

لَا تَسْأَلِ الْإِمَارَةَ فَإِنَّكَ إِنْ أُعْطِيْتَهَا عَنْ مَسْئَلَةٍ وُّكِلْتَ إِلَيْهَا وَ إِنْ أُعْطِيْتَهَا عَنْ غَيْرِ مَسْئَلَةٍ أُعِنْتَ عَلَيْهَا (۲)

امارت و خلافت کی خواہش نہ رکھو کیونکہ اگر یہ تمہیں مانگنے پر ملی تو تم (بے یار و مددگار)

(۱) الصحیح للمسلم، کتاب الامارۃ (رقم الحدیث: ۲۵۲۶)

(۲) الصحیح للمسلم، کتاب الامارۃ (رقم الحدیث: ۱۶۵۲)

اسی کے حوالے کردیے جاؤ گے اور اگر بغیر مانگے ملی تو اس میں تمہاری مدد کی جائیگی۔

عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہ' قَالَ دَخَلْتُ عَلَی النَّبِیِّ ﷺ اَنَا وَ رَجُلَانِ مِنْ بَنِیْ عَمِّیْ فَقَالَ اَحَدُ الرَّجُلَیْنِ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَمِّرْنَا عَلٰی بَعْضِ مَا وَلاّٰکَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ وَ قَالَ الْاٰخَرُ مِثْلَ ذٰلِکَ فَقَالَ اِنَّا وَ اللّٰہِ لَا نُوَلِّیْ عَلٰی ھٰذَا الْعَمَلِ اَحَدًا سَأَلَہ' وَ لَا اَحَدًا حَرَصَ عَلَیْہِ (۱)

ابوموسیٰ سے روایت ہے کہ میں اپنے دو چچا زاد بھائیوں کے ساتھ نبی ﷺ کے پاس حاضر ہوا ان میں سے ایک بولا اے اللہ کے رسول ﷺ ہمیں کسی ملک کی حکومت دے دیجئے ان ملکوں میں سے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو دیے ہیں اور دوسرے نے بھی ایسا ہی کہا آپ نے فرمایا اللہ کی قسم ہم نہیں دیتے اس شخص کو جو اس کو مانگے اور نہ اس کو جو اس کی حرص رکھے۔

ان احادیث سے روشن ہوگیا کہ خلافت کی خواہش رکھنا تقوی کے خلاف ہے اس لیے ایسا شخص اس بات کی اہلیت نہیں رکھتا کہ اسے مسند ارشاد پر فائز کیا جائے۔لیکن جب اس شرط کا شمار تقوی کے ضمن میں کیا جا سکتا ہے تو الگ سے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

ا۔قرشی ہو

اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

الْاَئِمَّۃُ مِنْ قُرَیْشٍ (۲) ائمہ صرف قرشی ہوں گے۔

جمہور علما اسی طرف گئے ہیں کہ خلافت ظاہری پر خاندان قریش ہی کے افراد فائز رہیں گے۔لیکن ہر دور میں اس نظریہ کی ایک جماعت نے مخالف کی ہے ان کا ماننا ہے کہ زمانہ جاہلیت سے ہی عربوں میں قریش ہی کی سیادت تھی کیوں کہ کعبہ جو عربوں کے لیے مرکز کی حیثیت رکھتا تھا، حج کے موقع پر پورا عرب وہاں امنڈ پڑتا تھا، ان حاجیوں کی خدمت قریش ہی کیا کرتے تھے۔اس لیے کعبہ اور اس کے محافظ قریش سے ان کی محبت فطری تھی، اسلام نے چاہا کہ ابتدا میں امر خلافت ان کے ہی ذمہ رہے تا کہ بلا اختلاف اور بلا تفرقہ تمام عرب ان کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں لیکن جب اسلام عربوں سے نکل کر عالم پر چھا گیا تو اس حدیث کو صرف ظاہر پر محمول نہیں کریں گے بلکہ اس کا معنی و مفہوم سمجھنے کی کوشش کریں گے تا کہ اسلام پر حمیت و عصبیت کا داغ نہ لگے کیوں کہ اسلام

---

(۱) الصحیح للمسلم، کتاب الامارۃ (رقم الحدیث: ۱۷۳۳)

(۲) مسند احمد بن حنبل (رقم الحدیث: ۱۲۳۰۷)

ان برائیوں کومٹانے آیا تھا۔ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

أَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى عَجَمِيٍّ، وَ لَا لِعَجَمِيٍّ عَلَى عَرَبِيٍّ، وَ لَا أَحْمَرَ عَلَى أَسْوَدَ، وَ لَا أَسْوَدَ عَلَى أَحْمَرَ، إِلَّا بِالتَّقْوَى (۱) کسی عربی کو عجمی پر، کسی عجمی کو عربی پر، کسی کالے کو گورے پر، کسی گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں ہے مگر تقوی کی بنیاد پر۔

علما کی ایک جماعت نے اس حدیث کا معنی یہ بتایا ہے کہ جو قوم یا فرد، دشمنوں سے سلطنت اسلامیہ کے حدود کی حفاظت کر سکے، ان کے درمیان عدل قائم کر سکے، مذہب اسلام کی نشر و اشاعت کر سکے وہ قرشی یعنی بہادر ہے مسلمانوں کو ایسے لوگوں کی سیادت و خلافت قبول کرنی چاہیے۔

اسی حدیث کی بنیاد پر صوفیہ کی ایک جماعت ادھر گئی ہے کہ خلافت باطنی یعنی قطبیت کبری و غوثیت عظمی ہمیشہ قرشیوں کے ہاتھ ہی میں رہے گی، لیکن عام خلافت ہر اس فرد کو دی جاسکتی ہے جس میں مذکورہ شرائط پالی جائیں۔

یہاں ایک بات کی طرف تنبیہ کرنا زیادہ مناسب ہوگا کہ خانقاہوں یا درگاہوں میں جو خلافت یا تولیت کا سلسلہ چل رہا ہے اس میں بھی ان دونوں باتوں کا خیال رکھا جائے تو اختلاف و انتشار سے کافی حد تک بچا جا سکتا ہے۔

پہلی بات یہ کہ تولیت ہمیشہ خاندان کے افراد ہی کو سونپی جائے اور اگر وہ شخص اس لائق بھی ہو کہ اس میں شرائط مذکورہ پالیے جائیں تو خلافت و تولیت یعنی سجادگی دونوں دے دی جائے ورنہ ایک یعنی تولیت پر اکتفا کیا جائے۔

دوسری بات یہ کہ جس میں شیخ خلافت کی اہلیت پالی جائے، اسی کو خلافت دی جائے۔ اگر چہ وہ خاندان کا نہ ہو لیکن اس سے یہ بھی کہہ دیا جائے کہ وہ خانقاہ دوسری جگہ قائم کرے تا کہ اختلاف و انتشار نہ ہو۔

ہماری یہ بات صرف تاریخی بنیادوں پر منحصر ہے کیوں کہ بڑے بڑے مشائخ جو اپنے شیخ کے خاندان کے نہیں تھے، ان کے ساتھ یہ ہوا کہ وہاں کے لوگ ان کے باغی ہو گئے اور رشد و ہدایت کا کام رک گیا۔ آخر ان کو وہاں سے ہجرت کر کے دوسری جگہ خانقاہ بنانی پڑی۔

۲۔ سالک مجذوب ہو یا مجذوب سالک ہو

مرشد بنانے کی شرط میں یہ بتایا جاتا ہے کہ شیخ یا تو سالک مجذوب ہو یا مجذوب سالک ہو۔ مجھے یہ لگتا ہے کہ خلافت دینے اور مرشد بنانے میں فرق ہے۔ خلافت تو شرائط مذکورہ کے بعد

---

(۱) مسند احمد بن حنبل (رقم الحدیث: ۲۳۴۹۰)

ہی صرف اجتہاد یا غیبی اشارے کی بنیاد پر دی جاسکتی ہے کہ وہ شخص جو ابھی صالح و متقی ہے، آہستہ آہستہ مشائخ کی روحانیت کے سایہ میں اپنے سلوک کا تکملہ کر لے گا اور معرفت کا جام نوش کرنے لگے گا۔ گویا خلافت کی اہلیت کے لیے ابتداءً یہ شرط لگانا مناسب نہیں ہے کہ وہ اس وقت سالک مجذوب ہو یا مجذوب سالک ہو۔ ہاں! اس کے لیے یہ مناسب ہے کہ جب تک سلوک کا تکملہ نہیں ہوتا اس وقت تک اسے مرید نہ کرنا چاہیے، لیکن اگر کسی کے اندر صدق ارادت پائے تو اسے مشائخ کے سلسلے میں منسلک کر لینا چاہیے اور ایسے صادقین کو اپنے لیے ذریعۂ نجات سمجھنا چاہیے۔

کیا مجذوب محض کی خلافت جائز ہے؟

مشائخ نے تو یہ لکھا ہے کہ مجذوب محض کو مرشد نہیں بنانا چاہیے گویا مجذوب خلافت کا بھی اہل نہیں ہے۔ لیکن ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ مجذوب محض کہنا فقط اجتہادی مسئلہ ہے یا امور غیبیہ سے ہے اسی طرح ملامتی کہنا بھی اسی قبیل سے ہے کیوں کہ ہم بہت سے مشائخ کو دیکھتے ہیں کہ ان پر ہمیشہ ایک قسم کی جذبی کیفیت طاری رہتی ہے پھر بھی وہ صاحب ارشاد و خانقاہ ہوتے ہیں یہی صورت حال ملامت کی چادر اوڑھنے والوں کی بھی ہے۔

یہ بات صحیح ہے کہ اکثر ایسے لوگوں کا فیض عام نہیں ہوا لیکن ان میں بعض وہ بھی ہیں جنھوں نے کسی ایک ہی کو اپنی ساری نعمتیں عطا کر دیں اور فقط یاد صنم دید صنم میں مست رہے، یہ سلسلہ کبھی کبھی کئی نسلوں تک جاری رہا لیکن پھر جب اللہ نے چاہا انھیں میں سے کسی ایک سے کثیر مخلوق کو فیض پہنچا۔

ان ہی نادرات میں وہ مشائخ بھی ہیں جنھیں کسی وفات یافتہ شیخ سے ایسی قوی نسبت قائم ہوگئی کہ انھوں نے اس عاشق و مجذوب کو روحانی طور سے تربیت کر کے خلافت سے نواز دیا لیکن ایسی خلافت کو اس وقت قبول کیا جائے گا جب کہ اس نے کسی جامع شرائط شیخ کی صحبت اختیار کی ہو اور مشائخ زمانہ نے اس کی اس اویسی خلافت کو مسترد نہ کیا ہو بلکہ ان کی بھی تائید حاصل ہو۔

۳۔ امراض قلبیہ کی تشخیص اور اس کا علاج جانتا ہو

یقیناً یہ بات صحیح ہے کہ شیخ کو ایسا ہونا چاہیے کہ وہ امراض قلبیہ کی تشخیص کرنا اور ان کا علاج کرنا بھی جانتا ہو لیکن یہ تجربہ پر منحصر ہے، خلافت تفویض کرتے وقت مکمل طور سے اس کا جاننا ضروری نہیں ہے جیسے MBBS بھی ڈاکٹر ہی کہا جاتا ہے لیکن اگر وہ PG کر لیتا ہے تو وہ بہتر انداز سے علاج و معالجہ کر سکتا ہے جب کہ وہ بھی اپنے آپ کو مکمل نہیں کہہ سکتا کیوں کہ اس کے بھی تجربات دن بدن بڑھتے رہتے ہیں۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہم عبد العلیم ہیں علیم نہیں، عبد القادر ہیں قادر نہیں۔

خلافت کب یا کیسے دے؟

خلافت دوطرح سے دی جاتی ہے: (۱) اشارات غیبیہ سے (۲) اجتہاد سے

اشارات غیبیہ یعنی شیخ کے دل میں تواتر سے بار بار یہ آتا ہو کہ فلاں کو خلافت دے دی جائے وہ اس کا اہل ہے یا صراحت کے ساتھ مشائخ طریقت میں سے کوئی عالم واقعہ میں کسی کو خلافت دینے کا حکم دے۔

اشارات غیبیہ سے خلافت دینے کے لیے کوئی شرط نہیں ہے، لیکن مناسب یہ ہے کہ اس اشارے کو بھی اپنے اصحاب حل وعقد کے سامنے پیش کرے کہ فلاں کے بارے میں خلافت دینے کا خطرہ آرہا ہے، اسی طرح یہ بھی دیکھ لے کہ اس کا ظاہر صحیح وسالم ہے کہ نہیں تا کہ تہمت سے بچا جاسکے لیکن یہ سب احتیاطی تدابیر ہیں۔

اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ شیخ شرف الدین یحییٰ منیری قدس اللہ سرہ کے شیخ دہلی میں ان کو خلافت دینے کے لیے انتظار کر رہے تھے اور جیسے ہی آپ ان کے پاس پہنچے آپ نے ان کو خلافت دے دی اور یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ تم جاؤ اور راستے میں کوئی خبر سنو تو واپس نہ آنا، انھوں نے عرض کیا: حضور میری تربیت؟ آپ نے فرمایا: بارگاہ رسالت سے ہوگی۔

لیکن اجتہاد سے خلافت دینے کے لیے صحبت کی شرط ضروری ہے، صرف کسی کے مشورے کی بنیاد پر خلافت نہیں دی جاسکتی ہے، ہاں اگر شیخ نے صحبت مدیدہ کے بعد یہ اجتہاد کیا کہ یہ شخص خلافت کے لائق ہے اب اس اجتہاد کے بعد اصحاب طریقت سے مشورہ کیا جائے تو بہتر ہے۔

اس سلسلے میں حضرت عمر کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ آپ سے کسی نے کہا کہ فلاں شخص نیک ہے۔ آپ نے اس سے کہا: تم اس کے پڑوسی ہو؟ تم نے اس کے ساتھ سفر کیا ہے؟ اس کے ساتھ تم نے کوئی معاملہ ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ تو آپ نے فرمایا: تب تم نے کیسے جانا کہ وہ نیک ہے؟ (۱)

صحبت کے بغیر اجتہاد سے خلافت دینا دین کے ساتھ کھلواڑ کرنا ہے۔ العیاذ باللہ

جب شیخ نے خلافت دینے کا ارادہ کر لیا ہو تو شیخ کو چاہیے کہ مناسب موقع کا انتخاب کرے، مجمع عام میں یا ثقہ وعادل اشخاص کی موجودگی میں خلافت دے۔

خلافت کے واجبات

ہر نعمت کے کچھ حقوق اور کچھ واجبات ہوتے ہیں، خلافت بھی ایک نعمت ہے اسی لیے خلیفہ کی کچھ ذمہ داریاں ہیں اگر وہ ان ذمہ داریوں کو ادا نہ کرے تو اس سے قیامت کے دن اس

---

(۱) احیاء علوم الدین، کتاب آداب السفر، الباب الاول۔ قال ابن حجر: صححہ علی بن السکن

کے متعلق سوال ہوگا، ہم ذیل میں قرآن وسنت اور مشائخ کے اقوال کی روشنی میں کچھ ذمہ داریوں پر روشنی ڈالتے ہیں:

۱۔طالبان مولیٰ کی حفاظت وصیانت: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

وَ إِنَّمَا الإِمَامُ جُنَّةٌ يُقَاتَلُ مِنْ وَرَائِهِ وَيُتَّقَى بِهِ(۱) امام ڈھال ہے اس کے سایہ میں لڑا جاتا ہے اور اس کی پناہ لی جاتی ہے۔

خلافت ظاہری کے سایہ میں دشمنان اسلام یا باغیان وطن سے قتال کیا جاتا ہے لیکن خلیفۂ باطن اور مرشد کی صحبت ونگہبانی میں نفس وشیطان سے پناہ مانگی جاتی ہے اور شیخ کی روحانیت کے سایہ میں ان دونوں کی خباثت سے بچا جاتا ہے، اسی لیے خلیفہ کو صاحب ہمت ہونا چاہیے اور اگر یاران طریقت نفس وشیطان سے پناہ لینے کے لیے اس کی طرف متوجہ ہوں تو اسے چاہیے کہ روحانی طور پر ان کی مدد کرے۔

میرے ایک رفیق دیرینہ نے سوال کیا کہ میں اپنے شیخ کو اتنا مانتا ہوں گویا میں ان میں فنا ہوں اور خواہش رکھتا ہوں کہ وہ مجھے اپنی صحبت سے نوازیں۔ اس کے لیے میں نے ان کی بارگاہ میں کئی بار عریضہ بھی پیش کیا لیکن انھوں نے کبھی کوئی جواب نہیں دیا، کئی بار میں نے اپنی سیاہ کاریاں لکھ بھیجی اور یہ درخواست کی کہ میں ان گناہوں سے بچ نہیں پاتا آپ میری طرف توجہ کریں۔

میرے دوست نے بڑے کرب کے عالم میں یہ باتیں مجھ سے سنائی، میں نے ہمدردانہ انداز میں ان کی ساری باتوں کو سنا ان کو تو میں نے کوئی جواب نہیں دیا صرف اپنے لیے اور ان کے لیے دعا کرتا رہا۔

لیکن میرے دل میں یہ بات بار بار آتی رہی کہ مرید کو ہمیشہ اپنی ارادت کا نقص سمجھنا چاہیے، اللہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے کیوں کہ شیخ محض مطلب ہے، بندے کا مطلوب حقیقی صرف اللہ ہے اور جب بندہ مخلص ہوگا تو اللہ ضرور اسے ہدایت دے گا۔ لیکن شیخ کو بھی یہ چاہیے کہ اگر وہ اس میدان کا شہ سوار نہیں اور طالبین کی تربیت میں کامل نہیں اور سالکین کے سلوک کی تکمیل کرانے پر قادر نہیں تو وہ شیخ اپنے مرید کو کسی دوسرے شیخ کے سپرد کردے یا کم از کم جس نے اللہ کی معرفت حاصل کرنے کے لیے آپ کو وسیلہ بنایا ہے اس کے حق میں ہر لحظہ دعا گو رہے اور یہ سمجھے کہ اللہ اسے مجھ ناقص کے ہی ہاتھ پر کمال تک پہنچا دے۔

صدق ارادت کے ساتھ ساتھ مرید پر بھی یہ لازم ہے کہ شیخ کے انتخاب میں جلدی نہ کرے یہ دیکھ لے کہ اس شیخ سے آج تک کسی نے فیض پایا ہے کہ نہیں، اس کی صحبت سے ان کے متعلقین میں

---

(۱) الصحیح للمسلم، کتاب الامارۃ (رقم الحدیث: ۱۸۴۱)

دین پر عمل پیرا ہونے کا جذبہ پیدا ہوا ہے کہ نہیں اگر جواب نفی میں ہے کہ تو کوئی دوسرا شیخ تلاش کرے۔

۲۔خانقاہ کا قیام: جب کسی کو اس کے تمام تر نقص کے باجود پیروں نے اپنا کام سپرد کر دیا ہے، اللہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نیابت کے لیے منتخب کر لیا ہے تو اسے چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے مطابق رشد و ہدایت کا کوئی شہر بسائے، جہاں اصحاب صفہ یعنی طالبان مولی کے لیے ایک جگہ آباد کرے تا کہ طالبین و سالکین اور غربا و مساکین کی دینی و دنیوی ضرورت کی تکمیل ہو سکے۔

جو بھی طالبین و سالکین اس کے پاس آئیں ان کے ساتھ حسن اخلاق کے ساتھ پیش آئے، ان کی ضرورتیں پوری کرے، ان کی خدمت پورے اخلاص کے ساتھ کرے اور صرف رضائے الٰہی کا جویاں رہے، نیت میں بے ثبات چیزوں کی آمیزش نہ ہونے دے۔

مشائخ نے اپنے دینی بھائیوں، دوستوں اور خدام کی ناز برداری کی ہے ان کے ساتھ بھی تواضع و انکساری کا مظاہرہ کیا ہے، تربیت کے لیے ان پر اظہار ناراضگی کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں تا کہ ہیبت و اجلال دل سے ختم نہ ہو جائے، مشائخ کی عظمت اور ہیبت کا ختم ہونا بھی طالبین کی ہلاکت کا باعث ہے لیکن جذبہ برتری ذرہ برابر بھی نہ ہو کیوں کہ کسی بھی ابن آدم سے اپنے آپ کو برتر سمجھنا ابلیسیت ہے۔ اللہ تعالی نے اپنے رسول کی شان اس طرح بیان فرمائی ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ (آل عمران:۱۵۹) یہ اللہ کی کیسی مہربانی ہے کہ اے محبوب! آپ نے اپنے اصحاب کے ساتھ نرمی و رافت کا مظاہرہ کیا اور اگر آپ سخت دل ہوتے تو وہ لوگ ضرور آپ کے اردگرد نہ ہوتے تو آپ انھیں معاف کر دیں اور ان کی مغفرت طلب کریں۔

پیران عظام کے لیے یہاں ایک بات کی طرف توجہ مبذول کرانا ضروری ہے کہ جو بھی مسلمان بھائی آپ کے پاس طلب مولیٰ اور صدق ارادت کے ساتھ آئے تو وہ اللہ کا مرید اور اس کا طالب ہے، آپ کا مرید نہیں ہے بلکہ آپ کا رفیق سفر ہے، آپ اس کے معاون ہیں نہ کہ ہادی اور وہ آپ کا معاون ہے، ممکن ہے کہ طالبِ صادق کی وجہ سے اللہ آپ کے درجات کو بلند فرما دے۔ اسی لیے متقدمین مشائخ اپنے متبعین و محبین کو یاران طریقت، محب، رفیق جیسے الفاظ سے یاد کیا کرتے تھے۔

آج تو حال یہ ہے کہ شیخ تو شیخ اس کے خاندان والے بھی اپنے ہی شیخ کے مرید کو اپنا مرید گردانتے ہیں حالاں کہ اسے اپنا پیر بھائی کہنا چاہیے۔

۳۔لنگر عام: طالبین مولیٰ کے لیے قیام کے ساتھ طعام کا بھی انتظام کرے، دسترخواں کو فراخ رکھے، کسی کے لیے ممانعت نہ ہو، کھانا ہمیشہ ایسا بنوایا جائے جو سب کھا سکیں اور اگر کھانا کم ہو تو

اپنی نگرانی میں تقسیم کرائے اور صبر و رضا کی تلقین کرے اور طالبین کو چاہیے کہ صبر و ایثار سے کام لیں۔ اصحاب صفہ کی یہی سنت رہی ہے کہ مل جاتا تو آپس میں تقسیم کر لیتے اور ایثار سے کام لیتے، اگر نہیں ملتا تو بھی اللہ کا شکر ادا کرتے۔

۴۔ زنبیل گردانی: طالبین و سالکین کے انتظام و انصرام کے لیے اگر ضرورت پڑے تو خود اور اپنے رفقا سے زنبیل گردانی کرائے، چندہ کروائے اور اس کو صحیح مصرف میں خرچ کرے۔

۵۔ فتوحات کی تقسیم: اگر اللہ نے فتوحات کے دروازے کھول دیے تو خلیفہ کو چاہیے کہ ان مالوں کو دین متین کی خدمت میں صرف کرے، اپنے اور اپنے اہل و عیال کے تعیش کا سامان نہ بنائے کیوں کہ سارا مال اللہ کا ہے اسے تو خلافت میں ان فتوحات کی نظامت دی گئی ہے نہ کہ مالک کل بنا دیا گیا ہے۔

فتوحات کے متعلق اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے:

وَ اعْلَمُوا اَنَّمَا غَنِمْتُم مِّن شَیءٍ فَاَنَّ لِلّٰہِ خُمُسَہٗ وَ لِلرَّسُولِ وَ لِذِی الْقُرْبٰی وَ الْیَتٰمٰی وَ الْمَسٰکِینِ وَ ابْنِ السَّبِیلِ (الانفال:۴۱) اور جان لو کہ جو بھی مال غنیمت میں تمھیں ملا ہے تو اس کا پانچواں حصہ خاص اللہ، رسول، قرابت داروں، یتیموں، محتاجوں اور مسافروں کا ہے

اموال غنیمت میں اللہ رب العزت نے خمس (پانچواں حصہ) اپنے رسول کے لیے خاص کیا تو اس کو بھی قرابت دار، یتیم، مسکین اور ابن سبیل میں تقسیم کر دیا۔

اسی طرح اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

هَلْ تُنْصَرُونَ وَ تُرْزَقُونَ إِلا بِضُعَفَائِكُمْ (۱) تم میں جو کمزور لوگ ہیں ان ہی کے صدقے تمہاری مدد کی جاتی ہے اور تمھیں رزق دیا جاتا ہے۔

إِنَّمَا يَنْصُرُ اللّٰهُ هَذِهِ الأُمَّةَ بِضَعِيفِهَا بِدَعْوَتِهِمْ وَ صَلاتِهِمْ وَ إِخْلاصِهِمْ (۲) اللہ تعالی اس امت کی مدد ان کے کمزور لوگوں کی دعا، نماز اور اخلاص کی وجہ سے کرتا ہے۔

اسی لیے خلیفہ کو چاہیے کہ جو فتوحات اللہ نے اسے دی ہے طالبین و سالکین پر خرچ کرے۔

شوری کا قیام: اللہ کے رسول کو حکم دیا گیا:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (آل عمران:۱۵۹) اور معاملات میں ان سے مشورہ لیں۔

---

(۱) الصحیح للامام البخاری (رقم الحدیث:۲۸۹۶)

(۲) سنن النسائی (رقم الحدیث:۳۱۷۸)

اصحاب رسول کی شان بیان کرتے ہوئے اللہ تعالی فرماتا ہے:

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (شوری:۳۸) ان کے معاملات آپس کے مشورے سے طے ہوتے ہیں۔

اس لیے چھوٹے سے چھوٹے امور میں اصحابِ حل وعقد سے مشورہ ضرور کرے۔

خلافت کے حقوق

جس طرح شیخ وخلیفہ پر کچھ چیزیں واجب ہیں اسی طرح ان کے کچھ حقوق بھی ہیں جن کو ادا کرنا طالبین وسالکین پر لازم ہے تاکہ افادہ واستفادہ عام وتام ہوسکے، ذیل میں چند اہم حقوق پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

۱۔اتباع: اللہ تعالی کا فرمان ہے:

أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ (النساء:۵۹) اللہ ورسول اور اپنے امیر کی پیروی کرو۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

مَنْ بَايَعَ إِمَامًا، فَأَعْطَاهُ صَفْقَةَ يَدِهِ، وَثَمَرَةَ قَلْبِهِ، فَلْيُطِعْهُ مَا اسْتَطَاعَ(۱) جس نے کسی امام سے بیعت کرلی اس نے گویا اس سے عہد و پیمان کرلیا اس لیے جہاں تک ہوسکے اس کی اطاعت کرے۔

اس لیے دین سیکھنے اور معرفت حاصل کرنے کے لیے جب ایک شیخ کامل کے دست مبارک پر عہد و پیمان کرلیا تو جہاں تک ممکن ہو اس کی پیروی کرے اور اس کے بتائے ہوئے راستہ پر چلے تبھی فلاح پائے گا۔

شیخ کی مشروط اتباع: احکام شرعیہ کے تمام اقسام کو ہم تین حصوں میں بانٹ سکتے ہیں:

۱۔فرض یا حرام قطعی

۲۔فرض وواجب ظنی ومختلف فیہ، حرام ظنی یا مختلف فیہ، مکروہ تحریمی

۳۔سنت، مستحب، مباح، مکروہ تنزیہی، خلاف اولی

پہلی صورت میں شیخ کی اطاعت جائز نہیں یعنی اگر شیخ فرض قطعی کے ترک یا حرام قطعی کے عمل کا حکم دے تو اس میں اس کی پیروی نہیں کی جائے گی بلکہ ایسا شخص شیخ ہی ہونے کے لائق نہیں ہے جو حرام کے ارتکاب کا حکم دے کیوں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

---

(۱) مسند احمد بن حنبل (رقم الحدیث:۶۱۰۵)

لَا طَاعَةَ فِي مَعْصِيَةِ اللّٰہِ، إِنَّمَا الطَّاعَةُ فِي الْمَعْرُوفِ (۱) اللہ کی نافرمانی میں کسی کی اتباع جائز نہیں، طاعت تو صرف معروف میں ہے۔

اس حدیث میں دو کنارے متعین کردیے گئے ہیں ایک طرف یہ متعین ہے کہ طاعت صرف معروف میں واجب ہے تو دوسری طرف یہ ہے کہ منکر میں کسی کی اطاعت نہیں، شرع میں معروف ومنکر اس کو کہتے ہیں جس کا کرنا اور نہ کرنا بین اور واضح ہوں، ان دونوں حدود کے درمیان آپ کو اختیار ہے چاہیں تو عمل کریں چاہیں تو ترک کردیں لیکن شرع کے اس اختیار کو ہم نے برضا و رغبت شیخ کے حوالے کردیا اس لیے اس حدود کے درمیان شیخ جو بھی حکم دے اس پر عمل کرنا واجب ہے جس طرح سے ایفائے عہد اور نذر واجب ہے حالاں کہ شرع ان کو واجب نہیں قرار دیا ہے اس کی مزید وضاحت حضرت عبادہ بن صامت کے اس روایت سے ہوجاتا ہے وہ فرماتے ہیں:

أَنْ بَايَعَنَا عَلَى السَّمْعِ وَ الطَّاعَةِ، فِي مَنْشَطِنَا وَ مَكْرَهِنَا، وَ عُسْرِنَا وَ يُسْرِنَا وَ أَثَرَةً عَلَيْنَا، وَ أَنْ لَا نُنَازِعَ الأَمْرَ أَهْلَهُ، إِلَّا أَنْ تَرَوْا كُفْرًا بَوَاحًا، عِنْدَكُمْ مِنَ اللّٰہِ فِيهِ بُرْهَانٌ (۲) کہ ہم نے اس بات پر بیعت کی کہ اپنی خواہش کو قربان کرکے خوشی وناگواری اور تنگی وآسانی ہر حال میں امیر کی بات سنیں گے اور اطاعت کریں گے، ہم کبھی بھی امیر سے کسی بھی معاملہ نزاع نہیں کریں گے، مگر اس میں جس میں ہم اس کو اللہ کی اس حکم کی نافرمانی کرتے ہوئے پائیں جس کے بارے میں ہمیں یہ یقین ہو کہ یہ اللہ ہی کی جانب سے ہے۔

ان دونوں روایت سے یہ واضح ہوگیا کہ فرض قطعی اور حرام بین کے علاوہ میں ہم شیخ کی پیری کریں گے کیوں شرع نے ہمیں اس میں اختیار دیا تھا اور اس اختیار کو ہم نے اپنے امیر یا شیخ کے سپرد کردیا ہے جیسے امام نماز کی پیروی ترک واجب ومستحب میں جائز ہی نہیں بلکہ ضروری ہے، ہاں اگر وہ فرض کو ترک کررہا ہے تو اس کی پیری نہیں کی جائے گی بلکہ اخیر اخیر تک اس بات کا انتظار کیا جائے گا کہ وہ صحیح اور درست عمل کی طرف لوٹ جائے۔

ہاں اگر شیخ خلاف واقع یا خلاف شرع امر کی بجا آوری کا حکم دے تو اس کی پیروی نہیں کی جائے گی لیکن اس سے جدل اور سب وشتم سے بچا جائے گا، اسے معذور جانا جائے گا اس لیے کہ شیخ بھی بشر ہے نبی نہیں، اس کے قول وفعل کی جہاں تک ممکن ہو تاویل کرنی چاہئ، اللہ کے رسول

---

(۱) الصحیح للامام البخاری (رقم الحدیث: ۷۲۵۷) الصحیح للامام مسلم (رقم الحدیث: ۱۸۴۰)

(۲) الصحیح للامام البخاری (رقم الحدیث: ۷۰۵۶)

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

مَا ضَلَّ قَوْمٌ بَعْدَ هُدًى كَانُوا عَلَيْهِ إِلَّا أُوتُوا الْجَدَلَ، ثُمَّ تَلَا هٰذِهِ الْآيَةَ: مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ إِلَّا جَدَلًا بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ (الزخرف:۵۸) (۱) ہدایت کے بعد وہی قوم گمراہ ہوئی جس نے جدل ومباحثہ کیا۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیت کریمہ کی تلاوت فرمائی: انھوں نے آپ سے جھگڑا کیا بلکہ وہ لوگ جھڑا کرنے والے ہی ہیں۔

دعا و استغفار: شیخ و مرید میں سے ہر ایک کو چاہیے کہ ایک دوسرے کے حق میں دعا کرے، خیر خواہ و خیر اندیش ہو، پوری امت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صلاۃ وسلام بھیجتی ہے، جس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ اے اللہ! نبی کریم پر اپنی رحمت وسلامتی نازل فرما۔ اور خود اللہ کے رسول نے اپنے لیے بھی امت سے دعا کی درخواست فرمائی ہے آپ فرماتے ہیں:

سَلُو اللّٰهَ لِيَ الوَسِيلَةَ۔ قَالُوا: يَا رَسُولَ اللّٰهِ وَمَا الوَسِيلَةُ؟ قَالَ: أَعْلَى دَرَجَةٍ فِي الجَنَّةِ لَا يَنَالُهَا إِلَّا رَجُلٌ وَاحِدٌ أَرْجُو أَنْ أَكُونَ أَنَا هُوَ (۲) اللہ سے میرے لیے وسیلہ طلب کرو۔ صحابہ نے دریافت کیا: وسیلہ کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جنت کا اعلی درجہ ہے، یہ صرف ایک ہی شخص کو دیا جائے گا، میں سمجھتا ہوں کہ وہ میں ہی ہوں گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَصَلِّ عَلَيهِم، اِنَّ صَلاتَكَ سَكَنٌ لَهُم۔** (التوبۃ: ۱۰۳) آپ ان کے لیے دعائے رحمت کیجیے، آپ کی دعا ان کے لیے باعثِ سکینہ ہے۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہے: **وَاستَغفِر لِذَنبِكَ وَلِلمُؤمِنِينَ وَالمُؤمِنَاتِ۔** (محمد:۱۹) اپنے لیے خلافِ اولیٰ کی مغفرت طلب کیجیے اور ایمان والوں اور ایمان والیوں کے گناہوں کی مغفرت کی دعا کیجیے۔

اسی طرح صحابہ واولیا کا ذکر رضی اللہ عنہ، رحمۃ اللہ علیہ، قدس اللہ سرہ وغیرہ کے ساتھ ہی کیا جاتا ہے یہ سارے الفاظ دعائیہ ہیں، ان تمام دعاوں کا فائدہ خود دعا کرنے والوں کو بھی ہوتا ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مَا مِنْ عَبْدٍ مُسْلِمٍ يَدْعُو لِأَخِيهِ بِظَهْرِ الْغَيْبِ، إِلَّا قَالَ الْمَلَكُ: وَلَكَ بِمِثْلٍ (۳) کوئی بھی مسلمان جب کبھی اپنے بھائی کے حق میں غائبانہ دعا کرتا ہے تو فرشتہ کہتا ہے:

---

(۱) مسند احمد بن حنبل (رقم الحدیث: ۲۲۱۶۴)

(۲) مسند احمد بن حنبل (رقم الحدیث: ۷۵۹۸)

(۳) الصحیح للامام مسلم (رقم الحدیث: ۲۷۳۲)

تمہارے لیے بھی ایسا ہی ہو جیسا کہ تم نے اپنے بھائی کے حق میں دعا کی ہے۔

خلیفہ کو بشر ہی جاننا ضروری ہے

اس وقت امت میں جو انتشار پیدا ہوا ہے اس میں بہت حد تک اس فہم کا بھی قصور ہے کہ میرا امام، میرا شیخ، میرا سلسلہ سب سے اچھا اور سب سے اعلیٰ ہے، میرا شیخ معصوم ومحفوظ ہے یعنی واجب العصمت تو نہیں لیکن ممکن العصمت ہے، اس فارمولہ نے برتری اور حسد کی جو راہیں کھولی ہیں اس نے مسلمانانِ عالم کے شیرازہ کو بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ العیاذ باللہ۔ اپنی انا کی تسکین کے لیے یہ سارے قاعدے تو بتائے جاتے ہیں لیکن کبھی یہ نہیں بتایا جاتا کہ میں بشر ہوں اور روزانہ ہزاروں خطائیں کرتا ہوں بس فرق یہ ہے کہ اللہ نے میرے عیب کو ظاہر نہیں کیا ہے اور دوسروں کے عیب کو اس دنیا میں ہی ظاہر کر کے آخرت کے عذاب کو کم کر دیا ہے۔

اپنے حد تک تو یہ صحیح ہے کہ میرا شیخ میری نگاہ میں محفوظ ہے لیکن پوری امت ویسے ہی مانے جیسے میں مانتا ہوں غلط ہے اور یہ تفرقہ کا سبب ہے بلکہ بعض مواقع پر شیخ کے اجتہاد کو من وعن تسلیم کرنے کی ضد تو اپنے حق میں بھی جمود کا سبب بنتی ہے۔ ہمیں اپنے مشائخ کو بشر ہی جاننا چاہیے، اس کے باوجود وہ ہم سے ہزاروں ہزار درجے بلند ہیں یہ بھی تسلیم کرنا چاہیے۔

طالب ومرید پر جب یہ بات واضح ہوگی کہ مشائخ بھی بشر ہیں اور ان سے خطا ہونا بھی ممکن ہے اور ان سے ظلم وستم کے صدور کا امکان بھی ہے، مرید اپنے آپ کو ثابت قدم رکھنے کے لیے اچھی تاویل کرے گا۔ کیوں کہ گلاب کے ساتھ کانٹے بھی ہوتے ہیں اسی سلسلے میں امام شافعی نے سفیان بن عیینہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ کسی نے ان سے کہا کہ اکناف عالم سے آپ کے پاس لوگ آتے ہیں آپ ان پر غیظ وغضب ڈھاتے ہیں تو کہیں لوگ آپ کو چھوڑ کر چلے نہ جائیں، انھوں نے جواب دیا: وہ لوگ تمہاری طرح احمق ہوں گے کہ میرے بدسلوکی کی وجہ سے اپنے نفع کی چیز کو چھوڑ کر چلے جائیں گے(۱)

شیخ کی بارگاہ کے آداب: اس کے علاوہ بھی بہت سارے خلیفہ کے حقوق ہیں جن میں سے بہت کا ذکر میں نے اپنے مضمون ''بیعت وارادت کے مفہوم پر ایک تحقیقی نظر'' (الاحسان-۶) کے ضمن میں کر دیا ہے۔ لیکن اب ہم اپنی گفتگو مرید کے آداب سے متعلق امام ربانی مجدد الف ثانی کے ایک مکتوب کے خلاصے پر ختم کرتے ہیں۔

جان لیں کہ طالب کو چاہیے کہ اپنے قبلۂ دل کو ہر طرف سے ہٹا کر اپنے مرشد کی طرف متوجہ کرے اور پیر کی خدمت میں رہتے ہوئے اس کی اجازت کے بغیر

---

(۱) الجامع للخطیب (۱/ ۲۲۳)

نوافل واذکار میں مشغول نہ ہو اور نہ ہی اس کی موجودگی میں اس کے علاوہ کسی اور کی طرف التفات کرے، پوری طرح اسی کی طرف توجہ کیے رہے یہاں تک کہ جب تک وہ حکم نہ دے ذکر میں مشغول نہ ہو اور اس کی خدمت میں رہتے ہوئے نماز فرض وسنت کے علاوہ کچھ ادا نہ کرے۔

جہاں تک ممکن ہو اس کے مصلے پر پاؤں نہ رکھے...... پیر کی غیر موجودگی میں جہاں پیر رہتا ہے یا بیٹھتا ہے اس جگہ کی طرف پاؤں نہ پھیلائے اور نہ اس کی طرف تھوکے۔ جو کچھ پیر سے صادر ہو اس کو صواب جانے اگرچہ بظاہر درست معلوم نہ ہو وہ جو کچھ کرتا ہے الہام سے کرتا ہے اور اللہ تعالی کی اذن سے کرتا ہے لہذا اس صورت میں اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں ہے اگرچہ بعض صورتوں میں اس کے الہام میں خطا کا ہونا ممکن ہے لیکن خطائے الہامی خطائے اجتہادی کے مانند ہے اس پر ملامت واعتراض جائز نہیں۔

طاعت کرنے کے ہر چھوٹے بڑے کاموں میں پیر ہی کی اقتدا کرنی چاہیے نماز کو بھی اسی کے طرز پر ادا کرنا چاہیے اور فقہ کو بھی اسی کے عمل سے اخذ کرنا چاہیے۔

پیر کی حرکات وسکنات پر کسی قسم کی اعتراض کو دخل نہ دے اگرچہ وہ اعتراض رائی کے دانے کے برابر ہو کیونکہ اعتراض سے سوائے محرومی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا اور تمام مخلوقات میں سب سے بدتر وہ شخص ہے جو مشائخ کا عیب بین ہو۔

اپنے پیر سے خوارق وکرامات طلب نہ کرے اگرچہ وہ طلب خطرات قلبی اور وسائس کے قبیل سے ہو کیا آپ نے سنا کہ کسی مومن نے اپنے پیغمبر سے معجزہ طلب کیا ہو۔

اگر دل میں کسی قسم کا شبہ پیدا ہو تو اس کو بلا توقف پیر کی خدمت میں عرض کرے پھر بھی اگر حل نہ ہو تو اپنی تقصیر سمجھے، پیر کی طرف کسی قسم کی کوتاہی یا عیب ونقص منسوب نہ کرے۔ جو واقعہ بھی ظاہر ہو دل سے پوشیدہ نہ رکھے اور واقعات کی تعبیر اسی سے دریافت کرے۔ جو تعبیر خود طالب پر منکشف ہو وہ بھی عرض کر دے اور صواب وخطا کو اسی سے طلب کرے اور اپنے کشف پر ہرگز بھروسہ نہ کرے .....

ہاں اگر کوئی مرید اپنے پیر کی توجہ کی برکت سے فنا وبقا کے مرتبے پر پہنچ جائے اور اس پر الہام وفراست کا طریقہ کھل جائے اور پیر بھی اس کو تسلیم کر لے اس کے کمال کی گواہی دے تو اس مرید کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنے بعض الہامی امور میں اپنے پیر کے خلاف کرے اور اپنے الہام کے تقاضے پر عمل کرے اگرچہ پیر کے نزدیک

اس کے خلاف متحقق ہو چکا ہو کیونکہ وہ مرید اس وقت تقلید کے حلقہ سے باہر نکل آیا .....امام ابو یوسف کے لیے مرتبہ اجتہاد پر پہنچنے کے بعد امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہما کی تقلید کرنا خطا ہے بلکہ اپنی رائے کی متابعت میں صواب ہے نہ کہ امام ابو حنیفہ کی رائے میں۔(۱)

اللہ تعالیٰ ہمیں مشائخ کے ساتھ حسن ظن کی توفیق دے اور ان کی روحانیت و ہمت کے صدقے ہمیں اپنا عرفان عطا فرمائے۔ ○○○

---

(۱) مکتوبات امام ربانی، حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندی قدس سرہ السامی، دفتر اول، حصہ دوم، ملخص مکتوب: ۲۹۲۔ ناشر: حضرت شاہ ابوالخیر اکیڈمی

پروفیسر الطاف احمد اعظمی

بیعت وارادت: قرآن مجید اور آثار کی روشنی میں

بیعت کے لغوی معنی عہد و پیمان کے ہیں، اصطلاحاً اس سے مراد وہ معاہدہ ہے جس میں ایک شخص کی طرف سے اطاعت کو قبول کیا جاتا ہے۔ تصوف میں پہلا شخص مرید کہلاتا ہے اور دوسرا شخص شیخ مرشد۔ اور ارادت کے معنی رغبت اور عقیدت و شیفتگی کے ہیں، لیکن تصوف میں اس کا مفہوم ہے: مرید کا اپنے ارادہ و اختیار سے دست بردار ہو کر شیخ کے حکم و ارادہ کی کامل تابعداری کرنا، اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

تصوف میں بیعت ایک لازمی چیز ہے اس لیے کہ اصحاب تصوف کے نزدیک کسی شیخ کی رہ نمائی کے بغیر شریعت کا علم اور خدا تک رسائی ممکن نہیں ہے۔ علامہ احمد رضا قادری بیعت کی ضرورت و اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''قرآن وحدیث میں شریعت، طریقت، حقیقت سب کچھ ہے، ان میں سے سب سے زیادہ ظاہر و آسان مسائل شریعت ہیں۔ ان کی تو یہ حالت ہے کہ اگر ائمہ مجتہدین ان کی شرح نہ فرماتے تو علما کچھ نہ سمجھتے، اور علماء کرام اقوال ائمہ مجتہدین کی تشریح و توضیح نہ کرتے تو ہم لوگ ارشادات ائمہ کے سمجھنے سے بھی عاجز رہتے، اور اب اگر اہل علم، عوام کے سامنے مطالب کتب کی تفصیل اور صورت خاصہ پر حکم کی تطبیق نہ کریں، تو عام لوگ ہرگز ہرگز کتابوں سے احکام نکالنے پر قادر نہیں، ہزار جگہ غلطی کریں گے اور کچھ کا کچھ سمجھیں گے، اس لیے یہ سلسلہ مقرر ہے کہ عوام، آج کل کے اہل علم کا دامن تھامیں، اور وہ تصانیف علمائے ماہرین کا، اور وہ مشائخ فتویٰ کا، اور وہ ائمہ ہدیٰ کا، اور وہ قرآن وحدیث کا، جس شخص نے اس سلسلے کو توڑا وہ اندھا ہے، جس نے دامن ہادی ہاتھ سے چھوڑا، عنقریب کسی عمیق کنویں میں گرا چاہتا ہے۔''(۱)

علامہ قادری کا یہ خیال تو درست ہے کہ عوام اپنے زمانے کے کسی عالم دین کو جس کے علم

پر ان کو اعتماد ہو، اپنا رہنما بنالیں لیکن اصحاب علم (علما) کے لیے اسے کیوں کر درست کہا جا سکتا ہے۔ عالم ہونے کے ناطے ان کے لیے لازمی ہے کہ وہ براہ راست قرآن وسنت کی طرف رجوع ہوں۔ اگر قرآن وسنت کی تفہیم میں علما غلطی کر سکتے ہیں تو ائمہ مجتہدین سے بھی غلطی ہوسکتی ہے اور ہوئی ہے کہ وہ بہر حال معصوم عن الخطا نہیں تھے۔ تخریج احکام اور استنباط مسائل میں مختلف ائمہ کا اختلاف اس بات کا نا قابل تردید ثبوت ہے۔

تصوف میں محض رسمی بیعت کافی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ مرید اپنے ارادہ و اختیار سے کلی طور پر دست بردار ہو جائے اور شیخ جس بات کا حکم دے اس کو ادنیٰ تامل کے بغیر بجالائے۔ اس کے ذہن میں یہ خیال کبھی نہ آئے کہ شیخ کا کوئی حکم خلاف شرع ہوسکتا ہے۔ یہ خیال اس کے حق میں مہلک ثابت ہوگا، اس کی دنیا اور آخرت دونوں کے برباد ہونے کا احتمال ہے۔ اگر شیخ کی کوئی بات سمجھ میں نہ آئے یا اس کے متعلق دل میں کوئی معمولی سی بھی کھٹک محسوس ہو تو مرید کو چاہیے کہ وہ موسیٰ وخضر علیہما السلام کا قصہ یاد کرے اور فوراً توبہ کرے۔ اور اس بات کا ہمیشہ یقین رکھے کہ شیخ کی کوئی بات خواہ بظاہر کتنی ہی خلاف عقل ونقل معلوم ہو، خلاف حق نہیں ہوسکتی ہے۔ اس کے پاس اس کے جواز میں کوئی شرعی دلیل ضرور ہوگی۔ (۲)

اوپر جس بیعت کا ذکر ہوا وہ تصوف کی اصطلاح میں بیعت ارادت ہے اور سالکین سے یہی بیعت مطلوب ہے۔ علامہ احمد رضا قادری اس بیعت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''دوم بیعت ارادت کہ اپنے ارادہ واختیار سے یکسر باہر ہو، اپنے آپ کو شیخ مرشد، ہادی برحق، واصل حق کے ہاتھ میں بالکل سپرد کردے، اسے مطلقاً اپنا حاکم و مالک اور متصرف جانے، اس کے چلانے پر راہ سلوک چلے، کوئی قدم بے اس کی مرضی کے نہ رکھے، اس کے لیے بعض احکام یا اپنی ذات میں خود اس کے کچھ کام، اگر صحیح معلوم نہ ہو تو انہیں افعال خضر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مثل سمجھے، اپنی عقل کا قصور جانے، اس کی کسی بات پر دل میں بھی اعتراض نہ لائے، اپنی ہر مشکل اس پر پیش کرے، غرض اس کے ہاتھ میں مردہ بدست زندہ ہوکر رہے۔ یہ بیعت سالکین ہے اور یہی مقصود مشائخ مرشدین ہے۔ یہی اللہ عزوجل تک پہنچاتی ہے۔'' (۳)

اس اقتباس سے معلوم ہوا کہ مرید کے لیے شیخ کی مکمل اطاعت اسی طرح لازمی ہے جس طرح قرآن مجید میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کو غیر مشروط طور پر لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اصحاب تصوف کے بیان کے مطابق جو مرید شیخ کی کامل اطاعت سے انحراف کرے گا وہ نہ صرف راہ ہدایت کھودے گا بلکہ اللہ کی ناراضی بھی مول لے گا۔ اس سلسلے میں تین واقعات قابل ذکر ہیں:

پہلا واقعہ یہ ہے کہ حضرت بایزید (متوفی ۲۶۱ھ/ ۸۷۴ء) کا ایک خدمت گار مرید روزہ سے تھا، حضرت شقیق بلخی اور ابوتراب نخشبی نے اس سے کہا کہ روزہ توڑ دو اور ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہو جاؤ، تمہیں ایک سال کے روزے کا ثواب ملے گا۔ اس نے روزہ نہیں توڑا۔ خدمت گار کی اس نافرمانی پر حضرت بایزید نے فرمایا کہ اسے چھوڑو، یہ خدا کی نظر سے گر گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ابھی تھوڑا عرصہ گزرا تھا کہ وہ چوری کے الزام میں پکڑا گیا اور اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ (۴)

دوسرے واقعے کا تعلق شیخ ابوسعید ابوالخیر سے ہے۔ روایت ہے کہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر کہیں جا رہے تھے، راستے میں ان کا ایک مرید ملا اور اس نے جوش عقیدت میں شیخ کے زانو پر بوسہ دیا۔ شیخ نے کہا اور نیچے بوسہ دو تو اس نے ان کے پاؤں پر بوسہ دیا، شیخ نے کہا اور نیچے، تو مرید نے اپنا سر زمین پر رکھ دیا، شیخ نے اس جذبۂ اطاعت کو دیکھ کر فرمایا کہ تیرا درجہ بلند سے بلند تر ہو گیا۔ (۵)

تیسرا واقعہ یہ ہے کہ حضرت شبلی (متوفی ۳۳۴ھ/ ۹۴۵ء) نے ایک شخص سے جو مرید بننا چاہتا تھا، کہا کہ اگر وہ کلمہ ''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' کہنے کے بجائے ''لا الہ الا اللہ شبلی رسول اللہ'' کہے تو ان کا مرید بن سکتا ہے۔ اس نے اس ارشاد کی تعمیل کی اور ان کا مرید بن گیا۔ (۶)

اس خلاف شرع فعل کی ارباب تصوف نے یہ تاویل کی ہے کہ اس سے مقصود دراصل مرید کے صدق ارادت کا امتحان لینا تھا۔ (۷) لیکن شیخ عبدالکریم جیلی نے اس فعل کی یہ توجیہ کی ہے کہ درحقیقت شبلی کی شکل میں خود رسول اللہ تھے۔ (۸) یہی خیال وہ اپنے شیخ شرف الدین اسمٰعیل الجبرتی کے بارے میں رکھتے تھے۔ (۹)

شیخ مرشد کی ذات سے مریدوں کے غلوئے عقیدت اور شیخ کی غیر مشروط اطاعت کے تین واقعات آپ نے اوپر ملاحظہ فرمائے، اب ایک اور واقعہ بھی چشم عبرت کھول کر دیکھ لیں جس کا تعلق ہندوستان کے مشہور عالم وصوفی اشرف علی تھانوی (متوفی ۱۹۴۳ء) سے ہے۔ مولانا کے ایک مرید نے انہیں ایک مکتوب لکھ کر اپنے ایک خواب کا ذکر ان لفظوں میں کیا:

> ''میں نے رات خواب میں دیکھا کہ ہر چند کلمہ تشہد صحیح ادا کرنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن ہر بار یہ ہوتا ہے کہ ''لا الہ الا اللہ'' کے بعد ''اشرف علی رسول اللہ'' منہ سے نکل جاتا ہے۔ (۱۰)

مولانا اشرف علی تھانوی نے مرید کے اس خط کے جواب میں یہ نہیں لکھا کہ یہ ابلیس کی فتنہ انگیزی تھی، فوراً توبہ واستغفار کرو اور اللہ سے دعا کرو کہ وہ آئندہ شیطان کے اس فتنے سے تمہیں اپنی امان میں رکھے، بلکہ یہ لکھا کہ ''تم کو مجھ سے غایت محبت ہے اور یہ سب کچھ اسی کا نتیجہ اور ثمرہ ہے۔'' (۱۱)

مرید نے جو خواب دیکھا وہ اس کے لیے سخت اضطراب انگیز تھا، چنانچہ اس نے بیدار ہونے کے بعد اس خواب کے اثر کو زائل کرنے کے لیے درود شریف پڑھنا شروع کیا تو اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے ''اللھم صل علی سیدنا ونبینا مولانا اشرف علی'' (۱۲)

اس واقعے سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا کی عقیدت و عظمت اس مرید کے دل میں و دماغ میں ہی نہیں اس کے پورے وجود میں سرایت کر گئی تھی اور اس کی نفسیات کا جزو لاینفک بن چکی تھی، یہ ٹھیک وہی غلوئے محبت ہے جو ماضی میں اہل کتاب اپنے علما اور درویشوں (مشائخ) سے رکھتے تھے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اَنۡدَادًا یُّحِبُّوۡنَہُمۡ کَحُبِّ اللّٰہِ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ وَ لَوۡ یَرَی الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡۤا اِذۡ یَرَوۡنَ الۡعَذَابَ اَنَّ الۡقُوَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیۡعًا وَّ اَنَّ اللّٰہَ شَدِیۡدُ الۡعَذَابِ۔ (سورہ بقرۃ: ۱۶۵)

''بعض ایسے لوگ ہیں جو اللہ کے سوا (دوسروں کو) اس کا شریک (یعنی ہم سر) ٹھہرا تے ہیں، ان سے اس طرح محبت رکھتے ہیں جس طرح اللہ سے محبت رکھنی چاہیے۔ (اس کے برخلاف) جو لوگ (حقیقی معنی میں) ایمان والے ہیں وہ سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔ اور اگر یہ ظلم (یعنی شرک) کرنے والے اس وقت کو دیکھ سکتے جب وہ عذاب کا سامنا کریں گے (تو انہیں معلوم ہو جاتا) کہ ساری قوت کا مالک اللہ ہے۔ (اس کے سوا سب بے اختیار ہیں)۔ اور اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔''

اہل کتاب اپنے علما اور درویشوں سے جنہیں مذکورہ آیت میں ''انداد'' کہا گیا ہے، جو غیر معمولی محبت رکھتے تھے اس کی وجہ ان کا یہ خیال تھا کہ وہ صاحب اختیار ہیں۔ چنانچہ وہ ان کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ کر حاجات و بلایا میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے، حالاں کہ ان کے انبیا نے انہیں یہ تعلیم دی تھی کہ وہ اللہ ہی کو اپنا معتمد اور کارساز سمجھیں۔ (سورہ بنی اسرائیل: ۲) ان کے شرک میں یہ بات بھی داخل تھی کہ انہوں نے اپنے علما اور مشائخ کو رب کا درجہ دے رکھا تھا یعنی ان کے ہر حکم کو بے چون و چرا مان لیتے تھے جیسا کہ درج ذیل آیت میں فرمایا گیا ہے:

اِتَّخَذُوۡۤا اَحۡبَارَہُمۡ وَ رُہۡبَانَہُمۡ اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ وَ الۡمَسِیۡحَ ابۡنَ مَرۡیَمَ وَ مَاۤ اُمِرُوۡۤا اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡۤا اِلٰـہًا وَّاحِدًا لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ سُبۡحٰنَہٗ عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ۔ (سورہ توبہ: ۳۱)

''انہوں (یعنی عیسائیوں) نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علما اور درویشوں (مشائخ) کو رب (یعنی آقا و مالک) بنالیا ہے اور مسیح ابن مریم کو بھی، حالاں کہ ان کو ایک ہی معبود کی عبادت و بندگی کا حکم دیا گیا تھا جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ پاک ہے ان چیزوں

سے جن کو یہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔''

اس آیت کی بہترین تفسیر وہ روایت ہے جس میں حضرت عدی بن حاتم بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! عیسائیوں نے تو اپنے علما اور درویشوں کو نہ رب بنایا اور نہ ان کی عبادت کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دیا تو لوگوں (یعنی عیسائیوں) نے ان کی بات مان لی اور ان کی اتباع کی۔ حضرت عدی نے جواب دیا، ہاں! انہوں نے ایسا کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہی ان کو رب بنانا اور ان کی عبادت کرنا ہے۔ (۱۳)

اس روایت اور قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیات کو پیش نظر رکھیں اور پھر مشائخ اور ان کے مریدوں کے ذہنی اور عملی رویے کو دیکھیں تو دونوں میں بڑی مشابہت نظر آئے گی۔ متعدد واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ جن مریدوں کو شیخ کی طرف سے خرقہ عطا ہوتا تھا وہ یقین کی حد تک سمجھتے تھے کہ اب وہ ہر دنیوی آفت و بلا سے محفوظ ہو گئے ہیں۔ خود شیخ بھی انہیں اس بات کا یقین دلا سکتے تھے۔ حضرت شبلی کے بارے میں روایت ہے کہ ایک بار جب مجلس برخاست ہوئی تو انہوں نے مریدوں سے کہا:

مروا انا معکم حیث کنتم، انتم فی رعایتی و فی کلایتی۔ (۱۴)

''جاؤ (اطمینان خاطر رکھو) تم جہاں کہیں بھی ہو میں تمہارے ساتھ ہوں، تم میری حفاظت اور نگرانی میں ہو۔''

ایک دوسری روایت شیخ ابوالحسن خرقانی کے بارے میں ہے کہ ان کی خدمت میں چند تاجر حاضر ہوئے جو سفر تجارت پر جا رہے تھے اور انہوں نے عرض کیا کہ کوئی ایسی دعا ارشاد فرمائیں جس کی برکت سے دوران سفر ان کی جان و مال محفوظ رہیں۔ شیخ نے فرمایا کہ جب بھی جان و مال کو کوئی خطرہ پیش آئے تو فوراً میرا نام لے لینا۔ اس سفر میں ان کا سامنا رہزنوں کے ایک گروہ سے ہو گیا، جن لوگوں نے اس موقع پر شیخ کا نام لیا وہ تو محفوظ رہے لیکن جن لوگوں نے خدا کا نام لیا اور دفع بلا کے لیے آیتیں اور دعائیں پڑھیں وہ مارے گئے۔ (۱۵)

یہ دنیا میں شیخ کی طرف سے مریدوں کی دست گیری تھی، اب ذرا روز آخرت ان کے اختیار اور مشکل کشائی کا ایک دلچسپ منظر دیکھ لیں:

خواجہ عثمان ہارونی کا ایک مرید تھا۔ جب اس کا انتقال ہوا تو فرشتوں نے اس کو عذاب دینا چاہا لیکن خواجہ اس کی حمایت میں آ گئے، فرشتوں نے انہیں اللہ کے اس فیصلہ سے آگاہ کیا اور بتایا کہ وہ ان کا سچا مرید نہ تھا۔ خواجہ نے فرمایا کہ یہ سب صحیح لیکن تھا تو میرا مرید اور مجھ سے تعلق

رکھنے والا۔ بالآخر فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ خواجہ کے مرید سے کوئی باز پرس نہ کی جائے۔(۱۶)

اوپر تصوف کے حوالے سے بیعت وارادت کے مفہوم و مقصود اور اس کے بعض منفی نتائج کی تفصیل پیش کرنے کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید اور احادیث وآثار کو دیکھا جائے کہ ان میں بیعت کا ذکر کن معنوں میں ہوا ہے اور تصوف کی بیعت اس سے کس حد تک مطابقت رکھتی ہے اور یہ بھی معلوم کیا جائے کہ حلقۂ تصوف میں مشائخ کی کامل اطاعت اور ان کے اختیار و تصرف کا جو خیال پایا جاتا ہے وہ قرآن وسنت کے نصوص سے کہاں تک موافقت رکھتا ہے۔

بیعت اور قرآن مجید

قرآن مجید کی جن سورتوں میں بیعت کا ذکر ہے ان کی متعلقہ آیات پر غور وتدبر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیعت معناً تین طرح کی ہے۔

ایک بیعت وہ ہے جس کا تعلق مسلمانوں کے نظم اجتماعی یعنی اسلامی ریاست کے ارباب حل وعقد سے ہے۔سورہ بقرہ کی آیت ۲۸۵ میں اس کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے: **وقالوا سمعنا واطعنا** ''اور ان کا (یعنی مسلمانوں کا) یہی قول ہے کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔'' متعدد احادیث میں اس سمع وطاعت کی تفصیل موجود ہے۔عبادہ بن صامت فرماتے ہیں کہ:

بایعنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی السمع والطاعۃ فی العسر والیسر والمنشط والمکرہ، وان لا ننازع الامر اھلہ۔الخ (۱۷)

''ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات پر بیعت کی کہ ہم تنگی اور آسانی اور خوشی و ناگواری (دونوں حالتوں میں) حکم سنیں گے اور اطاعت کریں گے اور صاحب امر کے کسی حکم میں نزاع نہ کریں گے۔''

دوسری بیعت وہ ہے جس کا تعلق جہاد فی سبیل اللہ سے ہے۔سورہ فتح میں فرمایا گیا ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَایِعُوۡنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰہَ یَدُ اللّٰہِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡہِمۡ فَمَنۡ نَّکَثَ فَاِنَّمَا یَنۡکُثُ عَلٰی نَفۡسِہٖ وَ مَنۡ اَوۡفٰی بِمَا عٰھَدَ عَلَیۡہُ اللّٰہَ فَسَیُؤۡتِیۡہِ اَجۡرًا عَظِیۡمًا (سورہ فتح:۱۰)

''اے نبی جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ سے بیعت کرتے ہیں، ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔پس (جان لو کہ) جو شخص عہد توڑے گا وہ اس عہد شکنی کا خمیازہ خود بھگتے گا، اور جو اس عہد کو پورا کرے گا، جو اس نے اللہ سے کیا ہے تو عنقریب اللہ اسے اجر عظیم عطا فرمائے گا۔''

اس بیعت کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ذی القعدہ ۶ ھ میں عمرہ کی غرض سے چودہ سو اصحاب کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ ہوئے اور حدیبیہ کے مقام پر جو مکہ سے

۱۳ میل کے فاصلے پر واقع ہے، ٹھہر گئے۔ جوں ہی قریش کو اس آمد کی خبر ہوئی انہوں نے فیصلہ کرلیا کہ وہ مسلمانوں کو مکہ میں داخل نہ ہونے دیں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان کو بطور قاصد مکہ بھیجا تاکہ وہ سرداران قریش سے گفتگو کر کے انہیں اطمینان دلا دیں کہ مسلمان صرف عمرہ کی غرض سے آئے ہیں اور مناسک عمرہ ادا کر کے واپس چلے جائیں گے۔ مگر وہ اپنی ضد پر قائم رہے اور حضرت عثمان کو انہوں نے روک لیا۔ اس دوران یہ خبر اڑ گئی کہ وہ شہید کر دیے گئے ہیں۔ یہ خبر سن کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً تمام صحابہ کو جمع کر کے ان سے اس بات پر بیعت لی کہ وہ بے سروسامانی کے باوجود حضرت عثمان کے خون ناحق کا ان ظالموں سے بدلہ لیں گے اور اللہ کی راہ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کریں گے۔ لیکن جلد ہی معلوم ہو گیا کہ یہ خبر غلط تھی۔

تیسری بیعت کا ذکر سورہ ممتحنہ میں ہے۔ فرمایا گیا:

یاَاَیُّھَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ یُبَایِعْنَکَ عَلٰی اَنْ لَّا یُشْرِکْنَ بِاللّٰہِ شَیْئًا وَ لَا یَسْرِقْنَ وَ لَا یَزْنِیْنَ وَ لَا یَقْتُلْنَ اَوْلَادَھُنَّ وَ لَا یَاْتِیْنَ بِبُھْتَانٍ یَّفْتَرِیْنَهٗ بَیْنَ اَیْدِیْھِنَّ وَ اَرْجُلِھِنَّ وَ لَا یَعْصِیْنَکَ فِیْ مَعْرُوْفٍ فَبَایِعْھُنَّ وَ اسْتَغْفِرْ لَھُنَّ اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (سورہ ممتحنہ: ۱۲)

''اے نبی، جب عورتیں تمہارے پاس بیعت کے لیے آئیں اور ان باتوں پر بیعت کریں کہ وہ کسی چیز کو اللہ کا شریک نہ ٹھہرائیں گی، اور چوری نہ کریں گی، اور زنا نہ کریں گی، اور اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی، اور نہ کوئی بہتان لائیں گی جس کو انہوں نے اپنے ہاتھوں اور پیروں کے درمیان گھڑا ہو، اور معروف میں تمہاری نافرمانی نہ کریں گی، تو ان سے بیعت لے لو اور اللہ سے ان کی مغفرت کے لیے دعا کرو، بے شک اللہ بڑا معاف کرنے والا اور نہایت مہربان ہے۔''

اس بیعت کا تعلق جیسا کہ الفاظ آیت سے بالکل واضح ہے، عورتوں کی تعلیم و تربیت سے ہے۔ اس وقت کے مدنی سماج میں عورتوں کے اندر جو اخلاقی خرابیاں موجود تھیں ان کی اصلاح کے لیے ان سے عہد لیا گیا کہ اب وہ دور جاہلیت کے طور پر منکرات سے حتی الوسع اجتناب کریں گی۔ اس عہد و پیمان میں خاص طور پر عورتوں کو ان برائیوں سے روکا گیا ہے جن کی وہ بالعموم مرتکب ہوتی ہیں۔

مذکورہ بالا بیعت اپنے مفہوم و مدعا کے اعتبار سے خالص دینی بیعت ہے اور اول الذکر دو بیعتوں سے بالکل مختلف ہے جس پر ظاہراً تصوف کی بیعت کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اس پر مزید گفتگو آگے آرہی ہے۔

بیعت اور آثار و احادیث

آثار و احادیث کے ذخیرے میں جس بیعت کا ذکر ہے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ٹھیک وہی ہے جس کی تفصیل قرآن مجید کے حوالے سے اوپر کی جا چکی ہے۔ پہلی بیعت جس کا تذکرہ حدیث و سیرت کی کتابوں میں ملتا ہے وہ بیعت عقبہ اولیٰ اور بیعت عقبہ ثانیہ کے نام سے مشہور ہے۔ بیعت اولی بارہویں سال نبوت میں ہوئی جس میں یثرب (مدینہ) کے بارہ لوگ شریک ہوئے۔ ان لوگوں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جن باتوں پر بیعت لی وہ یہ تھیں:

(۱) ہم خدائے واحد کی عبادت کریں گے اور کسی کو اس کا شریک نہیں بنائیں گے۔

(۲) ہم چوری اور زنا نہیں کریں گے۔

(۳) ہم اپنی اولاد (لڑکیوں) کو قتل نہیں کریں گے۔

(۴) ہم کسی پر جھوٹی تہمت نہیں لگائیں گے۔

(۵) ہم ہر اچھی بات میں نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کریں گے۔

بیعت عقبہ ثانیہ تیرہویں سال نبوت میں ہوئی۔ اس بیعت میں یثرب کے ۷۳ مرد اور دو عورتیں شریک ہوئیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے جن باتوں کا عہد لیا ان میں ایک اہم بات یہ تھی کہ کیا اگر نبی اور ان کے مکی ساتھی ہجرت کر کے مدینہ کو اپنی جائے سکونت بنائیں تو وہ ان کی ہر طرح مدد کریں گے اور اشاعت دین میں تن من دھن سے شریک ہوں گے؟ سب شرکائے بیعت نے اس کا جواب اثبات میں دیا، البتہ یہ کہا کہ ہماری تسلی کر دی جائے کہ حضور ہم کو کبھی نہ چھوڑیں گے۔ آپ نے اس کے جواب میں فرمایا، ہر گز نہیں، میرا جینا اور مرنا تمہارے ساتھ ہوگا۔ (۱۸)

دوسری بیعت وہ ہے جس کا تعلق عورتوں سے ہے (۱۹) اور اس کا ذکر ہم اس سے پہلے کر چکے ہیں۔ احادیث میں منجملہ ان باتوں کے جن کا ذکر سورۂ ممتحنہ میں ہے، بعض اور باتوں کا بھی تذکرہ ہے، مثلاً مرنے والوں پر نوحہ نہ کرنا (بخاری و مسلم، نسائی)، غیر محرم مردوں سے تخلیہ میں بات نہ کرنا (ابن جریر، ابی حاتم)، جاہلیت کا سا بناؤ سنگھار نہ کرنا (مسند احمد)، اپنے شوہروں سے دغابازی نہ کرنا (مسند احمد) وغیرہ۔

تیسری بیعت کا تعلق اسلامی ریاست کے ارباب حل و عقد سے ہے۔ اس سلسلے میں متعدد روایات کتب حدیث میں موجود ہیں جن میں عبادہ بن صامت سے مروی روایت کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے۔ یہاں حضرت عبداللہ بن عمر جیسے جلیل القدر صحابی کی اس بیعت کا ذکر کروں گا جو انہوں نے اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان (متوفی ۷۰۵ء) سے ان الفاظ میں کی تھی:

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔لعبداللہ عبد الملک امیر المومنین،سلام علیک، فانی احمد الیک اللہ الذی لاا لٰہ الا ھو،واقر لک بالسمع والطاعۃعلی سنۃاللہ وسنۃرسولہ فیما استطعت ۔(۲۰)

''بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔اللہ کے بندہ عبدالملک امیرالمومنین کے نام ۔السلام علیکم، میں آپ کے سامنے اس اللہ کی حمد کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں،اورآپ سے حتی الوسع اطاعت کا اقرار کرتا ہوں، جب تک آپ اللہ اوراس کے رسول کی سنت پر چلیں گے۔''

بیعت اورخلافت راشدہ

عہد خلفا میں ہم کودینی نوعیت کی کسی بیعت کا ثبوت نہیں ملا۔یعنی کسی بھی خلیفہ کے ہاتھ پر تعلیم وتربیت کے مقصد سے نہ توکسی مومنہ عورت نے بیعت کی اورنہ ہی کسی مومن مرد نے۔شاہ ولی اللہ دہلوی نے اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

وکانت بیعۃ الاسلام متروکۃ فی زمن الخفاء۔اما فی زمن الراشدین منھم فلأن دخول الناس فی الاسلام فی ایامھم کان غالبا بالقھر والسیف، لا بالتالیف واظھار البرھان ولا طوعا ورغبۃ۔(۲۱)

''خلفا کے زمانے میں بیعت اسلام متروک ہوگئی تھی، جہاں تک خلفاے راشدین کا معاملہ ہے توان کے زمانے میں لوگ جبروقہراورتلوار(کے خوف)سے اسلام میں داخل ہوئے تھے نہ کہ قلوب کی تالیف اورعقلی دلائل(برہان)سے،اورنہ ہی اپنی خوشی اوررغبت سے(لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا)۔''

شاہ صاحب کا یہ بیان تاریخی اعتبار سے غلط اورمذہبی لحاظ سے افسوس ناک ہے،لیکن اس مقام پراس کی تفصیل ممکن نہیں ہے۔بہرحال اتنی بات مسلم ہے کہ خلافت راشدہ میں دینی بیعت متروک ہوگئی تھی خواہ اس کے اسباب کچھ بھی رہے ہوں۔اوراس بنا پر بہت سے اہل علم کا خیال ہے کہ دینی بیعت کا تعلق صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے تھا،اس کے بعد کسی دینی پیشوا کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی مسلمان سے اس قسم کی بیعت لے۔البتہ کل کی طرح آج بھی اسلامی ریاست کے ارباب حل وعقد کی بیعت میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔اوراس بات میں بھی کوئی حرج نہیں کہ ماضی میں سیاسی نوعیت کی بیعت کا جوطریقہ تھا،اس سے مختلف کوئی طریقہ اختیار کیا جائے کہ مقصودعہد اطاعت ہے نہ کہ کوئی مخصوص طریقہ۔

دینی بیعت کے سلسلے میں راقم الحروف کا خیال ہے کہ وہ متروک نہیں ہے۔اگر بیعت

سادگی سے معروف کی قید کے ساتھ اس طرز پر ہو جس کا ذکر سورہ ممتحنہ اور احادیث میں ہے اور اس سے مقصود محض تزکیہ باطن ہو تو اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں بلکہ مفید ہے۔ لیکن تسلیم کرنا ہوگا کہ تصوف میں جس بیعت کا رواج ہے اس میں نہ عہد نبوی کی سی سادگی ہے اور نہ ہی وہ غیر مشروط ہے، اس میں تحکم کا عنصر غالب ہے۔ اس کی تھوڑی سی تفصیل کی ضرورت ہے۔

شیخ کی غیر مشروط اطاعت

ہم شروع میں بتا چکے ہیں کہ تصوف میں بیعت کا اصطلاحی مفہوم شیخ کی کامل یعنی غیر مشروط اطاعت ہے۔ قرآن مجید سے اس نوع کی اطاعت کی تردید ہوتی ہے۔ سورۂ نسا میں فرمایا گیا:

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا (سورہ نساء:۹)

''اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی بھی جو تم میں سے اولوالامر (یعنی صاحب امر) ہوں۔ پھر اگر اولوالامر سے کسی معاملے میں اختلاف ونزاع ہو جائے تو اسے (فیصلے کے لیے) اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹاؤ (اور وہاں سے جو فیصلہ ہو جائے اس کو بے چون و چرا تسلیم کرلو)، اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی طریقہ بہتر اور باعتبار انجام اچھا ہے۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اسلام میں دو طرح کی اطاعت مشروع ہے، ایک اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت جو غیر مشروط ہے، اور دوسرے ان لوگوں کی اطاعت جو مسلمانوں کے نظم اجتماعی کے ذمہ دار ہوں۔ انہی کو مذکورہ آیت میں ''اولی الامر'' کہا گیا ہے۔ ان کی اطاعت مشروط ہے یعنی یہ اسی قت تک جائز ہے جب تک وہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پر قائم ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ اور اس کے رسول کے سوا کسی اور کی غیر مشروط اطاعت جائز نہیں۔ حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

السمع و الطاعة على المرء المسلم فيما احب و كره مالم يؤمر بمعصية، فاذا امر بمعصية فلا سمع و لا طاعة (بخارى، كتاب الاحكام، مسلم، كتاب الامارة) ''مسلمان پر اپنے امیر (اولوالامر) کی بات سننا اور اور ماننا لازمی ہے، خواہ وہ اسے پسند ہو یا ناپسند، جب تک کہ گناہ کا حکم نہ دیا جائے، اور جب اسے گناہ (یعنی اللہ کی نافرمانی) کا حکم دیا جائے تو پھر نہ سننا ہے اور نہ ماننا ہے۔''

عصر حاضر کے بہت سے علما اور مفسرین نے ''اولوالامر'' میں ان تمام لوگوں کو شامل کیا ہے جو

مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کی انجام دہی میں شریک ہوں اور اس بنا پر انہوں نے ارباب اقتدار کے علاوہ علما وفقہا اور قوم کے دوسرے ذمہ داروں کو بھی اس زمرے میں داخل کیا ہے۔

مولانا مودودی لکھتے ہیں:

''مذکورہ بالا دونوں اطاعتوں کے بعد اور ان کے ماتحت تیسری اطاعت جو اسلامی نظام میں مسلمانوں پر واجب ہے وہ ان ''اولی الامر'' کی اطاعت ہے جو خود مسلمانوں سے ہوں۔ ''اولی الامر'' کے مفہوم میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کے ذمہ دار ہوں، خواہ وہ ذہنی وفکری رہنمائی کرنے والے علما ہوں، یا سیاسی رہ نمائی کرنے والے لیڈر، یا ملکی انتظام کرنے والے حکام، یا عدالتی فیصلے کرنے والے جج، یا تمدنی ومعاشرتی امور میں قبیلوں اور بستیوں اور محلوں کی سربراہی کرنے والے شیوخ اور سردار۔ غرض جو جس حیثیت سے بھی مسلمانوں کا صاحب امر ہے وہ اطاعت کا مستحق ہے اور اس سے نزاع کر کے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں خلل ڈالنا درست نہیں ہے۔ بشرطیکہ وہ خود مسلمانوں کے گروہ میں سے ہو، اور خدا اور رسول کا مطیع ہو۔'' (۲۲)

مولانا مودودی نے ''اولوالامر'' کے مفہوم کو جو معنوی وسعت دی ہے وہ راقم الحروف کے خیال میں درست نہیں ہے۔ قرآن مجید میں اس لفظ کے محل استعمال سے اس وسیع مفہوم کی تائید نہیں ہوتی۔ خود اسی سورہ کی آیت ۸۳ میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے جس سے اس کا مفہوم متعین ہو جاتا ہے، یعنی وہ صاحب فہم وبصیرت لوگ جو اسلامی ریاست کی طرف سے مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کے نگراں مقرر ہوں۔

مولانا امین احسن اصلاحی نے جو تشریح کی ہے اس میں اعتدال ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اولوالامر سے مراد اسلامی معاشرے کے ارباب حل وعقد، ذمہ دار اور سربراہ کار ہیں۔ معاشرے کے حالات کے لحاظ سے اس کے مصداق ارباب علم وبصیرت بھی ہو سکتے ہیں اور ارباب اقتدار وسیاست بھی۔ جو لوگ بھی اس پوزیشن میں ہوں کہ عوام کی سربراہی کر سکیں وہ اس لفظ کے مصداق ہیں۔ اگر امام وخلیفہ موجود ہو تو وہ اس کے حکام اولوالامر ہیں اور اگر یہ موجود نہ ہوں تو جماعت کے اندر جو معاملہ فہم اور صاحب بصیرت ہوں وہ اس سے مراد ہوں گے۔'' (۲۳)

اس سلسلے میں جب ہم روایات کی طرف رجوع کرتے ہیں تو معاملہ اس سے کچھ مختلف نظر آتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف یہ قول منسوب ہے کہ اولوالامر سے مراد اہل

فقہ و دین ہیں۔ مجاہد اور عطا کے نزدیک اس سے علما مراد ہیں۔ بہر حال خواہ اولوالامر سے مراد خلیفہ اور اس کے عمال ہوں اور خواہ اس دائرہ اطاعت میں علمائے دین کو بھی شامل کر لیا جائے۔ ایک بات متفق علیہ ہے کہ حکام کی طرح علما و مشائخ کی اطاعت بھی اللہ اور اس کے رسول کی اتباع پر موقوف ہے۔ دوسرے لفظوں میں صرف معروف میں ان کی اطاعت جائز ہے، منکر میں نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لا طاعۃ فی معصیۃ، انما الطاعۃ فی المعروف۔ (بخاری)

''اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی میں کوئی اطاعت نہیں ہے، اطاعت صرف معروف میں ہے۔''

شیخ کا اختیار و تصرف

تصوف میں بیعت کا عمل اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ بیعت کرنے والوں کے دلوں میں یہ یقین جاگزیں نہ ہو جائے کہ شیخ مرشد کو علم غیب حاصل ہوتا ہے اور وہ صاحب تصرف ہوتے ہیں اور اپنے مریدین کی حاجت روائی اور مشکل کشائی کرتے ہیں۔ قرآن مجید اور حدیث دونوں سے اس خیال کی واضح لفظوں میں تردید ہوتی ہے۔ دین اسلام کا تعارف قرآن مجید میں اس طرح کرایا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

قُلْ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا وَ لَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَ لَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَ لَا يَضُرُّكَ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ. وَ اِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗ اِلَّا هُوَ وَ اِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ. يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ. (سورہ یونس: ۱۰۴-۱۰۷)

''(اے نبی!) کہہ دو، اے لوگو! اگر تم میرے دین کے بارے میں (ابھی تک) متردد ہو تو (جان لو کہ) تم اللہ کے سوا جن کی عبادت کرتے ہو میں ان کی عبادت نہیں کرتا بلکہ اس اللہ کی عبادت کرتا ہوں جو تم کو وفات دیتا ہے۔ اور مجھے حکم ہوا ہے کہ یک سو ہو کر (اللہ کی) اطاعت پر اپنے آپ کو قائم رکھو اور مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ (یعنی غیر اللہ کی اطاعت کرنے لگو)۔ اور اللہ کو چھوڑ کر ان کو نہ پکارو جو نہ تم کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان۔ اگر تم نے ایسا کیا (یعنی غیر خدا کو پکارا) تو مشرکوں میں شامل ہو جاؤ گے۔ اور اگر اللہ تمہیں کسی تکلیف میں ڈال دے تو اس

کے سوا کوئی اس کو دور کرنے والا نہیں، اور اگر تم کو کوئی بھلائی پہنچانا چاہے تو کوئی اس کے فضل کو روکنے والا بھی نہیں، اور وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اپنے فضل سے نوازتا ہے، اور وہ بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے۔''

سورۂ اعراف میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اعتراف عجز ان لفظوں میں بیان ہوا ہے:

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ وَ لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَ مَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۔ (آیت: ۱۸۸) ''کہہ دو کہ (قیامت کا علم تو بڑی بات ہے) میں تو اپنے نفع ونقصان کا بھی اختیار نہیں رکھتا، مگر جو اللہ چاہے (یعنی میرا نفع ونقصان اسی کے ہاتھ میں ہے)، اور اگر میں غیب کا علم رکھتا تو بہت سی بھلائیاں جمع کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی، میں تو (حق کا انکار کرنے والوں کو عذاب آخرت سے) ڈرانے والا اور ایمان لانے والوں کو (جنت کی) خوش خبری دینے والا ہوں۔''

اس آیت کے مطابق ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کو جنہیں اصحاب تصوف ''مرشد اعظم'' کہتے ہیں، نفع ونقصان کا اختیار اور تصرف ذاتی حاصل نہ تھا اور نہ ہی آپ عالم الغیب تھے، تو کسی اور کو خواہ وہ کتنا ہی بڑا متقی اور ولی کیوں نہ ہو، کیوں کہ صاحب تصرف اور عالم الغیب مانا جاسکتا ہے۔

متعدد احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو تعلیم دی ہے کہ وہ اپنی ہر حاجت اور مصیبت میں اللہ ہی کی طرف رجوع ہوں کہ وہ اکیلا اپنے بندوں کا حاجت روا اور مشکل کشا ہے۔ روایت ہے کہ ایک شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ جو اللہ چاہے اور آپ چاہیں (ماشاءاللہُ و شئتَ) آپ نے فرمایا، تو نے مجھے اللہ کا شریک (ند) بنالیا، مشیت صرف اللہ کی ہے۔ (۲۴)

اس سلسلے میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے ہر شخص کو اپنی حاجت اللہ سے ہی مانگنا چاہیے، یہاں تک کہ جوتی کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو اللہ ہی سے مانگے۔ (ترمذی)۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں: ''ایک دفعہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سواری پر بیٹھا ہوا تھا تو آپ نے فرمایا: اے لڑکے! میں تجھے چند باتوں کی تعلیم دیتا ہوں: اللہ تعالیٰ کا خیال رکھو وہ تمہارا خیال رکھے گا، جب مانگو تو اللہ سے مانگو اور جب مدد کے طالب ہو تو اللہ سے ہی مدد مانگو۔ جان لو کہ اگر سارے لوگ مل کر تمہیں کوئی نفع پہنچانا چاہیں تو تجھے نفع نہیں پہنچا سکتے سوائے اس کے جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے، اور اگر سارے لوگ مل کر تمہیں کوئی نقصان پہنچانا چاہیں تو تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتے بجز اس کے جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے، قلم اٹھا لیے گئے ہیں اور کاغذ کی سیاہی خشک ہو چکی ہے۔'' (ترمذی)

حیرت ہے کہ قرآن مجید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس واضح تعلیم کے باوجود مشائخ کے بارے میں کیوں کہ یہ خیال کر لیا گیا کہ وہ عالم الغیب اور صاحب تصرف تھے اور مافوق الطبیعی طور پر اپنے متوسلین اور مریدوں کی حاجت روائی کرتے اور مصائب میں ان کی دست گیری کرتے تھے اور بعد وفات بھی وہ یہ کام کر رہے ہیں۔ اس طرح کی خلاف توحید باتوں سے ہر مسلمان کو اجتناب کرنا چاہیے۔ قرآن مجید میں صاف لفظوں میں کہا گیا ہے کہ شرک کرنے والوں پر اللہ نے جنت حرام کر دی ہے۔ (سورہ مائدہ: ۷۲)

ہم نے گزشتہ صفحات میں ''بیعت وارادت'' کے مختلف پہلوؤں کا قرآن مجید اور اثار و احادیث کی روشنی میں جو تفصیلی جائزہ لیا ہے اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

(۱) شیخ مرشد کی غیر مشروط اطاعت کا تصور نصوص قرآن وسنت کے خلاف ہے۔ قرآن و سنت کے مطابق صرف اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ہی غیر مشروط ہے، اس کے علاوہ کسی اور کی اطاعت خواہ وہ اسلامی ریاست کے ارباب حل وعقد ہوں اور یا خواہ علما وفقہا اور مشائخ ہوں، غیر مشروط نہیں۔ مزید برآں اطاعت صرف معروف میں ہے، منکر میں کسی شخص کی اطاعت جائز نہیں۔

(۲) کسی زندہ یا وفات یافتہ عالم دین اور شیخ مرشد کے بارے میں یہ گمان رکھنا کہ وہ مافوق الطبیعی طور پر نفع اور نقصان پہنچانے کا اختیار رکھتے ہیں اور علم غیب سے بہرہ ور ہیں، قرآن کے واضح نصوص کی تردید کے مترادف ہے۔ اس معاملے میں ہر طرح کی فاسد تاویل سے پرہیز اولیٰ ہے۔

(۳) علما اور مشائخ سے اس نوع کی عقیدت و محبت رکھنا کہ وہ اللہ کی محبت سے بڑھ جائے اور صحیح اور غلط کی تمیز اٹھ جائے درحقیقت ان کو ''ارباب من دون اللہ'' قرار دینا ہے۔ یہ اہل کتاب کا شیوہ ہے اور اس سے اجتناب لازمی ہے۔

(۴) دینی بیعت صرف عام لوگوں کے لیے جائز ہے اور اس کی غرض شریعت کا علم حاصل کرنا اور پھر معروف کی پیروی کرنا اور منکر سے دور رہنا ہو۔ اس وقت تصوف میں بیعتِ ارادت کے لیے جو آداب وقواعد مقرر ہیں ان کا بڑا حصہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سادہ طریقہ بیعت کے برعکس ہے۔ ہر کام کی طرح بیعت میں بھی اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع واجب ہے۔

(۵) حقیقی معنی میں عالم دین کے لیے بیعت غیر ضروری ہے، علما کو چاہیے کہ وہ براہ راست قرآن وسنت کی طرف رجوع ہوں اور ان سے اخذ واستفادہ کریں۔ اس استفادہ کے لیے اخلاص نیت کے ساتھ قرآن مجید کی آیات میں غور وتدبر ضروری ہے۔ (سورہ ص: ۲۹) تفہیم قرآن میں اختلاف کی ایک بڑی وجہ انہی دو چیزوں کا فقدان ہے یعنی اخلاص نیت اور تدبر سے بے التفاتی۔ عدم تدبر کا مطلب سہل انگاری ہے اور یہ چیز فہم قرآن میں ایک بڑا مانع ہے۔

(۶) بیعت کو بیعت تبرک اور بیعت ارادت میں تقسیم کرنا غیر ضروری ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں عام وخاص کی تفریق نہیں تھی۔ البتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم طالبین بیعت کی ایمانی و اخلاقی حالت اور ان کی فطری استعداد کے مطابق انہیں امر و نہی کی تلقین فرماتے تھے۔

(۷) مریدین کی تعلیم و تربیت میں ہر طرح کے تشدد سے پرہیز لازمی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الدین یسر، ولن یشاد الدین الا غلبہ فسددوا وقاربوا وابشروا۔

''دین آسان ہے، جو کوئی دین میں مقابلہ کرے گا (یعنی سختی اختیار کرے گا) تو وہ اس پر غالب آجائے گا۔ پس راہ راست پر قائم رہو، میانہ روی اختیار کرو اور خوش خبری دو۔''

(۸) تصوف میں تزکیۂ باطن کو جو اہمیت حاصل ہے وہ اس کی ایک بڑی خوبی ہے۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ باطن کی طہارت کے بغیر کردار سازی ممکن نہیں ہے۔ لیکن مریدوں کی کردار سازی میں فاعلانہ اخلاق اور منفعلانہ اخلاق میں تفریق صحیح نہیں ہے۔ دونوں طرح کے اخلاق واعمال سے ایک مومن کی زندگی کو، تا بہ مقدور مزین ہونا چاہیے۔

(۹) فکر وعمل میں اعتدال اسلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ قرآن مجید میں مسلمانوں کو ''امت وسط'' کہا گیا ہے۔ (بقرہ: ۱۴۳) یعنی ایک ایسا گروہ جو اپنے قول وفعل دونوں میں افراط وتفریط سے دامن بچا کر اعتدال وتوسط کی راہ میں گامزن ہو۔

لیکن افسوس کے ساتھ کہتا ہوں کہ تصوف کے فکر وعمل دونوں میں بے اعتدالی پائی جاتی ہے یعنی غلو۔ اس بے اعتدالی سے نہ تو اس کا تصور زہد وعبادت محفوظ ہے اور نہ ہی تصور فقر واخلاق، حتی کہ توحید کے باب میں بھی افراط موجود ہے یعنی تصور شیخ وولایت اور یہی غلو بیعت ارادت کے آداب ورسوم میں دخیل ہے۔ اگر اس غلو کی اصلاح کر دی جائے تو پھر تصوف تزکیۂ باطن میں ایک مفید ذریعہ ثابت ہوگا۔

ماخذ وحواشی

(۱) فتاویٰ رضویہ، ج ۲۱، ص ۶۲-۴۶۱، بحوالہ مضمون: بیعت وخلافت: امام احمد رضا قادری کی نظر میں، مضمون نگار: مجیب الرحمٰن علیمی، مجلہ ''الاحسان'' الہ آباد، شمارہ ۵، فروری ۲۰۱۴ء، ص: ۱۰۴

(۲) عوارف المعارف، شیخ شہاب الدین سہروردی، طبع مصر ۱۲۹۲ھ، حصہ اول، ص ۵۳، مزید دیکھیں ''الرسالۃ القشیریۃ''

(۳) فتاویٰ رضویہ، ج ۲۱، ص ۵۰۹، بحوالہ مضمون مذکورہ بالا، ص ۱۱۷

(۴) الرسالۃ القشیریۃ، امام ابو القاسم قشیری، طبع مصر، ۱۳۰۴ھ، ص ۱۹۷

(۵) سیر الاولیاء، میر خورد دہلوی، سید محمد بن مبارک علوی، طبع دہلی ۱۳۰۲ھ، ص ۳۴۰

(۶) فوائد الفواد، امیر حسن سنجری، طبع لکھنؤ (منشی نول کشور پریس) ۱۳۰۲ھ، ص ۴۳۰

(۷)ایضا

(۸)الانسان الکامل،عبدالکریم جیلی،طبع مصر ۱۳۱۶ھ،حصہ دوم،ص ۴۶

(۹)ایضا

(۱۰)رسالہ برہان (دہلی)،فروری ۱۹۵۲ء،ص ۷

(۱۱)ایضا

(۱۲)دیکھیں رسالہ امداد،تھانہ بھون،شوال ۱۳۳۵ھ،ص ۳۴

(۱۳)دیکھیں ترمذی،احمد،ابن جریر

(۱۴)شطحات الصوفیہ،عبدالرحمٰن بدوی،طبع بیروت ۱۹۷۶ء،حصہ اول،ص ۴۱

(۱۵)سیر الاولیاء،ص ۳۳۸

(۱۶)ایضاً،ص ۴۵

(۱۷)صحیح البخاری، کتاب الفتن ، باب: قول النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الخ

(۱۸) رحمۃ للعٰلمین ، قاضی محمد سلیمان منصور پوری، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، سوئیوالان، دہلی، بار اول اگست ۱۹۸۰ء، ص ۷۷-۸۰۔ حدیثوں میں بھی اس بیعت کا ذکر ہے، دیکھیں صحیح مسلم، ابوداؤد وغیرہ

(۱۹)احادیث میں ہے کہ متعدد صحابہ نے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس نوع کی بیعت کی تھی، مثلا بخاری میں جریر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ: بایعت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم علیٰ اقامۃ الصلاۃ وایتاء الزکوٰۃ والنصح لکل مسلم۔ میں نے نماز کی اقامت، زکوٰۃ کی ادائیگی اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیعت کی۔

(۲۰)دیکھیں مؤطا، امام مالک، احکام الخلافۃ

(۲۱)القول الجمیل، شاہ ولی اللہ دہلوی، مطبع محمد یمین، ۱۲۶۰ھ، ص ۸

(۲۲)تفہیم القرآن، مولانا مودودی، مکتبہ اسلامی دہلی، ۱۹۵۸ء، ۱/ ۳۶۴، حاشیہ نمبر ۸۹

(۲۳) تدبّر قرآن، امین احسن اصلاحی، تاج کمپنی، ترکمان گیٹ دہلی، ۱۹۸۹ء، ۲/ ۳۲۳

(۲۴) امام بیہقی کی ''کتاب الاسماء والصفات'' میں ''ند'' کی جگہ ''عدل'' کا لفظ ہے: اجعلتنی للہ عدلا بل شاء اللہ وحدہٗ (ص ۱۱۰) ''کیا تو نے مجھے اللہ کا برابر (یعنی ہم سر) بنالیا ہے بلکہ (یہ کہو کہ) ایک اللہ جو چاہے''۔ مزید دیکھیں: تفسیر ابن کثیر، ج ۱، ص ۵۷

(۲۵) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب: الدین یسر

OOO

ذیشان احمد مصباحی

بیعت وارادت سے متعلق چند شبہات اور ان کا ازالہ

مقدمات خمسہ

اصل موضوع پر گفتگو سے قبل چند مقدمات ملاحظہ فرمائیں:

مقدمہ(۱): سوال اچھی چیز ہے

سوال زندگی کی علامت اور جہالت کا علاج ہے۔ ہر سوال اعتراض نہیں ہوتا اور اگر اعتراض ہو پھر بھی مثبت ردعمل سے اس کے ذریعے انکشافات کے نئے دروا کیے جا سکتے ہیں۔ سوال کو روکنا علم کو روکنا ہے اور تحقیق کے نئے جہان سے خود کو محروم رکھنا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ کسی بھی نظام فکر و عمل پر سوالیہ نشان قائم کرنا اس کی نفی کرنے سے عبارت نہیں ہے اور نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ سوال کرنے کے بعد اس کی نفی ہو گئی۔ ہاں! بعض دفعہ ایسا بھی ہو سکتا کہ مسئول عنہ شک کے دائرے میں ہو، یا سائل خود ہی اندھیرے میں ہو یا دوسرے لوگ اندھیرے میں ہوں اور سوال کی برکت سے اس اندھیرے کے ازالے کی راہ نکل جائے۔ بہر کیف! کسی بھی نظام فکر و عمل پر سوال قائم کرنا ایک مثبت اور زندہ ذہنیت کی علامت ہے اور ردعمل میں اس سے زیادہ مثبت اور زندہ ذہنیت کا طالب ہے۔ اور اس عمومی کلیے سے تصوف، صوفیہ یا محبین صوفیہ بھی مستثنیٰ نہیں ہیں۔

مقدمہ(۲): تصوف کی اپنی اصطلاحات ہیں

علم کی مختلف شاخیں اور علما کے مختلف طبقات ہیں۔ علمائے اسلام کے بھی مختلف اقسام ہیں؛ مثلاً مفسرین، محدثین، فقہا، متکلمین اور صوفیہ۔ اگر چہ یہ سب اسلام کے ہی عالم ہیں، لیکن ان سب کے خاص موضوعات جداگانہ ہیں۔ کوئی قرآنی تفسیر سے بحث کرتا ہے، کوئی احادیث رسول کی جمع و تدوین اور جرح و تنقید سے سروکار رکھتا ہے، کوئی عقائد سے بحث کرتا ہے تو کوئی مسائل اور اخلاقیات سے گفتگو کرتا ہے۔

یہ بات بھی واضح رہے کہ کسی بھی علم وفن کو سمجھنے کے لیے لغت سہارا تو بن سکتا ہے، رہ نما نہیں بن سکتا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ہرفن کے ماہرین کی بعض اپنی اصطلاحات ہوتی ہیں۔وہ بعض لفظوں کو اپنے طور پر برتتے ہیں۔ان الفاظ کے معانی اس فن کے ماہرین کی اصطلاحات کی رو سے ہی سمجھے جاسکتے ہیں۔نہ لغت سے ان کی مکمل تفہیم ہوسکتی ہے اور نہ ہی ایک فن کی اصطلاحات دوسرے فن کی اصطلاحات کی صحیح تفہیم وتشریح کرسکتی ہیں۔یہ ایک عمومی اور تسلیم شدہ حقیقت ہے، جس کے ذیل میں علمائے اسلام بھی آتے ہیں۔

علمائے اسلام میں بھی مختلف طبقات کی مختلف اصطلاحات اور لفظیات ہیں۔یہی وجہ ہے کہ محدثین کی باتیں سمجھنے کے لیے ان کی اصطلاحات کو سمجھنا ضروری ہے،فقہا کی باتوں کا اس وقت ادراک ہوسکتا ہے جب ان کی لفظیات کا صحیح ادراک ہو۔یہی حال متکلمین،مفسرین اور صوفیہ کا بھی ہے۔

مذکورہ بالا حقیقت کے اعتراف اور تسلیم کے بعد یہ ایک عام المیہ ہے کہ عام طور پر علمی اختلافات کے دوران مذکورہ بالا حقیقت کے تقاضوں کو صحیح طور پر نہیں برتا جاتا۔لوگ مخاطب کے عرف، اصطلاح اور لفظیات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اور اپنے فہم کو اس کے لفظوں سے نچوڑنا شروع کر دیتے ہیں۔میرا احساس ہے کہ اس ظلم کا سب سے زیادہ شکار صوفیہ اور ان کا فن تصوف ہوتا رہا ہے۔ناقدین تصوف بالعموم صوفیہ کے بحر معانی سے اعراض کرتے ہوئے ان کے لفظوں سے کھیلتے نظر آتے ہیں۔اس کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔یہ شعوری شرارت بھی ہوسکتی ہے۔مناظرے کی فنی مہارت بھی ہوسکتی ہے۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ بعض ذہنوں میں اب بھی تصوف اپنی فنیت کو نہیں منوا سکا ہے اور ایک وجہ بعض ذہنوں میں یہ پیشگی قطعیت بھی ہے کہ صوفیہ، اسلام سے بھٹکے ہوئے ہیں۔اس کے علاوہ اور بھی وجوہات ہوسکتی ہیں،مثلاً مباحثہ ومناظرہ سے صوفیہ کا عمومی اعراض، کتب تصوف میں فنیت کی عدم تکمیل، شطحات صوفیہ،فرقہ پرستی اور تکفیر بازی، گمراہ صوفیہ کی نکتہ آفرینیاں، مادیت کا فروغ اور روحانیت سے گریز کا رجحان، اعتزالی فکرو نظر کا فروغ، ظاہر پرستی اور عدم تفکر وتدبر وغیرہ۔

مقدمہ (۳): علم تصوف تنقید سے ماورا نہیں!

ہم تصوف کو علوم اسلامیہ میں سے ایک مستقل علم سمجھتے ہیں، جس کا موضوع تزکیۂ نفس اور تربیت اخلاق ہے۔اس لیے ہمیں تصوف اسلامی اور تصوف غیر اسلامی کی اصطلاح منظور نہیں ہے، جس طرح حدیث اسلامی اور حدیث غیر اسلامی اور فقہ اسلامی اور فقہ غیر اسلامی کی اصطلاح منظور نہیں۔ہاں! یہ الگ بات ہے کہ جس طرح قرآن، کتاب لاریب اور حرف حرف

ایمان کا حصہ ہے، تصوف کے نام پر موجود لٹریچر لا ریب اور جزو ایمان نہیں ہے۔ اس میں بعض دخیلات وموضوعات اور بعض شطحات وابہامات بھی شامل ہیں۔ اس لیے صوفی لٹریچر پہ نقد ونظر کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ البتہ یہ خصوصیت کچھ تصوف ہی کی نہیں، حدیث وفقہ اور تفسیر وکلام بھی اس ضابطے سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ نہ ان میں سے کوئی فن نقد وجرح سے ماورا ہے اور نہ ان کی کوئی کتاب کلی طور پر ایمان وتسلیم کا درجہ رکھتی ہے۔

المختصر! دیگر علوم اسلامیہ کی طرح علم تصوف میں بھی تحقیق وتنقید کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور اہل علم جانتے ہیں کہ علمی میدانوں میں تحقیق وتنقید کا دروازہ کھولنا علم کو زندگی بخشتا ہے، اس علم کا انکار یا تردید کرنا نہیں ہے۔

مقدمہ (۴): احیائے تصوف ضروری ہے

تصوف اپنی روایت میں بے انتہا زوال آمادہ ہے اور یہ بات بہت ہی زیادہ تکلیف دہ ہے۔ یہ بات میں صرف اس لیے نہیں کہہ رہا کہ میں تصوف کا حامی ہوں، بلکہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ تصوف کا زوال دراصل ہمارے قومی اخلاق وروحانیت کا زوال ہے اور کسی قوم کا اخلاقی و باطنی زوال اس کو صرف اس کے دین سے نہیں کاٹتا، دنیا سے بھی کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ تصوف، طبیب اخلاق وروحانیت ہے اور اس مادیت زدہ دنیا میں بجائے اس کے کہ تصوف کے نام پر بعض مضر یا غیر ضروری رسموں اور روایتوں کو ختم کر کے اس طبیب روحانی سے اپنی شفایابی کی فریاد کی جائے، سرے سے اس فن کو ہی بعض مسلمانوں کی طرف سے رد کر دیا جانا، اخلاق وروحانیت سے ہماری کس بے اعتنائی کو بتاتا ہے، یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔

صوفی ادب اور صوفی روایات میں بعض دخیلات اگر شامل ہیں تو ان کا ازالہ کیا جانا چاہیے اور حقیقت تصوف کو زندہ کرنا چاہیے۔ یہ دانش مندی نہیں ہے کہ سرے سے تصوف یا صوفی روایت کو ہی دین سے نکال باہر کر دیا جائے۔ یہ رویہ دین سے تصوف کو نہیں نکالتا بلکہ دین سے روح دین کو ہی جدا کر دیتا ہے۔ آج کے مادی سماج کو کل سے زیادہ اخلاق وروحانیت کی ضرورت ہے اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ جدید صارفیت نے اخلاقیات اور روحانیت کی رگیں کاٹ دی ہیں۔ ایسے میں مضطرب اور امن کی متلاشی انسانیت کو کل سے کہیں زیادہ آج تصوف اور صوفی نظام کی ضرورت ہے۔ ہاں! اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ معاصر تصوف، صوفیہ اور صوفی مراکز کے اندر اگر بعض مفاسد یا غیر ضروری مراسم داخل ہو گئے ہیں، جن سے روح تصوف کو زک پہنچ رہی ہے، تو ان کا مخلصانہ ازالہ ضروری ہے، یا اگر بعض ضروری اور مفید امور سے متعلق نئے ذہن میں شبہات ہیں تو ان شبہات کا علمی تصفیہ کیا جانا ایک لازمی امر ہے۔

مقدمہ(۵): متکلمین کے اصول تکفیر کی عصری معنویت

امت مسلمہ کی اجتماعیت کے حوالے سے متکلمین کا ایک سبق اس زمانے میں بہت زیادہ دہرانے کا ہے۔ یہ سبق تاویل اور عدم تکفیر کا ہے۔یعنی کسی اہل قبلہ کی تکفیر سے پہلے آخری حد تک تاویل کی راہ تلاش کرنا۔اس کے لیے انہوں نے کہا کہ اگر کسی کے قول یا عمل میں ۹۹ رپہلو کفر کے ہوں اور ایک پہلو ایمان واسلام کا ہو تو اسی ایک پہلو کو ترجیح دی جائے۔اس تعلق سے متکلمین کی یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ انہوں نے عقائد اسلامی کی اصولی اور فروعی میں تقسیم کی اور اصولی عقائد کے انکار کو کفر کہا اور فروعی عقائد کے انکار کو کفر نہیں کہا۔اصولی عقائد کو وہ ضروریات دین بھی کہتے ہیں اور ضروریات دین سے مراد وہ باتیں ہیں جن کو تسلیم کر کے کوئی شخص مسلمان ہوتا ہے، یا وہ باتیں جن کو عوام اور خواص سب جانتے ہیں کہ یہ دین کی بنیادی بات ہے جس کا منکر کافر ہوتا ہے۔ پھر متکلمین نے اصولی عقائد کے انکار پر تکفیر کے لیے بھی یہ شرط لگائی ہے کہ وہ انکار ہر طرح سے صریح اور ثابت ہو اور اس میں کسی طرح کی تاویل کی گنجائش نہ ہو۔قارئین کو یہ بات بظاہر غیر متعلق معلوم ہوگی لیکن اس کو یہاں پیش کرنے کے پیچھے کئی ایک مقاصد ہیں، مثلا:

۱-امت مسلمہ کی اجتماعیت کی فکر ہر کلمہ گو کے لیے ضروری ہے، خواہ وہ محبّ تصوف ہو یا مخالف تصوف۔

۲-اہل قبلہ جن میں صوفیہ اور ارباب تصوف بھی شامل ہیں، کی تمام خوبیوں سے نظر پھیر لینا اور ان کے کسی ایک قول یا عمل کو بنیاد بنا کر ان کی تکفیر میں جلدی کرنا، مناسب نہیں ہے۔حتی الامکان تاویل کی راہ نکالنے کی کوشش کرنی چاہیے اور ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ہماری اصل ذمہ داری لوگوں کو اسلام کے اندر لانا ہے، ان کو باہر کرنا نہیں ہے۔

۳-صوفیہ کی شطحات اور کرامات کو بنیاد بنا کر بعض لوگ بہت جلدی فیصلے کر لیتے ہیں، جب کہ یہ نامناسب ہے۔سب سے پہلے تو ان کی روایت اور استناد پر ہی غور کرنا چاہیے۔پتہ چلا کہ کسی موضوع یا ضعیف روایت کی بنیاد پر آپ نے ایک اچھے خاصے اللہ کے بندۂ خاص کی تکفیر و تضلیل کر ڈالی اور پھر اس زعم میں مبتلا ہیں کہ ہم نے تیر مار لیا۔شطحات اور کرامتوں کی روایتوں کو بھی دیکھنا چاہیے اور ان کے تعلق سے اہل سنت کا جو موقف ہے، اس کو بھی یاد رکھنا چاہیے۔

یہ عمل ہمیں جلد بازی کے بہت سے فیصلوں سے محفوظ رکھے گا۔یہ عجیب بات ہے کہ حدیث رسول اگر دین کی کسی مسلم بنیاد سے ٹکراتی ہوئی محسوس ہو تو اسے روایت یا درایت کو بنیاد بنا کر رد کر دیا جاتا ہے، یا اس کی ممکنہ تاویل کی جاتی ہے، مگر اس طرح کی کوئی بات صوفیہ کی طرف منسوب کسی بھی کتاب میں مل گئی تو پھر روایت و درایت اور تاویل و تحقیق کے سارے اصولوں کو قتل

کرتے ہوئے ،لوگ آمادۂ تکفیر نظر آتے ہیں۔ خیر! شطحات وکرامات کا موضوع، ایک بلکہ دو مستقل موضوعات ہیں، جن پر مستقل لکھنے کی ضرورت ہے۔

شبہات عشر

اب ہم اپنے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں اور بیعت کی صوفیانہ روایت سے متعلق بعض شبہات کا ازالہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بیعت کی صوفیانہ روایت سے متعلق معاصر ذہن کے چند بڑے شبہات حسب ذیل ہیں:

(۱) اسلام میں بیعت کے جو اولین واقعات ملتے ہیں، ان کا تعلق بیعت اطاعت سے ہے، نہ کہ صوفیہ کی مروجہ بیعت توبہ سے۔ اس لیے صوفیہ کی بیعت کی روایت ایک بدعت اور غیر مسنون روایت ہے اور ظاہر ہے کہ کسی نظام بدعت سے تزکیہ وتربیت کی امید فضول محض ہے۔

(۲) بیعت کے چند واقعات عہد رسالت میں ضرور ملتے ہیں، مگر عہد صحابہ اور زمانۂ خلفاے راشدین میں جو بیعتیں ہوئیں وہ صرف بیعت ریاست واطاعت تھیں، بیعت توبہ نہیں تھیں، پھر بعد کے زمانے میں اس بدعت کے لیے کیا جواز ہوسکتا ہے؟

(۳) بیعت رسول ایک سادہ بیعت ہے، جب کہ بیعت تصوف کے تفصیلی اصول وقواعد وضع ہیں۔ گویا بیعت تصوف اپنی شکل وصورت کے اعتبار سے ایک بدعت ہے اور ہر بدعت جہنم کی طرف لے جانے والی ہوتی ہے، نہ کہ جنت کی طرف۔

(۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں ایک ہی بیعت تھی، جو بیعت اطاعت تھی، اس کی تقسیم بیعت ارادت اور بیعت تبرک کی طرف دین میں ایک نئے امر کا اِحداث ہے ، جو حدیث رسول کے مطابق مردود ہے۔

(۵) بیعت میں مرید غیر مشروط طور پر اپنے ارادے کو اپنے مرشد کے حوالے کر دیتا ہے، جب کہ غیر مشروط اطاعت صرف اللہ ورسول کے لیے ہے۔

(۶) بیعت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ پیر جو کہے مرید کو اس کی بجا آوری کرنی ہے۔ گویا وہ اگر شریعت کے خلاف حکم دے، تو بھی مرید کو اُف نہیں کرنا ہے، بلکہ مکمل طور سے سر تسلیم خم کرنا ہے۔ ایسا نظام روحِ دین کے خلاف ہے۔ اگر پیر کو اولوالامر/ امیر مان بھی لیا جائے تو یہ بات طے ہے کہ امیر کی اطاعت صرف معروف میں جائز ہے، منکرات ومحرمات میں امیر کی اطاعت جائز نہیں ہے۔ پھر منکرات میں پیر کی اطاعت کیوں کر درست ہوسکتی ہے۔

(۷) بیعت اگر تربیتِ نفس اور تعلیم اخلاق کے لیے ضروری بھی ہو تو ایسا عوام کے لیے ہونا چاہیے، علما جو براہ راست کتاب وسنت سے استفادہ کرتے ہیں، ان کو کسی پیر یا مرشد کی کیا

حاجت؟ اور انہیں کیا پڑی ہے کہ کتاب وسنت کا علم رکھنے اور حق و باطل کو سمجھنے کے باوجود اپنے ارادے کو دوسرے کے حوالے کردیں؟ کیا ان کی تعلیم وتربیت کے لیے کتاب وسنت اور طریق صالحین کا علم کافی نہیں ہے؟؟

(۸) بعض صوفیہ نے مرشد کے باب میں اتنا غلو کیا کہ اسے مقام رسالت پر بٹھا دیا اور اس طرح کی باتیں کرنے لگے کہ ہم مرشد کی شکل میں رسول کو دیکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ دین میں اس طرح کی غلومندانہ عقیدت کسی بھی مذہبی رہ نما کے حوالے سے جائز نہیں ہوسکتی۔ اس سے فتنوں کے دروازے کھلیں گے اور سماج میں اس کی مثالیں بھی موجود ہیں۔

(۹) نظام بیعت وارادت میں مرشد کو تحلیل وتحریم کا حق دے دیا گیا ہے، جو ایک مشرکانہ روایت کی ابتدا ہے، اسے اسلام یا تربیت وتزکیہ سے بھلا کیا رشتہ ہوسکتا ہے؟

(۱۰) صوفیانہ نظام بیعت میں مرشد کو غیب داں اور متصرف بنا دیا گیا ہے۔ یہ فکر، اسلامی روح کے خلاف اور شرک کا دروازہ کھولنے والی ہے۔

ازالۂ شبہات

شبہہ :(۱): صوفی بیعت سنت یا بدعت؟

وضاحت: اصل سوال کا جواب جاننے سے قبل ایک بات یہ جاننا ضروری ہے کہ حدیث پاک میں یہ بات واضح طور پر بتائی گئی ہے کہ ہر بدعت گمراہی ہے۔ **كُلُّ بِدعَةٍ ضَلالَةٌ**۔(۱)

یہ سبق ہر مسلمان کو ازبر ہے۔ لیکن یہ بات بہت ہی مختلف فیہ اور کثیر الجدال ہے کہ بدعت ہے کیا؟ میرے نزدیک بدعت کی توضیح حدیث سنت سے ہوتی ہے۔ امام مسلم جریر بن عبد اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اسلام میں سنت حسنہ ایجاد کرتا ہے تو اس کو اس کا اجر ملتا ہے اور ان لوگوں کا اجر بھی ان کے اجر سے کچھ کمی کیے بغیر اسے ملتا ہے جو لوگ اس کے بعد اس پر عمل کرتے ہیں اور جو اسلام میں سنت سیئہ ایجاد کرتا ہے، اس کو اس کا گناہ ملتا ہے اور ان کا گناہ بھی اسے ملتا ہے جو لوگ اس کا ارتکاب کرتے ہیں، ان کے گناہ سے بغیر کسی کمی کے۔(۲)

---

(۱) سنن ابن ماجہ، الایمان و فضائل الصحابہ، بَابُ اتِّبَاعِ سُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ

(۲) مَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً، فَلَهُ أَجْرُهَا، وَأَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا بَعْدَهُ، مِنْ غَيْرِ أَنْ يَنْقُصَ مِنْ أُجُورِهِمْ شَيْءٌ، وَمَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً سَيِّئَةً، كَانَ عَلَيْهِ وِزْرُهَا وَوِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ بَعْدِهِ، مِنْ غَيْرِ أَنْ يَنْقُصَ مِنْ أَوْزَارِهِمْ شَيْءٌ (صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، بَابُ الْحَثِّ عَلَى الصَّدَقَةِ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ۔۔۔)

اس حدیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کے اندر ہر نئی ایجاد محدَ ثہ، بدعت اور مذموم نہیں ہے، بلکہ بعض نئی باتیں سنت حسنہ کے ذیل میں آتی ہیں اور بعض سنت سیئہ کے ذیل میں۔ ان میں سنت حسنہ کار ثواب اور محمود ہے جب کہ سنت سیئہ کار عذاب اور مذموم ہے۔ اسی کو محدثہ، بدعت اور ضلالت کہتے ہیں۔

سنت و بدعت کی اس تفہیم سے مقصد یہ ہے کہ اگر بالفرض صوفیانہ بیعت عہد اولین میں رائج نہ رہی ہو، پھر بھی اس کو مذموم اور بدعت کہنے سے قبل یہ غور کرنا پڑے گا کہ وہ سنت حسنہ میں شامل ہے یا سنت سیئہ میں۔ گناہوں سے توبہ کرانا نیکی کا کام ہے یا بدی کا، عوامی اصلاح کی غیر حکومتی جدو جہد کا آغاز کرنا سنت حسنہ ہے یا سنت سیئہ۔ یہ بات بطور تنزل اور بطور فرض تھی، اب صوفی بیعت پر تاریخی اور تحقیقی نظر ڈالیے جس سے اس کی اصالت اور تاریخیت واضح ہو سکے۔

قاضی مدراس قاضی محمد ارتضا علی گوپا موی (۱۲۷۰ھ - ۱۸۵۴ء) انیسویں صدی کے بڑے علما میں آتے ہیں۔ آپ نے بیعت کی حقیقت وروایت سے متعلق ایک مستقل رسالہ بعنوان ''رسالہ طریق بیعت'' لکھا ہے۔ موصوف ابتدائے رسالہ میں لکھتے ہیں:

> ''بیعت کی پانچ قسمیں ہیں: اول بیعت اسلام، دوم بیعت ہجرت، سوم بیعت ثبات بر جہاد، چہارم بیعت خلافت وسلطنت اور پنجم گناہوں سے توبہ، بدعت سے اجتناب، تمسک بالسنۃ اور استقامت کی آرزو والی بیعت۔
>
> بیعت کی ابتدائی تین اقسام، اسلام کے عہد اول میں تھیں۔ چوتھی قسم خلفائے عباسیہ کے زمانے تک رہی اور بیعت کی پانچویں قسم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے لے کر آج تک باقی ہے اور امام ہمام حضرت مہدی موعود علیہ السلام کے نزول تک اس کا تسلسل باقی رہے گا۔ تاہم صوفیہ متقدمین نے بیعت سلطنت سے مشابہت کے وہم سے بچنے کے لیے بیعت توبہ کو چھوڑ دیا تھا اور صرف خرقہ پر اکتفا کرتے تھے۔ لیکن آج جب کہ یہ شائبہ باقی نہ رہا، اس لیے صوفیہ نے بیعت کی سنت کو دوبارہ زندہ کر دیا ہے۔''(۱)

قاضی ارتضا علی گوپا موی کی تشریح وتوضیح کے بعد اب اوراق سیرت سے دو مثالیں لیتے ہیں تا کہ بیعت صوفیہ کی تاریخیت کے ساتھ اس کی مسنونیت بھی اجاگر ہو جائے۔

---

(۱) رسالہ طریق بیعت، از قاضی ارتضا علی خان گوپا موی، عکس مخطوطہ مخزونہ مکتبۃ الاحسان، خانقاہ عالیہ عارفیہ، سید سراواں۔ یہ مختصر رسالہ فارسی زبان میں ہے۔

پہلی مثال: صلح حدیبیہ کے بعد عورتوں کی بیعت کے تعلق سے درج ذیل آیات نازل ہوئیں:

یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ یُبَایِعْنَكَ عَلٰی اَنْ لَّا یُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَیْـًٔا وَّ لَا یَسْرِقْنَ وَ لَا یَزْنِیْنَ وَ لَا یَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَ لَا یَاْتِیْنَ بِبُهْتَانٍ یَّفْتَرِیْنَهٗ بَیْنَ اَیْدِیْهِنَّ وَ اَرْجُلِهِنَّ وَ لَا یَعْصِیْنَكَ فِیْ مَعْرُوْفٍ فَبَایِعْهُنَّ وَ اسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔ (ممتحنہ:۱۲)

اے پیغمبر! اگر مومن عورتیں آپ کے حضور اس بات پر بیعت کے لیے آئیں کہ وہ اللہ کے ساتھ شرک نہیں کریں گی، چوری نہیں کریں گی، بدکاری نہیں کریں گی، اپنے بچوں کو قتل نہیں کریں گی، ایک دوسرے پر بہتان نہیں باندھیں گی اور آپ کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں کریں گی تو انھیں بیعت کر لیجیے اور ان کے لیے دعاے مغفرت کیجیے، بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

یہ آیت کریمہ ان مسلم عورتوں کی بیعت کے حوالے سے ہے جو صلح حدیبیہ کے بعد دیار کفار سے نکل کر دیار اسلام میں آرہی تھیں۔ یا دیار اسلام میں موجود تھیں مگر پھر بھی تجدید اسلام وایمان چاہتی تھیں۔ اس کی بعض تفصیلات کا ذکر کتب احادیث میں بھی موجود ہے۔ مثلاً امام بخاری نے حضرت عروہ کے حوالے سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ جو مسلم عورتیں ہجرت کر کے آتیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان سے ان امور کا استفسار فرماتے جن کا ذکر سورہ ممتحنہ کی مذکورہ بالا آیت میں ہے۔ جو عورتیں ان باتوں کا اقرار کر لیتیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان سے فرماتے کہ میں نے تمھاری بیعت لے لی۔ آپ صرف یہ الفاظ بولتے، عورتوں سے بیعت کے وقت کبھی کسی کا ہاتھ مس نہ فرماتے۔(۱)

اسی طرح امام نسائی نے امیمہ بنت رقیقہ سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ میں انصار کی چند عورتوں کے ساتھ بیعت کے لیے بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئی اور ہم نے عرض کی: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہم آپ سے اس بات پر بیعت کریں گی کہ ہم شرک نہیں کریں گی، چوری نہیں

---

(۱) أن عائشة رضي الله عنها، زوج النبي صلى الله عليه وسلم أخبرته: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يمتحن من هاجر إليه من المؤمنات بهذه الآية بقول الله: {يا أيها النبي إذا جاءك المؤمنات يبايعنك} [الممتحنة: 12] إلى قوله {غفور رحيم}، قال عروة: قالت عائشة: فمن أقر بهذا الشرط من المؤمنات، قال لها رسول الله صلى الله عليه وسلم: قد بايعتك، كلاما، ولا والله ما مست يده يد امرأة قط في المبايعة، ما يبايعهن إلا بقوله: قد بايعتك على ذلك۔ (بخاری، كتاب تفسير القرآن، باب اذا جاءكم المؤمنات مهاجرات (ممتحنه: ۱۰)

کریں گی، بدکاری نہیں کریں گی، ایک دوسرے پر بہتان تراشی نہیں کریں گی اور آپ کی حکم عدولی نہیں کریں گی۔ پیغمبر رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، جی! اس میں امکان و استطاعت کی شرط لگا لو، جہاں تک تم سے ممکن ہو اسی حد تک تم پر اطاعت فرض ہے۔ اس پر ہم عورتوں نے عرض کی: اللہ و رسول ہم پر سب سے زیادہ مہربان ہیں۔ حضور ہم اسی پر بیعت کریں گی۔(۱)

اس بیعت کی درج ذیل دفعات تھیں:

(۱) شرک نہ کرنے کا عہد

(۲) چوری نہ کرنے کا عہد

(۳) بدکاری نہ کرنے کا عہد

(۴) قتلِ اولاد نہ کرنے کا عہد

(۵) کسی پر تہمت و بہتان نہ لگانے کا عہد

(۶) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکم عدولی نہ کرنے کا عہد

ظاہر یہی ہے کہ یہ بیعت، بیعت اسلام نہیں ہے، کیوں کہ آیت میں اس بات کی صراحت ہے کہ اگر مومن عورتیں بیعت کے لیے آئیں، مذکورہ واقعات سے بھی اسی بات کی صراحت ہوتی ہے۔ البتہ اس کے باوجود اس میں شرک نہ کرنے کی ایک دفعہ موجود ہے، اس لیے اس بیعت کو تجدید اسلام کی بیعت ضرور کہا جا سکتا ہے۔

یہ بیعت، بیعت ہجرت بھی نہیں ہے، کیوں کہ ان عورتوں سے اسلام کے لیے ہجرت کرنے کا عہد و پیمان نہیں لیا گیا ہے۔ بلکہ یہ تو ان عورتوں کی بیعت کا ذکر ہے جو دیار کفر سے دیار اسلام کی طرف ہجرت کر چکی ہیں، اب ان کے لیے مزید ہجرت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یہ ثبات بر جہاد والی بیعت بھی نہیں ہے؛ کیوں کہ نہ امور جہاد عورتوں سے متعلق ہے اور نہ ہی اس بیعت کی دفعات میں جہاد کا ذکر ہے۔

یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ یہ بیعت، خلافت و سلطنت والی بیعت بھی نہیں ہے۔ یہ بات سیاق و سباق سے بالکل واضح ہے۔

---

(۱) أُمَيْمَةَ بِنْتِ رُقَيْقَةَ أَنَّهَا قَالَتْ: أَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي نِسْوَةٍ مِنَ الْأَنْصَارِ نُبَايِعُهُ، فَقُلْنَا: يَا رَسُولَ اللهِ، نُبَايِعُكَ عَلَى أَنْ لَا نُشْرِكَ بِاللهِ شَيْئًا، وَلَا نَسْرِقَ، وَلَا نَزْنِيَ، وَلَا نَأْتِيَ بِبُهْتَانٍ نَفْتَرِيهِ بَيْنَ أَيْدِينَا وَأَرْجُلِنَا، وَلَا نَعْصِيَكَ فِي مَعْرُوفٍ، قَالَ: فِيمَا اسْتَطَعْتُنَّ، وَأَطَقْتُنَّ. قَالَتْ: قُلْنَا اللهُ وَرَسُولُهُ أَرْحَمُ بِنَا، هَلُمَّ نُبَايِعْكَ يَا رَسُولَ اللهِ (نسائی، سنن صغریٰ، کتاب البیعة، بیعة النساء)

اب بیعت کی صرف ایک ہی قسم باقی رہ جاتی ہے، وہ بیعت توبہ اور بیعت تقویٰ ہے۔ گناہوں سے توبہ، بدعات سے اجتناب، اتباع سنت اور استقامت علی الشریعہ والی بیعت۔ یہی بیعت صوفیہ کے حلقوں میں مروّج ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ مذکورہ بیعت میں تجدید اسلام بھی شامل ہے اور صوفیہ بھی اپنی بیعت میں تجدید اسلام کراتے ہیں۔ گناہوں سے توبہ کے ساتھ کفر وشرک سے بیزاری کا پیمان بھی لیتے ہیں۔ پتہ چلا کہ صوفیہ کی بیعت براہ راست سنت سے ثابت ہے اور وہ بھی ایسی سنت جس کا حوالہ قرآن پاک میں موجود ہے۔

دوسری مثال: یہاں کسی پریشان آتما کو یہ خیال پریشان کر سکتا ہے کہ یہ بیعت تو عورتوں کے لیے تھی، مرد کیوں بیعت توبہ وتقویٰ کریں؟ ایسے مہاپُرشوں کی تفہیم کے بجائے بیعت توبہ وتقویٰ کی دوسری روایت دیکھتے ہیں جو براہ راست مردوں سے متعلق ہے اور اس کی دفعات بالکل وہی ہیں جو عورتوں کی مذکورہ بیعت کی دفعات ہیں۔ عقبۂ اولیٰ کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منیٰ کے قریب مدینہ کے ۱۲؍افراد کو بیعت کیا۔ ان میں ۹؍قبیلۂ خزرج کے مرد تھے اور تین قبیلۂ اوس کے۔(۱)

حضرت عبادہ بن صامت کہتے ہیں کہ میں بھی عقبۂ اولیٰ کے اصحاب بیعت میں شامل تھا۔ ہم کل بارہ مرد تھے۔ ہم لوگوں نے اس رات وہی بیعت کی جو بیعت عورتوں کی ہے۔ اور یہ واقعہ، فرضیت جہاد سے پہلے کا ہے۔ ہم نے رسول کریم ﷺ سے اس بات پر بیعت کی تھی کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے، چوری نہیں کریں گے، بدکاری نہیں کریں گے، اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گے، ایک دوسرے پر بہتان نہیں باندھیں گے اور رسول اللہ ﷺ کی حکم عدولی نہیں کریں گی۔(۲)

کوئی مہاپُرش یہاں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ بیعت مردوں والی ضرور ہے، البتہ یہ بیعت، اسلام کی بیعت ہے، بیعت توبہ وتقویٰ نہیں ہے۔ ایسے بزرگوں کی خدمت میں ہماری چند معروضات ہیں:

---

(۱) اِمتاع الاسماع: ابوالعباس احمد بن علی حسینی مقریزی (۸۵۴ھ) ۱/ ۵۱، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۹۹ء

(۲) **كنت فيمن حضر العقبة الأولى وكنا أثني عشر رجلا فبايعنا رسول الله صلى الله عليه وسلم على بيعة النساء وذلك قبل أن يفترض الحرب على أن لا نشرك بالله شيئا ولا نسرق ولا نزني ولا نقتل أولادنا ولا نأتي ببهتان نفتريه بين أيدينا وأرجلنا ولا نعصيه في معروف۔** (مسند احمد، باقی مسند الانصار، حدیث عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ)

● پہلی عرض تو یہ ہے کہ بیعت توبہ وتقویٰ کی سب سے اعلیٰ قسم بیعت اسلام ہے، کیوں کہ شرک وکفر سب سے بڑے گناہ ہیں، ان سے رجوع اور ان سے بچنا سب سے بڑی توبہ اور سب سے بڑا تقویٰ ہے۔

● ایسے بزرگوں سے ہماری دوسری گزارش یہ ہے کہ مذکورہ بالا بیعت میں صرف کفر وشرک کا ذکر ہوتا تو اسے خالص بیعت اسلام کہنے کا اصرار تھوڑی دیر کے لیے قابل سماعت ہوسکتا تھا، لیکن اس میں کفروشرک کے علاوہ دیگر معاصی سے توبہ کا بھی ذکر ہے، اس لیے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بیعت، بیعت اسلام کے ساتھ بیعت توبہ وتقویٰ بھی ہے۔

● ان حضرات کی خدمت میں ہماری تیسری عرض یہ ہے کہ کتب حدیث میں بیعت اسلام کی جتنی روایتیں ہیں، ان میں اغلب بیعت توبہ اور بیعت تجدید اسلام کے حوالے سے ہیں، نہ کہ بیعت اسلام کے حوالے سے۔ کیوں کہ عام طور پر لوگ شہادتین کے اقرار سے اسلام قبول کرتے، اس کے بعد اس پر استقامت، کفروفسق والی گذشتہ زندگی پر ندامت اور مکمل اطاعت کی توثیق کے لیے رسم بیعت ادا کرتے ہیں۔ ایسے میں عقبۂ اولیٰ والی بیعت کو بیعت اسلام کے بجاے، بیعت توبہ واستقامت اور بیعت وفا کہنا زیادہ مناسب ہے۔ اور یہی صوفیہ کی بیعت اور ان کا مقصود ہے۔

● جن حضرات کی بارگاہ عالی میں ہماری تیسری گذارش ناقابل التفات ہے، ان سے ہماری اگلی گذارش یہ ہے کہ عقبۂ اولیٰ کے موقع پر جن بارہ نفوس قدسیہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دست حق پرست پر بیعت کی، ان میں قبیلہ خزرج کے اسعد بن زرارہ، رافع بن مالک بن عجلان اور قطبہ بن عامر بھی تھے اور یہ حضرات اسی مقام پر ایک سال پہلے ہی دست رسالت پر اسلام قبول کر چکے تھے۔ اس لیے علی الاقل ان کے حق میں یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ بیعت عقبۂ اولیٰ، بیعت اسلام نہیں، صوفیہ والی بیعت توبہ وتجدید اسلام تھی۔ اس بات کی توثیق کے لیے عام کتب سیرت کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔

اس کے ساتھ یہ بات اپنی جگہ واضح ہے کہ مذکورہ بیعت، بیعت ہجرت، بیعت جہاد یا بیعت خلافت وسلطنت نہیں تھی۔

● سنت و بدعت کے حوالے سے ایک بات تو وہ ہے، جو چند صفحات قبل مذکور ہوئی۔ موجودہ تناظر میں ایک بات اور بہت اہم ہے۔ عصر حاضر میں بدعتیوں کی ایک ایسی جماعت بھی ہے، جو کسی بھی امر کی مسنونیت کے لیے من کل الوجوہ، لفظ ومعنیٰ، شکل وصورت، انداز وطریق کی تمام جزئیات کے ساتھ اس کی صحیح سند سے منقولیت کو شرط بتاتے ہیں۔ ایسے جمودیے دین کی توسیع اور تفہیم کے لیے کتنی مشکلات پیدا کر رہے ہیں، اس سے قطع نظر، ان کی بات مانیے تو آج کی تعلیم و

تربیت، سیاست وثقافت اور تجارت ومعیشت ہی نہیں، عبادت وریاضت اور حج وزیارت بھی من کل الوجوہ منقول نہ ہونے کی بنیاد پر بدعات کے خانے میں شامل ہیں۔ایسے میں آج فقہاے اسلام کے اس سبق کا اعادہ واجب ہوگیا ہے کہ دین کے بعض احکام تعبدی ہیں، جن میں قیاس کا کوئی دخل نہیں ہوتا، ان کی مسنونیت کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ باتیں اپنی تفصیلات کے ساتھ منقول و مسنون ہوں۔مثلاً طریق نماز اور تعداد طواف۔

اسی طرح دین کے بعض احکام غیر تعبدی ہیں، ان میں عقل کو بھی دخل ہے، ان کی مسنونیت کے لیے ان کا من کل الوجوہ منقول ومسنون ہونا ضروری نہیں، اگر ان کی اصل منقول و مسنون ہو تو وہ امر مسنون ٹھہرے گا، اگر چہ اس کی بعض موجودہ تفصیلات منقول ومسنون نہ ہوں۔ مثلاً جہاز میں نماز اور آرام دہ گاڑیوں میں بیٹھ کر ضعیفوں کا طواف۔ تعلیم اور توبہ کو بھی اسی خانے میں رکھیے۔ نبی کریم ﷺ نے تعلیم دی ہے اور تعلیم کی بے شمار ترغیب وتاکید فرمائی ہے۔اب ایسے میں تعلیم ایک مسنون عمل ہے، اگر چہ اس کی بعض موجودہ شکلیں عہد رسالت میں موجود نہ ہوں، بشرطے کہ اس کی موجودہ تفصیلات میں کسی امر محظور وممنوع کا ارتکاب نہ ہو۔اسی طرح توبہ ایک عبادت ہے۔ یہ مسنون عمل ہے۔لیکن یہ کوئی تعبدی امر نہیں کہ سرکار علیہ السلام نے جس طرح توبہ کرائی، جس وقت توبہ کرائی، جن الفاظ کے ساتھ توبہ کرائی ان سب کا اتباع واجب ہو۔ایک مسلمان جس طرح بھی توبہ کرے، جس وقت اور جس انداز والفاظ سے توبہ کرے، یہ توبہ ہی ہوگی اور اسے اصل کے اعتبار سے مسنون ہی کہا جائے گا۔

اس اصولی گفتگو کی روشنی میں صوفیہ کی بیعت توبہ وتقویٰ کی مسنونیت بھی اجاگر ہوجاتی ہے۔لیکن اس کے باوجود لفظ پرستوں کی تسکین خاطر کے لیے مزید دو روایات دیکھیے جن سے مردوں کے حق میں بیعت تقویٰ کی مسنونیت مزید واضح ہوتی ہے۔

الف: حضرت جریر فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ سے پابندی نماز، ادائیگی زکات اور مسلمانوں کی خیر خواہی کی بیعت کی۔(۱)

ب: صحابی رسول حضرت عوف بن مالک بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ بارگاہ رسالت پناہ میں حاضر تھے۔یکایک آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا تم اللہ کے رسول سے بیعت نہیں کروگے؟ اللہ کے رسول ﷺ نے یہ بات تین بار دہرائی۔ہم لوگوں نے فوراً اپنا ہاتھ بڑھایا اور بیعت کرلی۔اس کے بعد ہم لوگوں نے دریافت کیا: حضور! ہم نے بیعت تو کرلی ،لیکن یہ کس بات

---

(۱) نسائی، السنن الکبریٰ، کتاب البیعۃ، باب: اَلْبَیْعَۃُ عَلَی إِقَامِ الصَّلَاۃِ وَإِیتَاءِ الزَّکَاۃِ

پر تھی؟ مرشد اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس بات پر کہ تم اللہ کی عبادت کروگے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراؤ گے۔ پانچوں اوقات نماز کی پابندی کروگے۔ پھر آہستہ سے فرمایا: اور یہ کہ کسی کے سامنے اپنا ہاتھ نہیں پھیلاؤ گے۔(۱)

یہاں ایک بات اور قابل غور ہے۔ وہ یہ کہ کتب حدیث وسیرت، بیعت اطاعت کے حوالے سے بھری پڑی ہیں۔ بعض اہل علم کا خیال ہے کہ اطاعت امیر کی ہوتی ہے اور امیر/ اولوالامر صرف سیاسی رہ نما ہیں۔ یہ حضرات دین کی بیعت اطاعت کو سیاست دانوں کی اطاعت کے ساتھ مقید مانتے ہیں۔ ایک دوسرا طبقہ بھی ہے جو امیر سے مراد صرف علما اور فقہا کو لیتا ہے۔ یہ حضرات بھی خاموشی کے ساتھ صوفیہ کی بیعت توبہ، جس میں اطاعت کا عنصر نمایاں ہوتا ہے، اسے بیعت اطاعت کے خانے سے خارج کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ ایسے تمام حضرات کی خدمت میں مولانا مودودی کا وہ اقتباس نذر ہے جسے انھوں نے اولوالامر کی تفسیر کے سیاق میں رقم کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''مذکورہ بالا دونوں اطاعتوں کے بعد اور ان کے ماتحت تیسری اطاعت جو اسلامی نظام میں مسلمانوں پر واجب ہے وہ ان ''اولی الامر'' کی اطاعت ہے جو خود مسلمانوں سے ہوں۔ ''اولی الامر'' کے مفہوم میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کے ذمہ دار ہوں، خواہ وہ ذہنی وفکری رہنمائی کرنے والے علما ہوں، یا سیاسی رہ نمائی کرنے والے لیڈر، یا ملکی انتظام کرنے والے حکام، یا عدالتی فیصلے کرنے والے جج، یا تمدنی ومعاشرتی امور میں قبیلوں اور بستیوں اور محلوں کی سربراہی کرنے والے شیوخ اور سردار۔ غرض جو جس حیثیت سے بھی مسلمانوں کا صاحب امر ہے وہ اطاعت کا مستحق ہے اور اس سے نزاع کر کے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں خلل ڈالنا درست نہیں ہے۔ بشرطیکہ وہ خود مسلمانوں کے گروہ میں سے ہو، اور خدا اور رسول کا مطیع ہو۔''(۲)

---

(۱)عَنْ أَبِي مُسْلِمٍ الْخَوْلَانِيِّ، قَالَ: حَدَّثَنِي الْحَبِيبُ الْأَمِينُ عَوْفُ بْنُ مَالِكٍ الْأَشْجَعِيُّ، قَالَ: كُنَّا عِنْدَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: أَلَا تُبَايِعُونَ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ فَرَدَّدَهَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ فَقَدَّمْنَا أَيْدِيَنَا فَبَايَعْنَا فَقُلْنَا: يَا رَسُولَ اللهِ، قَدْ بَايَعْنَاكَ فَعَلَامَ؟ قَالَ: عَلَى أَنْ تَعْبُدُوا اللهَ لَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا، وَالصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ وَأَسَرَّ كَلِمَةً خَفِيَّةً لَا تَسْأَلُوا النَّاسَ شَيْئًا۔(نسائی، السنن الکبریٰ، کتاب البیعۃ، باب: الْبَيْعَةُ عَلَى تَرْكِ مَسْأَلَةِ النَّاسِ)

(۲)تفہیم القرآن، زیر تفسیر سورہ نساء، آیت:۵۹

واضح رہے کہ خلافت راشدہ کے بعد مسلم سیاست میں دنیاداری کے جو عناصر بڑھتے چلے گئے، اس کو دیکھتے ہوئے صوفیہ نے اپنے آپ کو سیاست سے الگ کرلیا۔ انھوں نے اپنی غیر حکومتی اطاعت دین کا جو نظام تربیت قائم کیا اس میں سیاست کے علاوہ دین واخلاق کے جملہ عناصر شامل تھے۔ اس طرح بیعت صوفیہ کے اندر اطاعت امیر کا جو پہلو ہے، اس کی مسنونیت ومشروعیت بھی ثابت ہوجاتی ہے، جس کی تائید مولانا مودودی کی مذکورہ بالا عبارت سے بھی من جملہ ہوتی ہے۔

شبہہ: (۲) عہد خلفائے راشدین میں بیعت توبہ کی روایت نہیں ملتی۔

وضاحت: بعض حضرات کو یہ شبہہ بھی پریشان کرتا ہے کہ بیعت توبہ کی روایت عہد رسالت میں تو ملتی ہے، خلفاے راشدین کے عہد میں میں اس کی روایت نہیں ملتی۔ ایسے حضرات کے نزدیک شاید اتباع رسول سے کہیں زیادہ اتباع خلفائے راشدین اہمیت کا حامل ہے۔ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی جائز اور مستحب عمل کا مروی ومنقول ہونا بھی اس عمل مستحب کی مسنونیت یا جواز کو ثابت نہیں کرتا، جب تک اس عمل مستحب پر خلفائے راشدین بھی کاربند نہ ہوں۔

یہاں سب سے پہلے اس بات کو نوٹ کرنے کی ضرورت ہے کہ اصول شریعت اور مزاج دین کے مطابق کسی بہتر عمل کی بجا آوری کے لیے اس کا مسنون ہونا ضروری نہیں ہے، چہ جائے کہ اس کی مسنونیت کے بعد خلفائے راشدین کے عمل سے دلیل طلب کی جائے۔ اس قسم کے شبہات دراصل اہل تصوف سے غلو مندانہ عداوت کا اظہار یہ ہیں جن کے لیے کوئی منطقی جواز نہیں ہے۔ یہ کیسی بے بصیرتی اور محرومی ہے کہ کہا جائے کہ فلاں عمل اگر چہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، لیکن چوں کہ خلفائے راشدین سے ثابت نہیں، اس لیے وہ بدعت ہے اور اس پر عمل کرنا دین میں ایک نیا دروازہ کھولنا ہے۔

رہی یہ بات کہ بیعت توبہ کی روایت خلفائے راشدین اور اس کے متصل بعد کے عہد میں کیوں نہیں رہی؟ تو اس کے جواب میں سر دلبراں کے مصنف سید محمد ذوقی رقم طراز ہیں:

> ’’خلفائے راشدین کے زمانہ میں بیعت اسلام متروک ہوگئی تھی کیوں کہ ان ایام میں لاکھوں کی تعداد میں لوگ اسلام میں داخل ہونے لگے تھے اور اس کا امتیاز اٹھ گیا تھا کہ خالصۃً للہ کون اسلام قبول کر رہا ہے اور بوجہ شوکت وغلبۂ اسلام کون اس میں مصلحتاً داخل ہو رہا ہے۔ خلفائے بنی امیہ اور بنی عباس کے زمانے میں اس بیعت نے رواج اس لیے نہ پکڑا کہ حکمران عموماً فاسق اور ظالم ہونے لگے تھے اور وہ قیام سنن کی جانب سے لاپرواہ تھے۔ اسی طرح بیعت تقویٰ بھی خلفائے راشدین کے زمانہ میں متروک تھی بوجہ اس کے کہ وہ دور نورانی تھا اور بسبب قرب زمانۂ رسالت

مآب لوگ بکثرت اخذ انوار اور فیضان باطن سے مالا مال تھے۔علاوہ ازیں خلفائے راشدین کو وقت کا بیشتر حصہ امور سیاسی اور تنظیم و تدبیر سلطنت اور تدوین امور شرعی پر صرف کرنا ضروری ہو گیا تھا، اسلامی فتوحات کی وسعت نے خلافت کی ذمہ داریوں کو ایک بار عظیم بنا دیا تھا اور جدید معاملات لازمی طور پر ان کی توجہات کو اپنی جانب کھینچتے تھے۔

اس نورانی اور متبرک زمانہ کے ختم ہونے کے چند روز بعد تک بھی یہ بیعت اپنی اصل شکل میں جاری نہ ہو سکی، کیوں کہ اس کا خوف تھا کہ فتنہ و فساد اس سے نہ بھڑک اٹھے۔ اور ایسا نہ ہو کہ اس بیعت پر بیعت خلافت کے ساتھ مخلوط ہونے کا گمان کیا جائے اور اس غلط گمانی کی بنا پر لوگوں کو ناحق ایذاء پہنچائی جائے۔ چنانچہ اس زمانے میں صوفیہ نے خرقہ دینے کو قائم مقام بیعت قرار دیا تھا، لیکن جب ایک مدت بعد ملوک اور سلاطین سے رسم بیعت معدوم ہوگئی اور وہ تمام اندیشے جاتے رہے تو حضرات صوفیہ نے اس مردہ سنت کو زندہ کیا اور بیعت تقویٰ کو جاری کر دیا۔"(۱)

رسالہ قشیریہ کے ابتدائی صفحات میں امام ابو القاسم قشیری نے لکھا ہے کہ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے بعد (دوسری صدی ہجری میں ہی) جب بدعتوں اور گمراہیوں کا فروغ ہونے لگا تو اہل سنت کے زاہدین نے خود کو تصوف سے جوڑ لیا۔ اس سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ پہلی صدی تک فسق و فجور اور بدعت و ضلالت کا بازار عام گرم نہیں ہوا تھا، لوگ بالعموم تقویٰ سے آراستہ تھے، اسی طرف اوپر سید ذوقی شاہ نے بھی اشارہ کیا ہے۔ امام ابو القاسم قشیری اور سید ذوقی شاہ کی تحریروں سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ صوفیہ نے دوسری صدی ہجری میں زہد و تقویٰ کی اپنی تحریک شروع کر دی تھی اور ایسے ماحول میں جب کہ مسلمانوں پر دنیا اور دنیا پر مسلمان ٹوٹ پڑے تھے، صوفیہ نے توبہ و انابت کی تلقین شروع کر دی۔ لیکن چوں کہ یہ عہد اموی اور عباسی خلفا کے ظلم و جبر کا عہد تھا، ایسے عہد میں بیعت تقویٰ کا آغاز کرنا ظالم حکمرانوں کے ذہن میں بغاوت کا وہم پیدا کر سکتا تھا، ویسے بھی صوفیہ کی مرجعیت فاسق سلاطین کو ہمیشہ کھٹکتی رہی ہے، اس لیے اس عہد میں صوفیہ نے خرقے کی روایت شروع کی جو ان کے نزدیک بیعت کے مترادف سمجھی جاتی تھی، چنانچہ شیخ شہاب الدین سہروردی عوارف المعارف میں لکھتے ہیں:

"خرقہ پوشی یا خرقہ، شیخ اور مرید کے مابین ایک رشتۂ ارتباط ہے اور مرید کی جانب

---

(۱) سر دلبراں، ص: ۹۵، ۹۶، محفل ذوقیہ، کراچی، ۱۴۰۰ھ

سے شیخ کی خدمت میں ایک ذریعۂ تحکیم ہے (یعنی مرید شیخ کو حاکم تسلیم کر لیتا ہے۔) جب مصالح دنیوی کے لیے یہ تحکیم (حاکم بنانا) شریعت میں جائز ہے اور پسندیدہ امر ہے تو پھر منکر خرقہ (خرقہ پوشی) اس کا کس طرح انکار کرتا ہے، جو ایک ایسے طالب صادق کو شیخ پہناتا ہے جو اس کے پاس حسن عقیدت کے ساتھ آیا ہے اور مذہبی امور میں اس کو اپنا رہبر بناتا ہے۔ تاکہ شیخ اس کو راہ ہدایت پر لگائے اور اس کو آفات نفس کی بصیرت عطا کرے، اعمال کے فساد سے وقوف بخشے اور بتائے کہ نفس دشمن کن کن راستوں سے راہ پالیتا ہے۔''(۱)

شبہہ: (۳) بیعت رسول سادہ ہے، جب کہ بیعت صوفیہ کے تفصیلی اصول وضوابط ہیں۔

وضاحت: یہ وہ مغالطۂ عامۃ الورود ہے جو علوم اسلامیہ کے منکرین کو عام طور پر لاحق ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً:

● کوئی کہتا ہے کہ علم تصوف ایک بدعت ہے، اس کی تفصیلات وتشریحات بہ تمام وکمال فقہا کی کتابوں میں نہیں ملتیں، جب کہ فقہا ہی اسلامی قوانین ودساتیر کے ماہرین ہیں۔

● کوئی کہتا ہے کہ فقہا نے جو اصول وضع کیے ہیں اور جس طرح سے اجتہاد واستنباط کا ایک جہان آباد کر رکھا ہے، زمانۂ نبوت اور عصر صحابہ وتابعین میں اس کا نام ونشان تک نہیں ملتا۔ کتب حدیث جو دین کی بنیادیں ہیں، وہ مکمل طور سے فقہ واجتہاد کی ان تفصیلات سے خالی ہیں۔

● کوئی کہتا ہے کہ علم حدیث کے نام پر پورا ذخیرہ ایک طلسماتی دنیا ہے۔ اس میں ضعف ووضع کا ایسا صحرا ہے جس سے نکلنا آسان نہیں ہے۔ اس کے اصول وضوابط نہ صرف بدعت ہیں، بلکہ محدثین کے فیصلے متعارض ہیں، جس کی وجہ سے یہ امت قرآن سے دور ہو گئی ہے۔

● اور کوئی کہتا ہے کہ تفسیر کے نام پر کتابوں کا جو ایک انبار لگا ہوا ہے، وہ سرتا سر یا تو اسرائیلیات کا اسلامائزیشن ہے یا فلسفیوں اور فقیہوں کی خیالات آرائیوں اور نکتہ آفرینیوں کا مجموعہ ہے۔

مذکورہ بالا مغالطۂ عامۃ الورود جو تمام علوم اسلامیہ کی جڑ کاٹ دیتا ہے، اس کا ازالہ مقاصد شریعت کے عقلی اور مستحکم اصولوں کے تحت کیا جا سکتا ہے۔ وہ یوں کہ کون سے اصول اور تفصیلات عہد رسالت میں موجود تھے اور کون سے نہیں تھے، یہ سوال زیادہ اہم نہیں ہے۔ زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ ان اصولوں سے خدا کی شریعت انفس وآفاق میں پھیلی، دین کا ان سے فائدہ ہوا یا نقصان

---

(۱) عوارف المعارف، ص:۲۳۶، مترجم شمس بریلوی، فرید بک ڈپو، دہلی، ۲۰۰۱ء

ہوا، وہ اصول قرآن اور احادیث متواترہ کی خلاف ورزی پر مبنی ہیں یا ان اصولوں سے کتاب وسنت کی تائید وتقویت اور اشاعت میں مدد ملتی ہے؟ اگر اس طرح غور کیا جائے تو پھر **کل بدعةٍ ضلالة** کی ظاہر پرستی کے بجائے اس کی معنویت تک رسائی ہوگی اور حدیثِ سنت کی روشنی میں علم ومعرفت کا وہ راز کھل جائے گا جس کو بعض حضرات اپنی کم فہمی کے سبب محض طلسمِ خیال تصور کرتے ہیں۔

اس اصولی گفتگو کے بعد اب اصل سوال کی طرف آتے ہیں۔ رسم بیعت کے بعد جو تصوف کا پورا نظام فکر وعمل ہے، وہ پورا کا پورا کتاب وسنت سے مزین ومبرہن ہے۔ حضرت جنید بغدادی نے **طریقنا مشید بالکتاب و السنة** کہہ کر تصوف کی بنیادوں کو کتاب وسنت کی زمین میں مستحکم کر دیا ہے۔ وہی بات تصوف کے نظام اخلاق وتربیت کا حصہ ہے جس کی منظوری اور تائید کتاب وسنت سے ہوتی ہے۔ جو بات کتاب وسنت کے آئینے میں مردود ہے، نظام تصوف میں اس کا داخلہ پیشگی طور پر ممنوع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر بعض مستصوفین تصوف کے لبادے میں دین وشریعت کا مذاق اڑاتے نظر آئے تو سب سے پہلے خود صوفیہ نے ہی ان کا رد کیا اور ان کی جہالت کو تصوف کی شناخت دینے سے انکار کر دیا۔

البتہ یہاں ایک بات قابل ذکر رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ اجتہادات وفروعات میں جس طرح کسی فقیہ سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور یہ اختلاف کتاب وسنت سے اختلاف نہیں ہے۔ اس اصول کی روشنی میں ممکن ہے کہ کسی صوفی کا اجتہاد وعمل ہمارے اجتہاد وعمل کے خلاف نظر آئے۔ یہاں پر اس بات کو گرہ میں باندھ لینا چاہیے کہ جس طرح کسی پیش رو فقیہ یا صوفی کا فہم واجتہاد یا الہام وکشف کتاب وسنت کا درجہ نہیں رکھتا، جس سے اختلاف کو کتاب وسنت سے اختلاف کہا جائے، اسی طرح ہمارا فہم واجتہاد بھی کتاب وسنت کا درجہ نہیں رکھتا کہ اس کے مخالف کسی پیش رو یا معاصر فقیہ یا صوفی کو ہم براہ راست کتاب وسنت کا مخالف کہہ دیں۔

تعبیر نص اور فہم نص کو نص کا درجہ دینا معاصر مذہبی دنیا کی ایک عام وبا ہے، جس سے دینی فکر میں تشدد وتطرف بڑھتا جا رہا ہے۔ اپنی رائے سے مختلف فقہا اور صوفیہ کی رائے کو کتاب وسنت کا مخالف کہنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ یہ تماشہ ہے کہ آج ہمارے یہاں ہر شخص دوسرے کی رائے کو اپنی نقد کی کسوٹی پر چڑھانا اپنا حق بلکہ فرض سمجھتا ہے اور اس کے ساتھ وہ یہ غلط فہمی پال لیتا ہے کہ اس کی رائے اب نقد وجرح سے ماورا ہے۔ اس کی اپنی فکر واجتہاد امکان خطا سے پاک ہے۔ اس نے جو کچھ سمجھا ہے وہ فہم نص نہیں عین نص ہے۔ یہ فکر خاموش نبوت کا ادعا ہے، جس سے ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

شبہہ: (۴) **عہد رسالت میں ایک ہی بیعت تھی، بیعت اطاعت، ایسے میں بیعت ارادت اور بیعت تبرک کی طرف اس کی تقسیم کے کیا معنی ہیں؟**

وضاحت: اس قسم کی باتیں فقہ وتدبر سے دور انتہائی سادگی پر مبنی ہوتی ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک ہی نماز تھی، نماز بندگی، اس کو فرض، واجب، سنت، مستحب، نفل اور مکروہ میں تقسیم کرنا احداث فی الدین ہے۔

بیعت صوفیہ کی حقیقت معصیت سے توبہ اور شریعت پر استقامت کا عہد ہے اور یہ عین سنت ہے، جس کے حوالے ماسبق میں گزر چکے ہیں۔ سب سے پہلے اس بات کو سمجھنا چاہیے۔ اس کے بعد صوفیہ کے یہاں اس کی دو قسمیں اس طور پر ہیں کہ جس طرح دن میں پچاس مختلف الفاظوں سے پچاس بار توبہ کرنا، جائز ہے اور مسنونیت توبہ کی اصل کو دیکھتے ہوئے ایک سنت عمل ہے، اسی طرح مختلف صالحین کے سامنے تجدید توبہ اور تجدید بیعت کرنا اصلاً جائز ہے، اس کو ناجائز کہنے کی وجہ کسی کی انا تو ہو سکتی ہے، نصوص شریعت میں تجدید بیعت اور تجدید توبہ کو حرام کرنے والی کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ اس بیعت کو صوفیہ اپنی اصطلاح میں بیعت تبرک کہتے ہیں۔ آپ کو ان کی اصطلاح نہیں ماننی مت مانیے، اسے بیعت توبہ ہی کہیے، ہمیں کوئی اعتراض نہیں، نہ کسی صوفی کو اعتراض ہے۔

اللہ رب العزت نے انسانوں کی ہدایت کے لیے ایک کتاب بھیجی اور پیغمبر کو بھیجا۔ وہ چاہتا تو ان دو واسطوں یا ان میں سے کسی ایک کے بغیر بھی انسانوں کی ہدایت کا سامان کر دیتا۔ لیکن یہ اس کا نظام ہے، اس کی مرضی ومنشا ہے۔ پھر اس نے پیغمبر کی ذمہ داریوں کا ذکر کیا کہ یہ کتاب پڑھ کر سناتے ہیں اور لوگوں کا تزکیہ کرتے ہیں۔ کتاب پڑھاتے ہیں اور حکمت سکھاتے ہیں۔ **يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ** (الجمعۃ: ۲) پتہ چلا کہ صرف علم دے دینا کافی نہیں، تربیت وتزکیہ بھی ضروری ہے۔

صوفیہ نے اس اصول اور سنت الٰہیہ کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالا کہ بعد کے عہد میں جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں نہیں رہے اور گناہوں اور معاصی کی طرف مسلمانوں کا عام میلان ہو گیا، تو اس ماحول میں بھی اگرچہ اللہ جسے چاہے بغیر تعلیم وتربیت کے سب کچھ بتا دے اور ہر طرح سے سنوار دے، لیکن سنت الٰہیہ کی پیروی یہ ہے کہ معلومات کے ساتھ کوئی ایک مربی بھی ہو جو نفس کا تزکیہ کرے اور کان سے ٹکراتی ہوئی معلومات کو قلب اور یقین کے اندرون تک اتار دے، تاکہ علم کا عملی ظہور ہو۔ اس کے لیے وہ کہتے ہیں کہ مبتدی کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی ایک مرشد ومربی کے زیر سایہ اپنا تزکیۂ نفس اور تربیت اخلاق کرے۔ اس مرشد کے حضور جو بیعت ہوتی ہے اور کلمات توبہ ادا کیے جاتے ہیں، اسی بیعت کو صوفیہ اپنی اصطلاح میں بیعت ارادت کہتے ہیں۔ اگر کسی کو اصرار ہے کہ وہ اس بیعت کو بیعت ارادت نہیں، بیعت توبہ یا بیعت اطاعت ہی کہے گا

،تو کہے،لفظوں کے بدلنے سے معانی تونہیں بدلتے اور نہ کوئی مرد دانا اس طرح سے لفظوں سے سروکار رکھتا ہے، نہ صوفیہ کو اصرار ہے کہ اس بیعت کو آپ بیعت ارادت کہیے۔ یہ ان کی اصطلاح ہے جس کا اتباع آپ پر ضروری نہیں۔لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ بیعت اطاعت کو یا بیعت توبہ کو کسی نے بیعت ارادت کا نام دے دیا تو گویا بکرے پر غیر اللہ کا نام پڑھ دیا اور اب وہ حرام ہو گیا۔صالحین و صادقین کی صحبت اختیار کرنا تو نص قرآنی سے واجب ہے، ایسے میں اگر کوئی شخص کسی زاہد و متقی کی بارگاہ میں رہ کر اپنا تزکیہ و تصفیہ کرتا ہے تو یہ عمل ناجائز و حرام کیوں ہو گیا؟ یہ بات فہم سے ماورا ہے۔رہا اس عہدِ صحبت کو بیعت ارادت کہنا تو یہ ایک اصطلاح ہے اور اہل علم کے یہاں یہ اصول مسلم ہے کہ اصطلاح اور محض لفظی تعبیر کی بنیاد پر کسی نزاع کا کوئی جواز نہیں ہے۔
لا مشاحۃ فی الاصطلاح۔

شبہہ: (۵) عقد بیعت کے ذریعے مرید اپنے پیر کی غیر مشروط اطاعت قبول کر لیتا ہے، جب کہ غیر مشروط اطاعت صرف اللہ و رسول کی جائز ہے۔

وضاحت: یہ وہ بنیادی غلط فہمی ہے جس کی وجہ سے صوفی نظام بیعت بہت سے معاصر ذہنوں میں کھٹکتا ہے۔اس کی دو وجہیں ہیں۔پہلی اور بنیادی وجہ صوفیہ کے تعلق سے رائے قائم کرنے میں عجلت اور شدت ہے، جب کہ دوسری وجہ خود صوفیہ کی بعض وہ عبارتیں ہیں جن سے اول نظر میں یہ دھوکا ہوتا ہے کہ بیعت، مرشد کے حضور مسترشد کی غیر مشروط اطاعت ہے، جب کہ یہ مجازی تعبیرات اور صوفیہ کی اپنی اصطلاحی لفظیات ہیں۔ان کی دیگر تصریحات یہ بات واضح کرتی ہیں کہ بسا اوقات غیر مشروط جیسے الفاظ سے ان کی مراد مشروط اطاعت ہی ہوتی ہے۔ کیوں کہ ان کے یہاں بھی غیر مشروط اطاعت صرف اللہ و رسول کے لیے ہے۔نیز مرشد کی اطاعت صرف معروف کی حد تک ہے۔منکرات و محرمات میں مرشد کی اطاعت ہرگز جائز نہیں اور نہ صرف جائز نہیں، بلکہ ایسا شخص مرشد ہو ہی نہیں سکتا جو محرمات کی اجازت یا حکم دے اور اگر غلطی سے کوئی ایسے شخص سے بیعت ہو گیا ہے تو اس کے اس فسق کے ظہور کے بعد اس کی بیعت آپ ٹوٹ جائے گی۔ہاں! یہ الگ بات ہے کہ اگر مسئلہ اختلافی ہو اور بعض علما جواز کی طرف گئے ہیں اور بعض عدم جواز کی طرف تو ایسے مسائل میں مرشد کی اطاعت کی جائے گی، اس لیے نہیں کہ وہ امر حرام ہے بلکہ اس لیے کہ وہ مختلف فیہ ہونے کے ساتھ مرشد کی نظر میں مباح ہے۔میرے ان خیالات کی تائید درج ذیل حوالوں سے ہوتی ہے:

(۱) صاحب عوارف المعارف شیخ شہاب الدین سہروردی رقم طراز ہیں:

''ہم یہ دیکھیں گے کہ کوئی شخص حدود شرعی میں سستی کر رہا ہے، فرض نماز کو چھوڑ ے

ہوئے ہے اور دوسرے فرائض کی ادائیگی سے بھی اغماض واہمال برت رہا ہے، تلاوت قرآن مجید اور روزہ ونماز کی حلاوت اور لذت کو بھی وہ خاطر میں نہیں لاتا اور حرام و مکروہات میں مبتلا ہے تو ہم ایسے شخص کو رد کر دیں گے اور قبول نہیں کریں گے اور نہ ہمارے نزدیک اس کا یہ دعویٰ قابل قبول ہوگا کہ اس کا باطن نیک اور درست ہے۔ میرے شیخ ضیاء الدین ابوالنجیب سہروردی نے اپنے شیوخ کی اسناد کے ساتھ حضرت جنید بغدادی کا یہ قول بیان کیا ہے کہ وہ ایک شخص سے معرفت کا تذکرہ فرما رہے تھے تو اس شخص نے کہا کہ اہل تقویٰ اور عارف باللہ تو زہد وتقویٰ کو ترک کر کے اللہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ سن کر حضرت جنید نے فرمایا کہ یہ قول اس گروہ اور جماعت کا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ وہ نیک اعمال بجالانے کی پابندی سے آزاد ہیں اور میرے نزدیک یہ ایک بڑی بلا ہے۔ جو شخص چوری اور زنا کرے وہ ایسے شخص سے بہتر ہے جو ایسا کہتا ہے۔"(۱)

(۲) عہد سلطنت کے معروف فقیہ صوفی، شاہ مینا لکھنوی کے مرید وخلیفہ علامہ شیخ سعد الدین خیرآبادی نے اس مسئلے کو مزید واضح کر دیا ہے، لکھتے ہیں:

''جب کوئی طالب مولیٰ کسی شیخ کے پاس پہنچے تو اسے چاہیے کہ احتیاط کرے اور شیخ کو پہچاننے کی کوشش کرے کہ کیا یہ شیخ کسی بدکردار کی اصلاح کر سکتا ہے اور یہ کہ کیا یہ مقتدا بننے کے قابل ہے؟ یعنی یہ دیکھے کہ اس کی صحبت اور اس کی نظر کی تائید سے فسق وفجور میں مبتلا افراد اپنے گناہوں سے توبہ کرتے ہیں یا نہیں اور صلاح وتقویٰ اور اطاعت و نیکی اختیار کرتے ہیں یا نہیں۔ اس کے اعمال، شریعت وطریقت کے موافق ہیں یا مخالف؟ اگر یہ دونوں اوصاف اس شیخ کے اندر موجود پائے تو اس کی ارادت میں داخل ہو جائے اور خود کو شیخ کا محکوم بنا دے اور ایسے ہو جائے جیسے مردہ غسل دینے والے کے ہاتھ میں ہوتا ہے ،اقوال و افعال میں اس کی اقتدا کرے، یہاں تک کہ شیخ اسے مقصود تک پہنچا دے اور جس میں یہ دونوں صفات نہ ہوں، جن کا تعلق ظاہر سے ہے، تو اس کی صحبت سے گریز کرے اور خود کو اس کی صحبت سے دور رکھے؛ کیوں کہ **الظاهر عنوان الباطن** ظاہر باطن کا پتہ دیتا ہے۔

بیشتر طالبین اسی مقام پر ہلاک ہوئے، بلکہ عام لوگوں کی ہلاکت گم راہ اور گم راہ گر علما ومشائخ کی پیروی کی وجہ سے ہے۔ گم راہ گر علما اور مشائخ وہ ہیں جو متبع شریعت

---

(۱) عوارف المعارف، ص:۲۱۹، مترجم شمس بریلوی، فرید بک ڈپو، دہلی، ۲۰۰۱ء

نہ ہوں، جو دنیا، نفس، جاہ وسروری اور خود بینی وخود رائی میں گرفتار ہوں، جن کی نظر ہمیشہ دوسروں پر ہو اور خود ان کا باطن پراگندہ ہو۔‘‘(۱)

مذکورہ بالا عبارت سے اگر کوئی شخص صرف یہ جملہ نکال لے کہ مرید ’’خود کو شیخ کا محکوم بنا دے اور ایسا ہو جائے جیسے مردہ، غسل دینے والے کے ہاتھ میں ہوتا ہے‘‘ اور اس سے یہ نتیجہ نکال لے کہ صوفیہ کے یہاں مرید بیعت کے ذریعے پیر کا غیر مشروط طور سے بندۂ بے دام ہو جاتا ہے، تو ایسے شخص کے لیے ہم اپنا تبصرہ محفوظ کیے لیتے ہیں؛ کیوں کہ لفظوں کے ضیاع کو بھی ہم تبذیر واصراف کا حصہ سمجھتے ہیں۔

شبہہ:(٦) نظام بیعت کی رو سے مرید پر پیر کا ہر حکم واجب التسلیم ہے، گویا اگر وہ شریعت کے خلاف بھی کوئی حکم دے تو اس کی بجا آوری ضروری ہے۔

وضاحت: اس کی توضیح سطور بالا سے ہو جاتی ہے۔ تاہم شریعت کی خلاف ورزی کرنے والوں کے تعلق سے حضرت شیخ سعد الدین خیر آبادی کا ایک اور اقتباس دیکھیے جس سے یہ واضح ہوگا کہ شریعت کی خلاف ورزی کرنے اور کرانے والا شخص صوفیہ کی نظر میں صوفی بلکہ مسلمان بھی نہیں ہے، چہ جائے کہ واجب الاطاعت مرشد ہو۔ شیخ سعد فرماتے ہیں:

’’گمراہوں کے ایک گروہ نے اپنے آپ کو جماعت صوفیہ سے ظاہر کرتے ہوئے، اباحت کا مذہب پیدا کر دیا اور یہ قول کیا کہ ہم قرب حق کے اس مقام تک پہنچ چکے ہیں کہ اب حق تعالیٰ کی بندگی ہمارے اوپر سے ساقط ہو گئی ہے، اس لیے کہ خدمت و بندگی قرب حاصل کرنے کے لیے ہوتی ہے، اب جب مقام قرب تک رسائی حاصل ہو گئی تو خدمت بے معنی ہے۔ یہ عقیدہ خالص گمراہی ہے۔ اس لیے کہ ہر وہ حقیقت جس کو شریعت رد کر دے وہ زندیقی ہے۔ **کل حقیقة ردتها الشریعة فهي زندقة۔** محققین نے ایسا عقیدہ رکھنے والے کو کافر کہا ہے۔ محققین وعارفین کا مذہب یہ ہے کہ بندہ کا قرب جس طور بڑھے گا وہ اسی قدر اوامر اور آداب شریعت کی پاس داری زیادہ کرے گا۔‘‘(۲)

شیخ سعد خیر آبادی بعض صوفیہ کے حوالے سے شیخ مرشد کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں: **الشیخ هو الذی یقرر الدین والشریعة فی قلوب المریدین والطالبین۔** شیخ وہ ہے جو

---

(۱) مجمع السلوک، ۱/ ۴۰۰، شاہ صفی اکیڈمی، سید سراواں، الہ آباد، ۲۰۱۶ء

(۲) مجمع السلوک، ۲/ ۵۱۱، شاہ صفی اکیڈمی، سید سراواں، الہ آباد، ۲۰۱۶ء

مریدوں اور طالبوں کے دل میں دین و شریعت کو مستحکم کرتا ہے۔ آگے رقم طراز ہیں:

آج میرے نزدیک وہ شخص شیخ اور قطب کامل ہے جو شریعت کو قائم کرنے والا ہو اور امور شریعت میں استقامت رکھتا ہو۔(۱)

صوفیہ نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ مرشد اولو الامر میں سے ہوتا ہے اور امیر کی اطاعت، اللہ و رسول کی اطاعت کے ساتھ مشروط ہوتی ہے۔ اللہ و رسول کی معصیت کے ساتھ کسی کی اطاعت ہرگز جائز نہیں اور نہ معصیت کا حکم دینے والا مرشد ہونے کی اہلیت رکھتا ہے۔ عصر حاضر کے عظیم صوفی شیخ ابو سعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی دام ظلہ العالی نے اطاعت مرشد کے مسئلے کو بہت ہی واضح انداز میں بیان کیا ہے۔ اسے بجا طور پر تعلیمات صوفیہ کا خلاصہ کہا جا سکتا ہے۔ شیخ سعدی کی ایک عبارت پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''شیخ کی تعظیم باپ کی طرح کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہم پر باپ کی تعظیم و توقیر اس وقت بھی واجب ہے جب وہ ہمارے اوپر یک گونہ ظلم کرتا ہے، ہمارے مال میں ہماری مرضی کے خلاف تصرف کرتا ہے، اپنے بیٹوں کے درمیان دو نظری رکھتا ہے، وغیرہ، اسی طرح اگر شیخ کا کوئی عمل بظاہر زیادتی معلوم ہو یا بظاہر خلاف شرع معلوم ہو، شیخ اپنی بشریت یا حکمت کی وجہ سے کوئی ایسا عمل کرے جو ہماری نظر میں درست یا مبنی بر انصاف معلوم نہ ہو، اس مقام پر بھی شیخ کا مکمل ادب و احترام اور تعظیم و توقیر واجب ہے۔ ہاں! ایسے امور جو شیخ اپنی بشیرت، غلبۂ حال، نسیان اور خطا کے سبب انجام دے رہا ہو اور وہ عمل شرعی طور پر بظاہر ناروا یا غیر مستحسن ہو تو اس میں شیخ کی پیروی نہیں کی جائے گی۔ اگرچہ ادب و احترام اس وقت بھی واجب ہوگا۔۔۔۔ ہاں! اطاعت شیخ میں یہ نکتہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ حرام قطعی میں شیخ کی اتباع نہیں کی جائے گی۔ اس لیے کہ جو صحیح معنوں میں مرشد ہوگا وہ ہرگز نہ حرام قطعی کا حکم دے گا اور نہ خود اس میں گرفتار ہوگا۔'' (۲)

شبہہ (۷) تزکیہ نفس اور تربیت اخلاق کے لیے اگر مرشد کی ضرورت مان بھی لی جائے تو یہ عوام کے لیے ہونی چاہیے، نہ کہ علما کے لیے جو براہ راست کتاب و سنت سے آشنا ہوتے ہیں۔

---

(۱) مجمع السلوک، ۱/ ۳۸۹، شاہ صفی اکیڈمی، سید سراواں، الہ آباد، ۲۰۱۶ء

(۲) الاحسان، شمارہ ۶، ص: ۲۴۵، شاہ صفی اکیڈمی، الہ آباد ۲۰۱۲ء

وضاحت: اس قسم کے شبہات عالم و عامل کے فرق کو نہ سمجھنے کے سبب ہیں۔ مرشد کا کام دراصل حسنات کا علم بخشنا نہیں ہے، بلکہ مسترشد کی ایسی ذہنی وفکری تربیت کرنا ہے کہ وہ حسنات کو اپنی زندگی میں اتار لے۔ چوری برائی ہے اور سچائی نیکی ہے۔ ہر شخص کو اس بات کا علم ہوتا ہے۔ لیکن انسان کی ایسی تربیت کہ وہ چوری سے قطعاً نفرت کرنے لگے اور سچائی کو لازمی طور پر اختیار کر لے، یہ کس قدر مشکل ہے، اہل نظر سے مخفی نہیں ہے۔ اس سے پتہ چلا کہ اچھائی اختیار کرنے اور برائی سے بچنے کے لیے اچھائی اور برائی کا محض عالم ہونا کافی نہیں۔ علم کے بعد بھی ہم اچھائیوں سے دور اور برائیوں میں ڈوبے رہتے ہیں۔ اسی المیہ سے نجات کے لیے اہل تصوف علما کے لیے بھی تربیت و تزکیہ اور مرشد و مربی کی ضرورت کے قائل ہیں۔ امزید تفہیم کے لیے یہ اقتباس پڑھیے:

”اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ کسی شخص کو بغیر کسی مرشد کی پیروی کے شایان شان رشد و ہدایت عطا فرما دے، بلکہ وہ تو اس پر بھی قادر ہے کہ قرآن و حدیث کے وسیلے کے بغیر ہی کسی کو اعلیٰ مقام تک پہنچا دے۔ وہ مالک الملک ہے، اپنی ملکیت میں جیسے چاہے تصرف فرمائے، لیکن یہ نوادرات میں سے ہے، اگر چہ ممکن ہے اور خطرات سے بھی خالی نہیں۔

دوسرے یہ کہ ایسا شخص دوسروں کا مرشد نہیں بن سکتا۔ اس کارگہِ حکمت میں کابراً عن کابرٍ، یہی سلسلہ اور طریقہ چلا آرہا ہے کہ سب نے شیخ کامل کو اختیار کیا۔“(۱)

شبہہ: (۸) بعض صوفیہ نے مرشد کے باب میں اتنا غلو کیا کہ گویا اسے مقام نبوت پر بٹھادیا۔ وہ اس طرح کی باتیں بھی کر جاتے ہیں کہ ”مرشد رسول مولیٰ ہم ایک دیکھتے ہیں۔“

وضاحت: یہاں دو باتیں قابل غور ہیں۔ پہلی یہ کہ صوفیہ کے بارے میں سب سے پہلے یہ ذہن نشیں کر لیا جائے کہ یہ دین و شریعت کو اکمل طریقے سے برتنے اور اس میں جینے والے لوگ ہیں۔ ان کا مقصود، رضائے مولیٰ اور طریق، اتباع مصطفیٰ ہے اور اسی مقصد کے حصول اور اسی طریقے پر مکمل طور سے گامزن ہونے کے لیے وہ مرشد کے زیر سایہ تربیت و تزکیہ کے مرحلوں سے گزرنے کو ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کی توحید و رسالت کے باب میں شک کرنا ظلم اور بدگمانی کی انتہا ہے اور اگر کوئی شخص شک، بدگمانی اور ظلم کا خوگر ہے تو اس کا علاج آسان نہیں ہے۔

پہلی بات کی مکمل وضاحت اور تفہیم کے بعد دوسری بات یہ ہے کہ صوفیہ مرشد کے احترام بلکہ غایت احترام کو ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ ضروری کوئی واجب شرعی نہیں، جس میں تساہل فسق اور

---

(۱) مجمع السلوک، ۱/ ۳۵۶، شاہ صفی اکیڈمی، الہ آباد، ۲۰۱۲ء

انکار کفر ہو، یہ ضرورتِ اخلاقی ہے۔ واجب شرعی تو سرے سے مرشد بنانا ہی نہیں ہے۔ ہاں! اگر کسی نے اپنے نفس کی تربیت وتزکیہ کے لیے کسی کو اپنا مرشد بنالیا ہے تو اس پر ضروری ہے کہ مرشد کا مکمل طور سے احترام کرے، کیوں کہ اس کے بغیر تربیت وتزکیہ کا عمل مکمل نہیں ہوسکتا۔ مرشد یونان کا فلسفی نہیں ہوتا، جو ارسطو اور بقراط کی گتھیاں سلجھائے اور اس کے لیے اس سے بحث وجدال قائم رکھا جائے، مرشد ایک مربی نفس ہوتا ہے، جو نفس وخواہش کے خلاف چلنے کی تدریجی تربیت کرتا ہے اور یہ مرحلہ جب ہی طے ہوسکتا ہے کہ مرد طالب، پیکر ادب اور خوگر تسلیم ہو۔ لیکن اس ادب وتسلیم اور احترام وتوقیر سے پہلے کا بھی ایک عظیم مرحلہ ہے جسے مرید کو طے کرنا ہوتا ہے۔ اس مرحلے سے ناواقفیت احترام مرشد کے حوالے سے بہت سے سوالات کو جنم دیتی ہے۔ وہ عظیم مرحلہ انتخاب مرشد کا ہے، جس کے تعلق سے بعض اشارے ماسبق میں گزر چکے ہیں۔ مرید پہلے یہ دیکھ لے کہ وہ شخص عالم، زاہد، متقی، پابند شریعت ہے اور اس کی محفل میں بیٹھنے والے بھی پابند شریعت ہیں، اب اپنے اوپر اس کی تعظیم وتسلیم کو واجب کرے۔ یہ تسلیم غیر اللہ کی اطاعت نہیں ہے، بلکہ طریق صالحین کی پیروی ہے جس کا حکم قرآن مقدس میں اس طرح آیا ہے:

وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ (لقمان: ۱۵) اس کے طریق کی پیروی کرو جو میری طرف متوجہ ہے۔

مذکورہ بالا دو باتوں کی توضیح کے بعد یہاں اصطلاحات ولفظیات صوفیہ کی طرف بھی توجہ کرنی ضروری ہے۔ اس کے بغیر اس قسم کے اشعار سمجھ میں نہیں آسکتے:

موج و حباب و دریا بس ایک ہی تو ہیں یہ
مرشد، رسول، مولیٰ، ہم ایک دیکھتے ہیں

اپنے مرشد کے بارے میں صوفیہ کی اس قسم کی باتیں بالعموم غلط فہمیاں پیدا کرتی ہیں اور یہ غلط فہمیاں دراصل صوفیہ کی اصطلاحات ولفظیات سے ناآشنائی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اس حوالے سے غلط فہمی کی سب سے بڑی وجہ صوفیہ کے نظریہ وحدۃ الوجود سے ناآشنائی یا غلط فہمی ہے۔ بہت سے لوگ وحدۃ الوجود کو عین حلول واتحاد سمجھ لیتے ہیں، جب کہ تقریباً تمام وحدۃ الوجودی صوفیہ کے یہاں حلول واتحاد کے الحادی نظریات سے براءت صاف طور پر مل جاتی ہے۔ ہاں! باشرع صوفیوں اور حلولیوں کی لفظیات بسا اوقات بظاہر ایک ہی معلوم ہوتی ہیں جس سے عام لوگوں کو بدگمانی پیدا ہوجاتی ہے۔ لیکن اگر ہمیں دوسرے ذرائع سے پتہ چل جائے کہ شخص مذکور حلولی ہے یا نہیں، تو اس کی بات کو سمجھنا آسان ہوجائے گا۔ علامہ ابن قیم الجوزیہ، جو صوفیہ مخالف طبقے کے نمائندگان میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی درج ذیل عبارت سے بھی میرے اس خیال کی تائید ہوتی ہے:

''ذہن نشین رہے کہ صوفیہ کے یہاں استعارات ہوتے ہیں، وہ بسا اوقات عام بول کر خاص اور لفظ بول کر اشارہ مراد لیتے ہیں، اس کے حقیقی معنی مراد نہیں لیتے۔ یہ باتیں دوسری جماعتوں میں نہیں پائی جاتیں۔ اسی لیے صوفیہ کہتے ہیں: ہم اہل اشارہ ہیں، اہل عبارت نہیں، اور یہ کہ ہمارے لیے اشارہ ہے اور دوسروں کے لیے عبارت۔ یہ حضرات کبھی ملحدین کی جیسی عبارتیں بولتے ہیں لیکن ان سے وہ ایسے معنی مراد لیتے ہیں جو ہر نقص وفساد سے پاک ہوتا ہے۔ یہ چیز دو جماعتوں کے لیے امتحان کا سبب بنی؛ ایک وہ جماعت جس نے ان کی ظاہری عبارت کو لے کر ان کو بدعتی اور گمراہ قرار دے دیا اور دوسری وہ جماعت جس نے ان کے مقصود ومراد کو دیکھتے ہوئے ان عبارات کو درست قرار دیا اور ان عبارات سے وہ اشارہ لینا صحیح ٹھہرایا۔ حق کا طلب گار حق کو قبول کرتا ہے وہ جس کی طرف سے بھی آئے اور مخالف حق بات کو رد کر دیتا ہے، خواہ وہ جس کی بھی ہو۔'' (۱)

اب مذکورہ بالا شعر کا مطلب سمجھیے، جس کے بعد صوفیہ کی اس قسم کی دیگر عبارتوں کو سمجھنا بھی آسان ہو جائے گا:

''جس طرح موج وحباب و دریا الگ الگ ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے وابستہ ہیں، اسی طرح اللہ، رسول اور امیر ومرشد تینوں الگ الگ ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ اللہ کریم مالک حقیقی اور مطلوب حقیقی ہے۔ رسول اللہ ﷺ جو کچھ کہتے ہیں وہ عین وحی الٰہی سے کہتے ہیں۔ اللہ کی مرضی سے ہٹ کر الگ ان کی اپنی کوئی خواہش یا مرضی نہیں ہوتی۔ اسی طرح صحیح معنوں میں مرشد وامیر وہ ہے جو اپنی خواہشات کے بت کو توڑ چکا ہو اور مرضی مولیٰ اور اطاعت

---

(۱) فَاعْلَمْ أَنَّ فِي لِسَانِ الْقَوْمِ مِنَ الِاسْتِعَارَاتِ، وَإِطْلَاقِ الْعَامِّ وَإِرَادَةِ الْخَاصِّ، وَإِطْلَاقِ اللَّفْظِ وَإِرَادَةِ إِشَارَتِهِ دُونَ حَقِيقَةِ مَعْنَاهُ: مَا لَيْسَ فِي لِسَانِ أَحَدٍ مِنَ الطَّوَائِفِ غَيْرُهُمْ، وَلِهَذَا يَقُولُونَ: نَحْنُ أَصْحَابُ إِشَارَةٍ لَا أَصْحَابُ عِبَارَةٍ، وَالْإِشَارَةُ لَنَا وَالْعِبَارَةُ لِغَيْرِنَا، وَقَدْ يُطْلِقُونَ الْعِبَارَةَ الَّتِي يُطْلِقُهَا الْمُلْحِدُ، وَيُرِيدُونَ بِهَا مَعْنًى لَا فَسَادَ فِيهِ، وَصَارَ هَذَا سَبَبًا لِفِتْنَةِ طَائِفَتَيْنِ: طَائِفَةٌ تَعَلَّقُوا عَلَيْهِمْ بِظَاهِرِ عِبَارَاتِهِمْ، فَبَدَّعُوهُمْ وَضَلَّلُوهُمْ، وَطَائِفَةٌ نَظَرُوا إِلَى مَقَاصِدِهِمْ وَمَغْزَاهُمْ، فَصَوَّبُوا تِلْكَ الْعِبَارَاتِ، وَصَحَّحُوا تِلْكَ الْإِشَارَاتِ، فَطَالِبُ الْحَقِّ يَقْبَلُهُ مِمَّنْ كَانَ، وَيَرُدُّ مَا خَالَفَهُ عَلَى مَنْ كَانَ. (مدارج السالکین بین منازل إیاک نعبد وإیاک نستعین، ۳/ ۳۰۹، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۹۹۶ء)

رسول میں فنا ہو۔ ایسا شخص ہی صحیح معنوں میں ہمارا مرشد ہے۔اس لیے اگر کہیں ایسا شخص مل جائے تو اس کا نقش پا بن جاؤ، ساحل مراد سے ہم کنار ہو جاؤ گے۔

صوفیہ کے یہاں وہ شخص امیر ومرشد بننے کے لائق ہی نہیں، جو اپنی خواہشوں کا غلام ہو، بلکہ اپنی خواہشات کا پجاری ان کے نزدیک صحیح معنوں میں مرید بننے کے بھی لائق نہیں ہے۔صوفیہ کی اصطلاح میں مرید وہ ہے جو رضائے مولیٰ کا ارادہ رکھنے والا ہو اور اس کے لیے اس نے کسی عبد کامل کی صحبت واطاعت قبول کر لی ہو اور مرشد وہ ہے جو فانی فی اللہ ہو، رضائے حق کی طلب میں اپنی خواہشات کو خاکستر کر چکا ہو، باقی باللہ ہو، اب اس کے سینے میں صرف مرضی مولیٰ اور اطاعت مولیٰ ہی باقی رہ گئی ہو، نیز اس کے اندر ایسی تربیتی صلاحیت ہو کہ دوسرے لوگ بھی اس کی صحبت میں پہنچ کر زہد و تقویٰ اور اطاعت وبندگی کے سانچے میں ڈھلتے جا رہے ہوں۔ ایسا شخص ہی صحیح معنوں میں مرشد ہے، جس کی اطاعت عین اطاعت رسول اور اطاعت حق ہے۔ وہی صحیح معنوں میں امیر اور اولوا الامر ہے، جس کی اطاعت ہم پر فرض ہے۔اس کی اطاعت اللہ ورسول کی جانب سے فرض ہونے کی وجہ سے عین اللہ ورسول کی اطاعت ہے، نہ یہ کہ وہ خود اللہ یا رسول ہے۔ نعوذ باللہ من ذلک۔ وہی شخص اس بشارت نبوی کا مستحق ہے: **مَنْ أَطَاعَنِي فَقَدْ أَطَاعَ اللهَ، وَمَنْ عَصَانِي فَقَدْ عَصَى اللهَ، وَمَنْ أَطَاعَ أَمِيرِي فَقَدْ أَطَاعَنِي، وَمَنْ عَصَى أَمِيرِي فَقَدْ عَصَانِي**(۱) جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی طاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی، اسی طرح جس نے میری جانب سے مقرر امیر کی پیروی کی اس نے میری پیروی کی اور جس نے اس کی پیروی سے روگردانی کی اس نے میری پیروی سے روگردانی کی۔‘‘

ان معانی وحقائق تک رسائی کے لیے صوفیہ کی مصطلحات اور لفظیات کو ان کی تشریح کے مطابق سمجھنے کی ضرورت ہے۔

شبہہ: (۹) نظام بیعت وارادت میں مرشد کو تحلیل وتحریم کا حق دے دیا گیا ہے، جو دین میں ایک مشرکانہ بدعت ہے۔

وضاحت: گذشتہ صفحات میں اتنا کچھ کہا جا چکا ہے کہ اب مزید اس پر کچھ کہنے کی حاجت نہیں رہ جاتی۔

---

(۱) الصحیح للامام البخاری (رقم الحدیث: ۷۱۳۷) الصحیح للامام مسلم، (رقم الحدیث: ۱۸۳۵)

شبہہ: (۱۰) صوفیانہ نظام بیعت میں مرشد کو غیب داں اور متصرف بنا دیا گیا ہے۔ یہ فکر اسلامی روح کے خلاف اور شرک کا دروازہ کھولنے والی ہے۔

یہ واقعی ایک ایسا شبہہ ہے جو اول نظر میں نئے اور کچے ذہن کو مشتبہ کرتا ہے۔ اس کی تفہیم کے لیے چند باتیں قابل غور ہیں:

۱- صوفیہ توحید کے معاملے میں سب سے آگے ہیں۔ اللہ کی معرفت بڑھنے کے ساتھ توحید میں استحکام آتا جاتا ہے۔ صوفیہ دوسروں کے بالمقابل زیادہ عارف ہوتے ہیں، اس لیے ان کی توحید بھی بہت گہری، مستحکم اور تحقیقی ہوتی ہے۔ علم، قدرت، حکم، فعل کو ہر جگہ وہ بالذات اللہ واحد کی طرف ہی منسوب کرتے ہیں۔ وہ اس معاملے میں اپنی خودی کی بھی نفی کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے عقیدۂ توحید کی ایک جھلک اس شعر کی روشنی میں دیکھی جا سکتی ہے:

درایں نوعی از شرک پوشیدہ ست — کہ زیدم بیازرد و عمرم بخست

جب تک تم اس بات کے شاکی ہو کہ ''زید نے مجھے ستایا'' یا ''عمر نے مجھے تکلیف دی''، تو سمجھ لو کہ ابھی تمھارے اندر شرک کا یک گونہ اثر باقی ہے۔

۲- علم و قدرت اور امر و قضا کا تنہا منبع اللہ تعالیٰ کو تسلیم کرتے ہوئے، وہ اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ جس کو جتنا علم و قدرت دینا چاہے، دے سکتا ہے۔ صفت علیم و قدیر کا مطلب صرف یہ نہیں کہ وہ علم اور قدرت والا ہے، اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ وہ جس کو جتنا چاہے علم و قدرت عطا کر سکتا ہے۔

۳- صوفیہ اس بات کے قائل ہیں کہ نبوت کا سلسلہ ٹوٹ جانے کے باوجود الہام اور خواب کا تسلسل باقی ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ قلب جس قدر مزکّٰی، مصفّٰی اور مجلّٰی ہوتا جائے گا اور عمل جس قدر شریعت کے موافق اور مرضی مولیٰ سے قریب ہوتا جائے گا، اسی قدر دل انوار و تجلیات کا مہبط بنتا جائے گا اور وہ شخص مُلہَم و مُحدَّث ہوتا چلا جائے گا۔

۴- صوفیہ دیگر احکام شرعیہ میں بہ تمام و کمال اتباع کے ساتھ، حسن ظن کے معاملے میں بھی اسلامی مثالیت کی مثال اور بدگمانی اور سوئے ظن سے دور و نفور ہوتے ہیں۔ وہ ہر دوسرے شخص کو اپنے سے بہتر سمجھتے ہیں۔ وہ تحقیرِ نفس کو تزکیۂ نفس کا لازمہ سمجھتے ہیں۔ اس باب میں سب سے زیادہ حسن ظن انھیں اپنے شیخ و مرشد سے ہوتا ہے۔

۵- مرید مرشد کی صحبت اس لیے اختیار کرتا ہے تاکہ اس کے اخلاق کی تربیت اور اس کے نفس کا تزکیہ ہو۔ اس کے لازمی معنی یہ ہوئے کہ وہ ایسے شخص کو مرشد بناتا ہے جو اس کے حسن ظن کے مطابق مجلی و مصفی ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اپنے پیر و مرشد کے بارے میں یہی حسن ظن رکھتا ہے کہ وہ ملہم ہوگا اور نور الٰہی سے دیکھنے والا ہوگا۔ نور الٰہی سے دیکھنا اور ملہم و محدَّث ہونا یہ تمام باتیں

احادیث سے ثابت ہیں۔اس لیے صوفیہ اس ثابت شدہ حقیقت کو اپنے مرشد میں پائے جانے کا حسن ظن رکھتے ہیں؛ کیوں کہ وہ اپنی تلاش وجستجو میں اس شخص کو مرشد بناتے ہیں جو دوسروں سے زیادہ متقی اور زاہد ہو۔لہٰذا ملہم ومحدَّث ہونے کا زیادہ امکان مرشد کے ساتھ ہوتا ہے۔

۶-مرشد کے بارے میں ملہم ومحدَّث ہونے کا حسن ظن رکھنا،صوفیہ کے یہاں تربیت نفس کی رو سے بھی اہمیت رکھتا ہے۔نظام بیعت کی رو سے مرشد امیر ہوتا ہے اور اس حیثیت سے مرید، مرشد کے ماتحت اور اس کے حضور جواب دہ ہوتا ہے۔اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ظاہر و باطن میں پیکر اطاعت وعبدیت بن جائے۔اتباع نفس وشیطان سے بچنے کے لیے اتباع شیخ کرے اور اتباع شیخ کے توسط سے اس کا نفس اللہ و رسول کی اطاعت کا خوگر بن جائے۔ مرشد اس کے لیے نگراں،معاون اور محافظ ہوتا ہے۔ایسے میں تربیت کا عمل زیادہ مؤثر جب ہوگا کہ وہ اپنے مرشد کے آداب اور احکام کا لحاظ غائبانہ بھی رکھے اور ایسا اسی وقت ممکن ہوگا جب وہ اپنے مرشد کو ملہم سمجھے۔

۷-اب یہ سوال زیادہ اہم ہے کہ الہام کا مغیبات اور یقینیات سے کیا تعلق ہے؟ اور شریعت میں اس کا کیا مقام ہے؟ تو یہ ایک مستقل بحث ہے،جس پر تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہے۔ اسی سے جڑا ہوا ایک مسئلہ کرامت کا ہے۔کرامت کے تعلق سے بھی اہل اسلام کے اپنے مواقف اور اختلافات ہیں،جن کی روشنی میں ہی مسئلے کی پوری وضاحت ممکن ہے۔

۸-الہام وکرامت کے تعلق سے ایک اجمالی حقیقت یہ ہے کہ کسی کے صاحب الہام یا صاحب کرامت ہونے کے یہ معنی نہیں کہ وہ مکمل طور سے عالم الغیب اور متصرف مطلق ہو گیا ہے۔ یہ تو صرف خاصۂ الٰہی ہے۔کسی بندے کے بارے میں ایسا عقیدہ رکھنا یقیناً شرک ہے۔اہل اسلام میں اہل سنت الہام اور کرامت کے قائل ہیں اور اس کا دائرہ ان کے نزدیک متعین ومحدود ہے، مطلق ولامحدود نہیں۔

۹-الہام کے قائلین اہل سنت کے نزدیک الہام ایک ظنی وسیلۂ علم ہے۔اس کی ظنی حجیت بھی کتاب وسنت کی موافقت سے مشروط ہے۔ ایسا الہام جو کتاب وسنت کی تصریحات و مقتضیات کے خلاف ہو، وہ قطعاً مردود ہے۔پھر الہام کا تعلق کسی امر خاص سے ہوتا ہے،ایسا نہیں کہ صاحب الہام پر زمین وآسمان کی ساری چیزیں روشن وتاباں ہوں۔پھر یہ کہ الہام کی جتنی روشنی ملتی ہے،وہ اللہ کا عطیہ ہوتی ہے،اس میں صاحب الہام کا اپنا کوئی کردار نہیں ہوتا۔

۱۰-اسی طرح کرامت کے قائلین اہل سنت کے نزدیک کرامت عبد صالح پر اللہ کی نوازش ہے۔اس میں اس بندے کا کوئی اپنا کردار نہیں ہوتا۔اس کا تعلق کسی خاص معاملے میں کسی عبد صالح کی قبولیت دعا یا اس کے موافق فیصلۂ الٰہی سے ہے۔کسی بندے کے صاحب کرامت

ہونے کے یہ معنیٰ نہیں کہ وہ خود ہی علی کل شئی قدیر ہے۔ کرامت کا امکان زہد و تقویٰ کے اس مقام سے وابستہ ہے جس کو امام بخاری نے کتاب الرقاق، باب التواضع میں نقل کیا ہے، جس کے مطابق بندہ نوافل کے ذریعے رب کا تقرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ رب تعالیٰ اس کا ہاتھ بن جاتا ہے جس سے وہ پکڑتا ہے، زبان بن جاتا ہے جس سے وہ بولتا ہے، پیر بن جاتا ہے جس سے وہ چلتا ہے۔(۱) یا پھر کرامت کا تعلق فقر و بے ریائی اور عبدیت و ملامت کی اس منزل سے ہے جس کی طرف اس حدیث سے اشارہ ہوتا ہے جسے امام مسلم نے کتاب البر والصلۃ والآداب میں نقل کیا ہے۔(۲) کرامت کا انکار معتزلہ وغیرہ کے یہاں پایا جاتا ہے اور صاحب کرامت کو قادر مطلق تصور کرنا حلولی زنادقہ کے یہاں متصور ہے۔ اہل تصوف افراط و تفریط کے ان دونوں کناروں سے دور، موقف اہل سنت کے حامل ہیں۔

خلاصۂ گفتگو

زیر نظر مقالے میں مستند حوالوں سے صوفیہ کے نظام بیعت کو واضح کرنے کے ساتھ اس سے متعلق جدید ذہن کے چند اہم شبہات زیر بحث لائے گئے ہیں اور ان کا معروضی تجزیہ اور علمی جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس پوری تحریر سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ صوفیہ کا نظام

---

(۱) مَنْ عَادى لِي وَلِيًا فَقَدْ آذَنْتُهُ بِالحَرْبِ، وَمَا تَقَرَّبَ إِلَيَّ عَبْدِي بِشَيْءٍ أَحَبَّ إِلَيَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ، وَمَا يَزَالُ عَبْدِي يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتَّى أُحِبَّهُ، فَإِذَا أَحْبَبْتُهُ: كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ، وَبَصَرَهُ الَّذِي يُبْصِرُ بِهِ، وَيَدَهُ الَّتِي يَبْطِشُ بِهَا، وَرِجْلَهُ الَّتِي يَمْشِي بِهَا، وَإِنْ سَأَلَنِي لَأُعْطِيَنَّهُ، وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِي لَأُعِيذَنَّهُ، وَمَا تَرَدَّدْتُ عَنْ شَيْءٍ أَنَا فَاعِلُهُ تَرَدُّدِي عَنْ نَفْسِ المُؤْمِنِ، يَكْرَهُ المَوْتَ وَأَنَا أَكْرَهُ مَسَاءَتَهُ"

جو میرے ولی کی دشمنی مول لے اس کے لیے میری طرف سے جنگ کا اعلان ہے۔ میرا بندہ سب سے زیادہ میرے فرائض پر عمل کر کے میرا تقرب حاصل کرتا ہے۔ اس کے بعد نوافل کے ذریعے میرے قرب کے منازل سے گزرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ مقام محبوبیت پر آ جاتا ہے۔ جب وہ اس مقام پر فائز ہو جاتا ہے تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، نگاہ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، پیر بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے، اگر وہ میری بارگاہ میں زبان سوال کھولتا ہے تو میں ضرور اسے عطا کرتا ہوں اور اگر میری پناہ چاہتا ہے تو ضرور میں اسے اپنی پناہ میں رکھتا ہوں۔ مجھے سب سے زیادہ اس کی جان پر پیار آتا ہے۔ اسے موت سے تکلیف ہوتی ہے اور مجھے اس کی تکلیف سے تکلیف ہوتی ہے۔

(۲) رُبَّ أَشْعَثَ، مَدْفُوعٍ بِالْأَبْوَابِ لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللهِ لَأَبَرَّهُ (بَابُ فَضْلِ الضُّعَفَاءِ وَالْخَامِلِينَ)

بہت سے پراگندہ حال فقیر، جنھیں دروازوں سے دھتکار دیا جاتا ہے، ان میں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اگر وہ کسی بات کے لیے اللہ کی قسم کھالیں تو اللہ اسے ضرور پورا فرماتا ہے۔

بیعت ایک مسنون نظام ہے جس کا سلسلہ عہد رسالت سے مربوط ہے۔ نیز یہ کہ یہ نظام صوفیہ کے یہاں کوئی واجب شرعی نہیں کہ اس کا تارک ومنکر، فاسق وگمراہ ہو، یہ ایک اخلاقی اور تربیتی نظام ہے جس میں شمولیت کا ہر مسلمان مجاز ومختار ہے۔ اس تحریر سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ صوفیہ کے یہاں مرشد کا مقام واقعی کیا ہے او اس کی اطاعت کا دائرہ کہاں تک ہے اور یہ کہ تصوف کے نام پر اگر کوئی خلاف شرع امور کا ارتکاب کرتا ہے اور مرشد بن کر لوگوں کو شریعت سے دور کرتا ہے تو ایسا شخص صوفیہ کے یہاں مسلمان ہی نہیں، چہ جائے کہ وہ مرشد ومربی ہو۔ ایمان کے ایسے رہ زنوں سے صوفیہ ہمیشہ دور ونفور رہے ہیں اور دوسروں کو دور ونفور رہنے کی تلقین کی ہے۔ ایسے رہ زنوں کے خلافِ شرع اعمال کی بنیاد پر تصوف کو نشانہ بنانا یا صوفیہ کے نظام بیعت کو مسترد کرنا علمی خیانت اور اخلاقی ظلم ہے، جس کی جرأت کوئی انصاف پسند نہیں کرسکتا۔

نظام بیعت کو مشکوک بنانے کے لیے صوفیہ کے شطحات اور بعض جھوٹی سچی روایات کو بھی بعض حضرات اپنے مستدل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ہم اس بحث کو یہاں اس لیے نظر انداز کرتے ہیں کہ اولاً اس کا براہ راست تعلق نظام بیعت سے نہیں اور ثانیاً شطحات کا موضوع ایک مستقل اور مفصل موضوع ہے، جس پر الگ سے تفصیلاً لکھنے کی ضرورت ہے۔ شطحات کے باب میں پہلا مقام متعلقہ شخص سے ان کا تاریخی انتساب ہے۔ جو لوگ کرامتوں کو کہانیاں کہہ کر رد کردیتے ہیں، جب شطحات کی بات آتی ہے تو وہی لوگ کہانیوں کے ریگستان پر کفر وارتداد کے قلعے تعمیر کرتے نظر آتے ہیں۔ پھر ان کی تاویل وتفہیم، ان کے صدور کے اسباب وغیرہ تفصیلی مباحث ہیں، جن کا احاطہ یہاں ناممکن ہے۔ تاہم شطحات کے تعلق سے علامہ ابن قیم الجوزیہ کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

وَهَذِهِ الشَّطَحَاتُ أَوْجَبَتْ فِتْنَةً عَلَى طَائِفَتَيْنِ مِنَ النَّاسِ. إِحْدَاهُمَا حُجِبَتْ بِهَا عَنْ مَحَاسِنِ هَذِهِ الطَّائِفَةِ، وَلُطْفِ نُفُوسِهِمْ، وَصِدْقِ مُعَامَلَتِهِمْ، فَأَهْدَرُوهَا لِأَجْلِ هَذِهِ الشَّطَحَاتِ، وَأَنْكَرُوهَا غَايَةَ الْإِنْكَارِ، وَأَسَاءُوا الظَّنَّ بِهِمْ مُطْلَقًا، وَهَذَا عُدْوَانٌ وَإِسْرَافٌ. فَلَوْ كَانَ كُلُّ مَنْ أَخْطَأَ أَوْ غَلِطَ تُرِكَ جُمْلَةً، وَأُهْدِرَتْ مَحَاسِنُهُ، لَفَسَدَتِ الْعُلُومُ وَالصِّنَاعَاتُ، وَالْحِكَمُ، وَتَعَطَّلَتْ مَعَالِمُهَا. (۱)

”یہ شطحات دو جماعتوں کے لیے فتنے کا سبب بنے، ایک جماعت ان کی وجہ سے صوفیہ کے محاسن، ان کے نفوس کی لطافت اور ان کے معاملے کی سچائی سے محجوب

---

(۱) مدارج السالکین بین منازل ایاک نعبد وایاک نستعین، ۲/ ۴۰، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۹۹۶ء)

ہوگئی۔ان شطحات کی وجہ سے انہوں نے ان کو چھوڑ دیا۔ان کا شدو مد سے رد کیا اور ان سے بری طرح بدگمان ہو گئے۔جب کہ یہ سراسر ظلم اور ناانصافی ہے۔اگر ہر خاطی کو بالکلیہ رد کرنے اوراس کے تمام محاسن سے نظریں پھیر لینے کو وتیرہ بنالیا جائے،تو سارے علوم،ساری صنعتیں اورساری حکمتیں متروک اور پائمال ہوجائیں گی۔''

علامہ ابن قیم کی ایک دوسری عبارت پر اپنی بات ختم کرتا ہوں،جس کو پیش نظر رکھا جائے تو تصوف اور نظام تصوف سے متعلق بہت سی بدگمانیوں کی بنیادوں تک رسائی بھی آسان ہوجائے گی اور ان سے بچنا بھی آسان ہوجائے گا۔مولانا ضیاء الرحمان علیمی نے علامہ ابن قیم کی طریق الہجر تین کے حوالے سے نقل کیا ہے:

الصوفية ثلاثه أقسام: صوفية الأرزاق،صوفية الرسوم،وصوفية الحقايق، وبدع الفريقين المتقدمين يعرفها كل من له إلمام بالسنة والفقه، وإنما الصوفية صوفية الحقائق الذين خضعت لهم رؤوس الفقهاء والمتكلمين،فهم في الحقيقة علماء حكماء۔

صوفیہ کی تین قسمیں ہیں:(۱) صوفیۃ الارزاق،(۲) صوفیۃ الرسوم اور(۳) صوفیۃ الحقائق، پہلے دونوں گروہوں کی بدعتوں سے ہر وہ شخص واقف ہے جس کو سنت وفقہ سے تھوڑا سا بھی لگاؤ ہے۔درحقیقت صوفیہ تو صوفیۃ الحقائق ہیں جن کے آگے فقہا و متکلمین کی گردنیں جھکتی ہیں۔یہی لوگ درحقیقت علما اور حکما ہیں۔(۱)

اللہ رب العزت ہمیں صوفیۃ الحقائق کی بیعت،صحبت اور تربیت میں رکھے اور صوفیۃ الرسوم اور صوفیۃ الارزاق کے فتنوں سے امان نصیب کرے۔آمین

○○○

(۱) مجلہ الاحسان شمارہ،۳،ص:۲ ۱۳،شاہ صفی اکیڈمی،الہ آباد،۲۰۱۲

پروفیسر منظر اعجاز

الٰہیاتی تفکر کی شاعرانہ ترسیل

مثنوی نغمات الاسرار فی مقامات الابرار کا فکری مطالعہ

دعوت اسلام اور تبلیغ دین کے سلسلے میں صوفیائے کرام کے اسالیب بیان، واعظین و متشرعین سے مختلف رہے ہیں اور روحانی حلاوت ووجدانی کیفیت کی وجہ سے ان میں تاثیر بھی زیادہ رہی ہے، شعری اسالیب میں یہ تاثیر اور بھی فزوں تر دیکھی جاتی ہے، زیر نظر نغمات کی بھی یہی کیفیت ہے، نغمہ نگار شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی ہیں جو دور حاضر کے صوفی باصفا ہیں، شاعر واہل علم وقلم ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب دل بھی ہیں اور مسند ارشاد وہدایت پر بھی متمکن ہیں، ان کی کتاب نغمات عارفانہ بصیرت، متصوفانہ نکات اور شاعرانہ مکالمات پر مشتمل اخلاق واحسان کے درسیاتی نصاب کی حیثیت رکھتی ہے، شعری اسلوب میں صوفیانہ مشاہدات وتجربات کی پیشکش کے لیے جوفورم اختیار کیا گیا ہے وہ مثنوی کا فورم ہے جسے خواجہ الطاف حسین حالی نے کبھی بکار آمد صنف سخن قرار دیا تھا کہ اس میں بالتفصیل کسی تصور یا خیال کوشرح وبسط اور تسلسل کے ساتھ بیان کیا جاسکتا ہے، اسی لیے اظہار کے پیرایوں اور ترسیل کے وسائل میں اس فورم کو موثر ترین وسیلہ مانا جاتا رہا ہے۔

فارسی میں تاریخی وقائع پر مشتمل ابو القاسم فردوسی کی تصنیف ''شاہنامہ'' اور متصوفانہ وعارفانہ نکات پر مشتمل حضرت مولانا روم کا عظیم الشان کارنامہ مثنوی کے فورم میں ہی ہے، اردو کے دور قدیم میں بھی بے شمار مثنویاں ہندی عربی اور ایرانی روایات کے زیر اثر تصنیف کی گئیں اور عہد متوسط تک یہ سلسلہ رفتار کی سرعت سے جاری رہا، اس صنف سخن میں عشقیہ اور اخلاقی مضامین کے طومار وانبار لگائے جاتے رہے، ہندوستان کے دور جدید میں، جدید افکار وتصورات کی پیشکش کے لیے حالی وآزاد اور دوسرے شاعروں نے اسی ہیئت کو اختیار کیا، لیکن اقبال نے فلسفیانہ افکار وتصوارت اور شاد عظیم آبادی نے سیاسی خیالات کی پیشکش کے لیے اس ہیئت کو اختیار واستعمال کر

کے اس کے حدود میں وسعت پیدا کی۔شاد و اقبال کے بعد علامہ جمیل مظہری، عبد المجید شمس اور مرتضی اظہر رضوی وغیرہ نے اپنی مثنویوں سے اس صنف سخن میں اور بھی تنوع اور بوقلمونی ورنگا رنگی پیدا کی لیکن موجودہ دور میں شاعروں کو غزل کی ریزہ خیالی ہی راس آتی ہے، اس لیے مثنوی نگاری کا فن زیب طاق نسیاں ہو کر رہ گیا ہے، ایسی صورت حال میں مثنوی کے فورم پر مشتمل نغمات الاسرار دیکھ کر مسرت ہوئی اور مشتملات بصیرت افروزی کا سبب ہے۔

نغمات الاسرار میں وہی بحر وزن یا ہیئت وساخت دکھائی دیتی ہے جو مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی میں ہے، یعنی بحر رمل مسدس محذوف (فاعلاتن فاعلاتن فاعلن) آغاز اس شعر سے ہوا ہے:

طائر قدسی حقیقت آشنا
لحن دوٗدی میں ہے نغمہ سرا

سات اشعار پر مشتمل ابتدائیہ ہے، اس کے تقریبا تمام اشعار شاعرانہ تعلّی کی حیثیت رکھتے ہیں، محولۂ بالا شعر سے بھی تعلیٰ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، پوری مثنوی جو مختلف عنوانات یا ابواب پر مشتمل ہے ۲۹ صفحات میں سمٹی ہوئی ہے اور یہ عنوانات ہیں:

حقیقت اشیا کا بیان، وفی انفسکم افلاتبصرون، وحدت کا بیان، نور ظہور ذات کا بیان، کنت کنزا مخفیا فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق، نعت حقیقت محمدی، مثال، فضائل آداب نبوی، اطاعت وپیروی آنحضرت، عظمت ورفعت آنحضرت، شان بشریت کا بیان، آنحضرت پر علوم غیب کے انکشاف کا بیان، شان اولیا اللہ، نسبت بیعت، مثال، اولیا کی عظمت کا بیان، آداب شیخ کامل، طالب صادق کے لیے ضرورت شیخ اور آداب بارگاہ شیخ کا بیان، سالکین راہ طریقت کے مابین اختلاف کا بیان، سماع ووجد کا بیان، شریعت، طریقت، حقیقت، اور معرفت، تصوف کی فضیلت، فقیہان خشک اور صوفیان جاہل ومکار کا بیان، علمائے سو کا بیان، فضیلت فقر وتصوف، شان علمائے برحق، شرائط شیخی ودرویشی، آداب مریدین، استقامت، طالبان حق کے لیے پند ونصائح، اذکار واشغال کا بیان۔مناجات بدرگاہ قاضی الحاجات، خاتمہ۔

ص:۷۷ سے ص:۱۲۶ تک بعنوان رموز نغمات ''ذیشان احمد مصباحی کی تشریحات وتعبیرات بھی ہیں جن سے مثنوی کے اہم رموز ونکات کی تفہیم میں آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ ہر باب یا ہر عنوان کے تحت پیش آنے والی لفظی ومعنوی مشکلات کی وضاحت سادہ وسلیس اسلوب میں کی گئی ہے اور یہ بھی اس کتاب کی ایک اہم خوبی ہے۔

ایک خاص وصف اس مثنوی کا جو بعض اشعار سے نمایاں ہے، وہ یہ ہے کہ مرشد گرامی نے مسند ارشاد سے ارادت مندوں کے لیے ہدایات جاری کی ہیں، ایسے اشعار کے انداز تخاطب پر

نظر ڈالی جائے تو میرے خیال کی تائید وتوثیق ہوسکتی ہے، اس سلسلے کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

دست بیعت اور نسبت اے پسر
صورت و شکل قلم ہے سر بسر
انبیا سے اولیا تک اے اخی
جو قلم لگتی چلی آئی یونہی
صدق دل سے بے محابا اے پسر
امر و نہی شیخ کو تسلیم کر
عالم و فاضل شدی تو اے اخی
جہد بر آں کن کہ تو مومن شوی

اگر ان شعار کے حوالے سے نغمات الاسرار پر نظر ڈالی جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ مثنوی کے مشتملات مرشد گرامی کے منظوم ملفوظات ہیں، صنفی، فنی اور نوعی لحاظ سے دیکھنے کا یہ ایک زاویہ ہے جس پر اصرار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اصل مقصد تو ترسیل معانی اور جہان معنی کی سیر ومشاہدہ ہے اور تمام گفتگو مشاہدہ حق سے ہی متعلق ہے۔ تصوف وطریقت اور حقائق ومعارف کے بیان سے دل کی آنکھیں کھلتی رہی ہیں، نغمات الاسرار کی معنوی کیفیات ایسی ہی ہیں، یہ گوش دل سے سنا جانے والا بیان ہے، صرف قرات کی بدولت روح معانی تک رسائی ممکن نہیں کیونکہ:

ساز ہستی پردۂ الہام ہے
نغمۂ تار نفس پیغام ہے

شاعری کو تو یوں بھی ایک قدیم یونانی صوفی وفلسفی افلاطون نے عطیہ ربانی قرار دے کر الہام ہی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور شاعر کو مقربان ومخبران غیب بلکہ واضح طور پر پیغمبروں میں شمار کیا ہے، اس سے بظاہر یہی معنی نکلتا ہے کہ شاعری میں اکتساب کوئی معنی نہیں رکھتا ہے، جو کچھ ہے وہ الہام ہی ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ الہام، اکتساب کا ہی نتیجہ ہے، اکتساب کی نوعیت وکیفیت غیر معروف طریق کار سے متعلق ہوسکتی ہے اور معروف طریق کار سے بھی، حضرت شیخ کے اکتسابات میں یہ دونوں طریق کار، کارفرما دکھائی دیتے ہیں۔

مشتملات کے مطالعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن وحدیث اور سیرت وسنن کے علاوہ صوفیانہ اشعار واقوال سے بھی استفادہ کیا گیا ہے، حضرت کے سوانحی احوال میں مولانا روم اور مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحی منیری کے سرمایہ قول وکلام کا ذکر ملتا ہے جس سے اکتساب کے معروف طریق کار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ نغمات الاسرار اور رموز نغمات بشمول پیش لفظ کے

مطالعے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ جناب شیخ کے مطالعے میں امام غزالی جیسے صاحب علم کلام کے رشحات قلم احیاء العلوم اور ''المنقذ'' وغیرہ بھی رہے ہیں اور ان سے بھی فکر و نظر کی بصیرت کشید کی گئی ہے لیکن اثرات کے اوزان و مقدار کا تعین نہیں کیا جا سکتا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کس نے کس حد تک متاثر کیا اور شاید یہ کہنے کی ضرورت بھی نہیں۔ اس مثنوی کو متصوفانہ روایات کے تناظر میں ہی دیکھتا ہوں جس کے دو مکتبے ''وحدت الوجود'' اور ''وحدت الشہود'' رہے ہیں۔ اس کے فکری مباحث نے تنازعات بھی پیدا کیے ہیں لیکن حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ان دونوں میں تشبیہ واستعارہ کا ہی فرق قرار دے کر اس تنازع کو رفع دفع کرنے کی سعی مستحسن کی ہے یعنی دونوں کے تجربات میں وحدت ہے، تجزیہ دونوں کا ایک ہی ہے، اختلاف کی صورت اسلوب بیان نے پیدا کی ہے۔ وجود تو صرف باری تعالی کا ہی ہے، کائنات اور اس کے مظاہر و موجودات عین حق ہیں یا مظہر حق ہیں اس سوال نے پیچیدگیاں پیدا کی ہیں۔ لیکن اس سلسلے کی کثرت آرائی خیال بے معنی ہے قرآن حکیم کی عبارت ''اللہ نور السموت والارض'' پر متصوفین گرامی کا بھی ایمان وایقان غیر متزلزل رہا ہے خواہ وہ وحدت الوجود کے معتقد رہے ہوں یا وحدت الشہود کے۔ شہودی نظریہ کے بنیاد گزاروں اور پیروکاروں نے وجود باری تعالی کی تنزیہی حیثیت اور ماورائیت کو برقرار رکھنے کے لیے' [شہود'' کی اصطلاح وضع کی۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ اسلامی عینیت پسندوں نے الہیاتی تفکر میں غلو کیا اور خدا کے منزہ اور ماوراوجود کے منکر ہوئے۔ اکثریت کا اس خیال پر اتفاق ہے کہ وجود باری تعالی محیط بر کل ہے۔ اسلامی عینیت پسندوں کا یہ عقیدہ کبھی نہیں رہا کہ ہر شئی یا مظہر میں وجود باری تعالیٰ حلول کیے ہوئے ہے۔ اگر ایسا ہو تو کسی شی میں ہاتھ تک نہیں لگا یا جا سکتا۔ قدیم ہندی تصوف میں تو اس کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وجود باری تعالی بہر حال منزہ اور وجود انسانی آلودہ و کثیف ہے۔ بہر حال حلول کے تصور سے بے عملی پیدا ہوتی ہے جب کہ اسلامی عقیدے کا اصرار تحرک و تحریک عمل پر ہے۔ اس کی نوعیت اور معنوی کیفیت ''نماز'' سے ظاہر ہے ۔اس سلسلے کا نہایت ہی مشہور شعر فارسی میں اس طرح ہے:

روز محشر کہ جاں گداز بود
پرشش اولیں نماز بود

اسلامی اصول عبادات میں نماز کو اولیت حاصل ہے جس میں جسم حرکت میں لیکن ذہن مرتکز بالذات باری تعالی رہتا ہے، یا رہنا چاہیے۔ یہ تربیت کا ایسا اصول ہے کہ بندۂ خدا خدا کی یاد سے کسی بھی لمحہ غافل نہ ہو۔ روزہ کا مقصد تزکیہ نفس وطہارت قلب ہے تاکہ نور الہی سے انسان کا سینہ معمور رہے۔ تقرب الہی کے لیے یہ ضروری ہے اور تقرب الہی انسان کی بلند ترین آرزو ہے

خواہ وہ خدا کا تصور کسی بھی صورت میں قائم کیوں نہ کرے۔اور اس کا انتہائی مقصد حیات دوام کا حصول ہے۔ یہ مقام اور یہ مرتبہ اخلاص فی العمل سے ہی حاصل ہوتا ہے اور صوفیائے کرام اس کی ترغیب دیتے رہے ہیں، اسی کی تلقین کرتے رہے ہیں۔ان کے ارشادات گرامی میں مدبرانہ، مفکرانہ اور حکیمانہ نکات روشن ہوتے رہے ہیں۔ایک فلسفی کا قول ہے کہ ''مذہب کا جوہر ایمان ہے لیکن بے منت عقل یہ وہ رہزن ہے جو دل کی دولت لوٹ لیتا ہے'' یہ عقل، عقل سلیم ہے جس کی رہنمائی میں انسان صراط مستقیم پر گامزن ہوتا ہے اور صالح عمل کرتا ہے جس کا صلہ وانعام یا اجر خود ذات باری تعالی ہے۔یہی عبدیت یا بندگی کی معراج ہے اور یہ وہ مقام ہے جس میں انسان تمام حدود وحصار اور جبر ولزوم سے ماورا ہو کر حریت مآب شخصیت کا حامل بن جاتا ہے لیکن علم وعمل اور عرفان وآگہی کے بغیر یہ ممکن نہیں۔نغمات الاسرار کی مجموعی معنوی کیفیت یہی تاثر دیتی ہے۔
جناب شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ مسند ارشاد سے فرماتے ہیں:

کھول کر چشم حقیقت بے گماں
دیکھ ہر شی میں ظہور جل شاں
ڈھونڈتا پھرتا ہے تو اس کو کہاں
جو تری ہستی کے اندر ہے نہاں
بے خبر ایک راز کی دنیا ہے تو
شان حق کی تجھ سے ہوتی ہے نمو
تیری ہستی ہے ظہور حسن ذات
تو حقیقت میں ہے روح کائنات

ذات حق کا مظہر عظیم ہونے کی وجہ سے انسان اشرف المخلوقات ہے محولہ بالا اشعار کے ذریعے اسی شرف کی تمیز کی تحریک وتلقین ہے جس سے انسان خود شناسی کی طرف مائل ہو سکتا ہے ،علامہ اقبال اس کے انتھک مبلغ رہے ہیں اسی معنوی تناظر سے ان کا یہ شعر وابستہ ہے:

آئینہ کائنات کا معنی دیر یاب تو
نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ وبو

یا اقبال کے فارسی شعر کا یہ مصرع:

تلاش خود کنی جز او نیابی

اس لحاظ سے خود بینی اور خود شناسی کا مقصد اولین وآخرین خدا شناسی ہے۔حضرت شیخ فرماتے ہیں:

کھول کر چشم حقیقت با خدا　　　دیکھ اپنے میں اسے جلوہ نما

وحدت کے بیان میں فرماتے ہیں:

گر ہے توحید خدا تو بس یہی　　　کچھ نہیں ہے اور سب کچھ ہے وہی

احدیت کا نور ہے وحدت میں گم　　　اور وحدت پردۂ کثرت میں گم

جلوہ گر خود آپ ہے جلوہ میں گم　　　پردہ اس میں اور وہ پردہ میں گم

اور **کل یوم ھو فی شان** کا مفہوم درج ذیل اشعار سے مترشح ہے:

ہر زماں اس کی نئی پوشاک ہے　　　شرکت شرک ودوئی سے پاک ہے

آمد وشد کا یہی اعلان ہے　　　ہر نفس اس کی نرالی شان ہے

اسی سلسلۂ فکر ونظر سے متعلق درج ذیل اشعار بھی ہیں:

خود ہی پردہ اور پردہ میں وہی　　　خود ہی جلوہ اور جلوہ میں وہی

از زمیں تا آسماں ہے اس کا نور　　　ذرہ ذرہ میں اسی کا ہے ظہور

جوش میں ہے اس قدر بحر وجود　　　موج دریا سے ہے دریا کی نمود

آدم خاکی میں ہے اس کا ظہور　　　ریشے ریشے میں ہے ساری اس کا نور

نور کے پردے میں پنہاں ہے وہی　　　اور اس پردے سے عریاں ہے وہی

ہر طرف ہر سمت ہے جلوہ نما　　　بس اسی کی ذات بے چون وچرا

لاموجود الا اللہ اور **اللہ کو نور السموت والارض** کے مفاہیم ان اشعار میں سمٹے ہوئے ہیں۔ یعنی یہ کائنات رنگ وبو اسی کے نور کا ظہور یا جلوہ طور کی کارفرمائی ہے اس کے سوا کوئی موجود نہیں کوئی مطلوب نہیں اور کوئی معبود نہیں۔ ذوق خودنمائی نے اسے تماشہ بنادیا اور وہی آپ اپنا تماشائی بھی بنا۔ یہ ذوق وشوق خود کو خاکی وجود میں دیکھنے کا تھا۔ اسی ذوق وشوق کی وجہ سے اس میں تخلیق فعالیت بھی ابھری اور اس نے کائنات رنگ وبو کی تخلیق کی۔ غالب فرماتے ہیں:

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں

اور اقبال کہتے ہیں:

ہنگامہ بست از پئے دیدار خاکیے
نظارہ را بہانہ تماشاے رنگ وبوست

جناب شیخ فرماتے ہیں:

خود شہود وشاہد و مشہود ہے　　　خود وجود وواجد وموجود ہے

آپ اپنی خو دنمائی کے لیے دونوں عالم میں خدائی کے لیے
خود حریم ناز سے باہر ہو ا آپ اپنے نور میں ظاہر ہوا

اسی شوق خودنمائی بقول میر:

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور
نہ ہوتی محبت نہ ہو تا ظہور

اگر غور سے دیکھیں تو محبت یا عشق تخلیقی فعالیت کا استعارہ ہے جسے اقبال نے ذوق عمل سے تعبیر کیا ہے۔اوران کے مرشد گرامی مولانا جلال الدین رومی نے جملہ علت کا طبیب مانا ہے:

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما
اے طبیب جملہ علت ہائے ما

جملہ علت میں سب سے بڑی علت حسن مطلق (وجود باری تعالی سے دوری اور مہجوری ہے۔عشق کی ساری تڑپ اس کا مقصود ومنتہا تقرب یا قربیت ہے۔شاعری کے پیرایہ بیان میں یہی وصال کی آرزو ہے جو ہجر کے غم کا لازمی نتیجہ ہے۔ہماری متصوفانہ شعری روایت میں لفظ عشق نہایت ہی وسیع معنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے۔نغمات الاسرار کے درج ذیل اشعار سے بھی عشق کی معنوی وسعت،تنوع،رنگارنگی اور بوقلمونی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

حاصل راز خدائی عشق ہے اور سر مصطفائی عشق ہے
باعث تخلیق عالم عشق ہے پیکر آدم مجسم عشق ہے
حضرت حق کی امانت عشق ہے روح آدم کی حقیقت عشق ہے
عشق ہے اسرار حق کا رازداں عشق ہے مقصود حرف کن فکاں
عشق ہے نور ظہور حسن ذات عشق ہے تکمیل روح کائنات
عشق عینیت شہادت قربیت ذات حق میں عین حق کی محویت
عشق کے قطرے میں ہے دریا نہاں عشق کے ذرے میں ہے صحرا نہاں
ذرہ ذرہ عشق سے سرشار ہے جملہ عالم عشق کا اظہار ہے

عشق کی فلسفیانہ تاویل اگر کی جائے اور میں نے اقبال کے نظریہ عشق کے حوالے سے کی بھی ہے تو کہہ سکتے ہیں کہ:

"عشق حیات کی وہ قوت محرکہ ہے جو ذرات کے نظام کو ایک نیوکولیس Nucleus کے تحت باندھے رہتی ہے۔ذرات اپنے مرکز سے ایک معین دوری پر برقرار رہتے ہیں؛ کیونکہ اس دوری کے ٹوٹنے سے ذرات کا نظام بگڑ جاتا ہے اوران کا وجود "لا" کے

دھماکے سے چور ہو جاتا ہے۔ جو توانائی انہیں اپنے مرکز سے ایک دوری پر قائم رکھتی ہے وہ خود بھی حائل توانائی ہے جو ذرے کے تعین کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے مرکز سے بھاگنے نہیں دیتی اور یہی حسن ہے لیکن حسن و عشق کا یہ بیان اس جمالیاتی کیف سے محروم ہے جو حسن و عشق کے شاعرانہ، متغز لانہ یا ادبی بیان میں پایا جاتا ہے۔ بیان کی لذت کے لیے اور ترسیل میں شدت تاثیر لانے کے لیے نظام واقعات میں پائے جا نے والے قوانین کا دلکش اظہار فی الحقیقت شاعری کا مقصود ہے''

میں سمجھتا ہوں کہ حقائق و معارف کے بیان میں دلکشی پیدا کرنے کے لیے نغمات الاسرار کو شاعرانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے ۔مولانا جلال الدین رومی کے پیش نظر بھی یہی مسئلہ تھا ۔جس کا اظہار انہوں نے اس طرح کیا:

از ہم آں کہ ملول نہ شوند شعر می گویم
واللہ کے مومن ازشعر بیزارم

اور مولانا کے مرید ہندی اقبال نے بھی مرشد گرامی کی پیروی میں یہی کہا:

نہ زباں کوئی غزل کی نہ زباں سے باخبر میں
کوئی دلکشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی

شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ صاحب نے بھی الہیاتی تفکر کی شاعرانہ ترسیل کے لیے اس روایت سے خود کو وابستہ رکھا ہے اور فکر ونظر کے بحر بے کراں کو کوزے میں بند کرنے کا کارنامہ بطور احسن انجام دیا ہے۔

○○○

مکتوبات

○ **مفتی مطیع الرحمٰن مضطر رضوی** (بانی و سربراہ: جامعہ نوریہ، شیام پور، اتر دیناج پور، بنگال)

عزیز مکرم مولانا مجیب الرحمن صاحب علیمی! سلام و رحمت!! یہ جان کر مسرت ہوئی کہ آپ اور آپ کے رفقائے کار نے حضرت داعیِ اسلام کی سرپرستی میں تصوف کی علمی خدمت کرتے ہوئے پہلی دہائی کا دو تہائی حصہ پورا کر لیا اور اب ۱۰؍جنوری ۲۰۱۷ء کو سالنامہ الاحسان کا ساتواں شمارہ پریس جا رہا ہے۔

عزیزِ محترم! علمِ کلام جس کا زیادہ تر تعلق الفاظ ہی سے ہے اس کے تعلق سے علامہ ابن حجر ہیتمی فرماتے ہیں: **علی الولاۃ منع من یشھر علم الکلام بین العامۃ لقصور افھامھم عنہ و لانہ یؤدی بھم الی الزیغ و الضلال**۔ والیانِ ملک پر لازم ہے کہ عام لوگوں کے درمیان علمِ کلام کی تشہیر سے قانونی روک لگا دیں؛ کیوں کہ وہ بے چارے سمجھ نہیں پائیں گے تو ان کے لیے گمرہی و بے دینی کا باعث ہو جائے گا۔ تو احسان و تصوف جو الفاظ سے نہیں، سراسر معنیٰ سے عبارت ہے اور جس کا تعلق علم و قال سے نہیں، عمل و حال سے ہے۔ متأخرین نے زمانے کی رعایت کرتے ہوئے خاص لوگوں میں دل چسپی پیدا کرنے اور ان کو اس کی طرف مائل کرنے کے لیے تحریر کی قبا مستعار لی، تو ہم جیسوں سے صاف فرما دیا: **یحرم النظر فی کتبنا**۔ غیر محرمانِ راز سے ہماری تحریریں پوشیدہ رکھی جائیں۔ ہزار ضرورت کے باوجود آج کے ایک طرف سطحی تعقل پسند و مذہب بیزار تو دوسری طرف تعصب پرست زمانے میں، اس کی عام اشاعت کس قدر دور اندیشی و احتیاط پسندی کی متقاضی ہے، آپ حضرات نے اس کا خاص خیال ضرور ملحوظ رکھا ہوگا۔ یہ ایک اجمالی اشارہ ہے، تفصیل عند الملاقات، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

حضرت داعیِ اسلام اور احباب سے سلام و تحیت اور دعا کی درخواست کے ساتھ۔

○ **سید ضیاء الدین رحمانی** (جدہ)

ذو العلم و الفضل مولانا حسن سعید صفوی! **بارک اللہ فی حیاتکم و حسناتکم**۔

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔ اللہ کرے مزاج گرامی ہم دوش صحت و عافیت ہو۔

''الاحسان'' کا چھٹا شمارہ وارانسی ایر پورٹ پر ۹؍فروری ۲۰۱۶ء کو آپ سے موصول ہوا۔ میری والدہ مرحومہ کا اسی روز ممبئی میں بعد نماز فجر انتقال ہو گیا تھا اور مجھے مرحومہ کی آخری تدفین و نماز جنازہ میں شریک ہونا تھا۔ شدید رنج و غم کی کیفیت تھی۔ اللہ عز و جل کے فضل و کرم سے عاجز نماز عصر سے پہلے ممبئی گھر پہنچ گیا اور بعد نماز مغرب نماز جنازہ مرحومہ کی پڑھائی۔ اللہ عز و جل ان کو غریق رحمت کرے۔ (آمین)

یہ بات ضمناً نوک قلم پر آ گئی اور عاجز نے مرحومہ کی تاریخ انتقال کو محفوظ کرنے اور قارئین کی دعائے مغفرت کی نیت سے اس کا ذکر کر دیا ہے۔

''الاحسان'' کے علمی کارواں کی، رفیق قدیم مخدومی ومحبوبی داعی اسلام شیخ ابوسعید صفوی دامت برکاتہم نے اپنے خون جگر سے تشکیل وتربیت فرمائی ہے اور ماشاءاللہ یہ مجلہ حضرت والا کے زیر سرپرستی مستقل ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ مجھے ان سطور کو لکھنے میں کافی تاخیر ہوگئی ہے۔ اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ عاجز نہایت اختصار کے ساتھ اپنی حقیر رائے پیش کرے گا۔

سب سے پہلے اپنے مضمون ''حضرت عین اللہ شاہ: شخصیت اور تعلیم'' جو اس شمارہ میں چھپا ہے، اس میں آپ نے دو علمی تسامحات کا ذکر کیا ہے۔ اس کا تشکر کے ساتھ اعتراف ہے۔ مضمون میں کچھ طباعت کی بھی غلطیاں ہیں، اس کی تصحیح اتنی ضروری نہیں۔ جتنی حقائق کی اصلاح ضروری ہے، جو مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) صفحہ ۱۸۵ پر: حضرت مخدوم الملۃ شیخ عبدالصمد عرف مخدوم شاہ صفی قدس اللہ سرہ (۱۹/ محرم ۹۴۵ھ) جن کا مزار مبارک صفی پور، اناؤ، یوپی میں مرجع خلائق ہے، سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کی صفویہ شاخ کے بانی ہیں۔ اس کا اضافہ قارئین کر لیں۔

(۲) آپ سے حضرت مخدوم محمد عین اللہ شاہ عرف خلیل میاں کی تاریخ وصال ۱۳/ربیع الثانی ۱۳۴۰ھ/ ۱۳ دسمبر ۱۹۲۱ء معلوم ہوئی۔ لہٰذا قارئین ولادت کے پیراگراف میں: حضرت بابا صاحب نے اس عاجز سے ارشاد فرمایا تھا کہ۔۔۔۔۔۔ اور ارشاد فرمایا کہ نومولود کا نام میرے نام پر عین اللہ شاہ رکھنا اور خود مختصر عرصہ کے بعد وصال کر گئے۔ یہ پورا حصہ حذف کر دیں۔ اس کی تطبیق کی کوئی شکل نہیں۔ صرف یہ ممکن ہے کہ حضرت خلیل میاں صاحب نے اپنی حیات ظاہری میں حضرت پیر محمد احسان علی عرف کملی شاہ کو اپنے مکشوف کی بنیاد پر بیٹے کی بشارت کے ساتھ ساتھ اپنا نام ''عین اللہ شاہ'' عطا فرمایا۔ جس کی روایت عاجز تک صحیح نہیں پہنچی۔ حضرت بابا عین اللہ کی پیدائش یکم اگست ۱۹۲۸ء/ ۱۳ صفر ۱۳۴۸ھ۔ ہے۔

(۳) صفحہ ۱۸۷ پر عاجز نے ''انوار احسانیہ'' جو حضرت پیر سید احسان علی عرف کملی شاہ بابا کی سوانح حیات ہے، کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت کملی شاہ کے والد ماجد حضرت سید معصوم علی کو حضرت مخدوم عالم شاہ خادم صفی محمدی قدس سرہ نے خرقہ و اجازت خلافت سے سرفراز کیا تھا۔ واضح رہے کہ حضرت مخدوم خادم صفی محمدی قدس سرہ کے ۴۲ خلفا کی فہرست جو حضرت عزیز اللہ شاہ صفوی نے ''مخزن الولایت'' میں مع مختصر حالات درج کی ہے، اس میں حضرت سید معصوم علی کا نام نہیں ہے، اس لیے محل نظر ہے۔

اپنے مضمون کے سلسلے میں بات مکمل ہوئی۔ اب مجلّے کے سلسلے میں مختصراً عرض کرتا ہوں۔

اس مجلہ کا انتساب حضرت محدث جلیل مخدوم المشائخ امام حضرت شیخ نجم الدین کبریٰ رحمہ

اللہ ورضی عنہ کے نام ہے۔ عاجز کا تعلق سلسلۂ مجددیہ سے ہے۔ حضرت امام ربانی مجدد و منور الف ثانی شیخ احمد سرہندی قدس سرہ کو سلاسل مبارکہ سبعہ میں اجازت بیعت حاصل تھی۔ (۱) سلسلۂ نقشبندیہ (۲) سلسلۂ قادریہ (۳) سلسلۂ چشتیہ صابریہ و چشتیہ نظامیہ (۴) سلسلۂ سہروردیہ (۵) سلسلۂ کبرویہ (۶) سلسلۂ مداریہ (۷) سلسلۂ قلندریہ۔

سلسلۂ کبرویہ کی نسبت حضرت شیخ نجم الدین کبریٰ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف ہے۔ ہاں! سلسلۂ شطاریہ کی بیعت و اجازت بعض وجوہ سے متروک ہے، جس کی تفصیل کے لیے ''حضرت مجدد اور ان کے ناقدین'' مؤلفہ حضرت مولانا شاہ ابوالحسن زید فاروقی مجددی طابع و ناشر حضرت شاہ ابوالخیر اکاڈمی، دہلی، دیکھیں۔ مجلہ میں حضرت شیخ نجم الدین کبریٰ کا گوشہ حضرت کی تعلیمات کا آئینہ ہے، خصوصاً منہاج السالکین و معراج الطالبین کا اردو ترجمہ حماد رضا مصباحی نے بہت عرق ریزی سے کیا ہے۔ مولانا ضیاء الرحمن علیمی کا تحقیقی مضمون ''حضرت نجم الدین کبریٰ کی تصنیفات: ایک تعارف'' بہت پسند آیا۔ دیگر مضامین بھی اس گوشہ کے بہت اچھے ہیں اور عاجز کے لیے سند (Reference) کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ابتدائیہ میں حسب سابق عزیز القدر مولانا ذیشان احمد مصباحی نے مجلہ کے تمام مشمولات پر تبصرہ اور احاطہ کیا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر الطاف اعظمی جیسے منکر تصوف کا طویل تنقیدی مکتوب کا مجلہ میں چھپنا، ''الاحسان'' کے اس دعویٰ کو جواز فراہم کرتا ہے کہ ''یہاں موافقین و مخالفین کھل کر مگر شائستگی کے ساتھ اپنی بات کہہ سکیں تا کہ تصوف کے حوالے سے جو غلط فہمیاں راہ پا گئی ہیں، ان کا علمی انداز میں ازالہ ہو، تصوف کے حوالے سے لوگوں کا ذہن صاف ہو اور اس کے بعد عملی تصوف کی راہ کھل سکے۔'' (الاحسان، شمارہ:۱) مولانا ذیشان کا مختصر تبصرہ اس مکتوب پر بہت جامع ہے۔

عاجز مسئلۂ علم غیب پر مولانا ذیشان کے موقف کی پوری تائید کرتا ہے۔ ''علم غیب پر سارا اختلاف و نزاع لفظی ہے۔ اس میں شدت کم فہمی اور عدم تطبیق سے پیدا ہوتی ہے۔'' یہ مسئلہ جب عوام میں آتا ہے تو زیادہ سنگین ہو جاتا ہے۔ خواص کی حد تک رہے تو اتنا سنگین نہیں رہتا۔

پروفیسر الطاف احمد اعظمی نے ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی کے مضمون میں جن تاریخی غلطیوں کا ذکر کیا ہے وہ درست ہیں۔ عاجز اس مضمون کی حد تک پروفیسر الطاف احمد اعظمی کی اس رائے سے اتفاق کرتا ہے کہ ''وہ نہ محقق ہیں اور نہ ہی مورخ، بلکہ محض انشا پرداز ہیں۔''

''صوفی ادب'' جو کہ برادر عزیز داعی اسلام کی مثنوی نغمات الاسرار فی مقامات الابرار پر ہے، انتہائی دل کش ہے۔ اس گوشہ کے سارے مضامین بہت اچھے ہیں اور عاجز پیشتر اکثر مضامین کا مطالعہ کر چکا تھا۔ مخدومی ڈاکٹر مسعود انور علوی کا جامع تبصرہ بہت پسند آیا۔ عاجز ان کی رائے سے اتفاق

کرتا ہے کہ ’’یہ مثنوی ارباب تصوف کے یہاں پذیرائی حاصل کرے گی اور مشعل راہ ثابت ہوگی۔‘‘

’’بحث ونظر‘‘ کے کالم میں مولانا غلام مصطفیٰ ازہری کا مضمون ’’بیعت وارادت کے مفہوم پر ایک تحقیقی نظر‘‘ بہت وقیع ہے۔ مولانا ذیشان مصباحی کا مضمون ’’سماع مزامیر پر چند اہم کتابیں :توضیحی کتابیات‘‘ اتنا جامع ہے کہ اصل کتاب کا ،جس کا یہ ایک باب ہے،شدت سے انتظار ہے۔

آخر میں عاجز ان تمام اہل علم کا شکر گذار ہے جن کی نگارشات نے الاحسان کے حالیہ شمارے کو وقیع اور قابل احترام بنایا ہے۔ اس کے مدیر اعلیٰ برادرزادہ مولانا حسن سعید صفوی ازہری ،شریک مرتبین مولانا ضیاء الرحمن علیمی ،مولانا مجیب الرحمن علیمی اور مولانا رفعت رضا نوری اور شاہ صفی اکیڈمی کی پوری ٹیم ،جن کے قلمی تعاون سے یہ شمارہ تیار ہوا ہے،تبریک وتہنیت کے مستحق ہیں کہ اس نازک دور میں تصوف پر اتنا عمدہ مجلہ کامیابی کے ساتھ نکل رہا ہے۔ عاجز دل کی گہرائیوں سے اس کے استمرار کے لیے دعا گو ہے۔

حضرت داعی اسلام دامت برکاتہم کی خدمت سامی میں اور الاحسان کی پوری ٹیم کی خدمت میں مؤدبانہ سلام عرض ہے۔ زیادہ حد ادب!

○ **مولانا سید تنویر ہاشمی** (بانی وسربراہ: جامعہ ہاشمیہ، بیجاپور، کرناٹک)

الاحسان اسم بامسمی ہے۔ گرامی قدر حضرت مولانا مجیب الرحمں علیمی صاحب۔ السلام علیکم

یہ جان کر از حد مسرت ہوئی کہ الاحسان ۲۰۱۷ء منظرِ عام پر آنے والا ہے۔ بلا شبہ الاحسان دورِ حاضر میں تعلیماتِ صوفیہ کا نقیب وترجمان ہے۔ داعیِ اسلام حضرت شیخ ابوسعید احسان اللہ محمدی صفوی دامت برکاتہم کی سرپرستی میں الاحسان کے مندرجات، مضامین قابلِ دید اور لائقِ تقلید ہوتے ہیں۔ میں اور میرے والد بزرگوار اور خانقاہِ ہاشمی کے دیگر افراد الاحسان کا مطالعہ کرتے ہیں اور خوب مستفیض ہوتے ہیں۔ اس دور پر آشوب میں نام نہاد شیوخِ طریقت کی بے راہ روی سے اربابِ علم ودانش خصوصًا اور امت کا ایک بڑا طبقہ عمومًا تصوف سے بیزار اور دوری اختیار کیے ہوا ہے۔ البتہ ایسے حالات میں امتِ مسلمہ کی صحیح رہبری اور رہنمائی کی ضرورت ہے، جو الحمد للہ الاحسان ایک حد تک پوری کر رہا ہے۔ یقینا الاحسان اسم بامسمیٰ ہے۔

اللہ تعالیٰ الاحسان کے فیوض وبرکات کو دوام عطا فرمائے۔ میری جانب سے اور خانقاہِ ہاشمی کے جملہ افراد کی جانب سے الاحسان کی اشاعت پر ہدیۂ تبریک پیش ہے۔

○ **پروفیسر الطاف احمد اعظمی** (تغلق آباد، نئی دہلی)

۳۱ر اکتوبر کو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کی ایک علمی تقریب میں جناب ذیشان احمد مصباحی سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے ازراہ نوازش مجھے ’’الاحسان‘‘ کا تازہ شمارہ (فروری ۲۰۱۶ء)

عنایت کیا۔ میں بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے میرے طویل مکتوب کو جوں کا توں شائع کر دیا، جو آپ کی وسیع النظری اور فراخ دلی کا بین ثبوت ہے۔

اس وقت یہ شمارہ میرے زیر مطالعہ ہے۔ اس کے ''ابتدائیہ'' کو جسے جناب ذیشان احمد نے لکھا ہے اور اچھا لکھا ہے، غور سے پڑھا۔ اس کے آخر میں موصوف نے راقم الحروف کے مکتوب کا ذکر کیا ہے اور اس پر تنقیدی نظر بھی ڈالی ہے۔ لیکن انبیا اور اولیا کے علم غیب اور ان کے صاحب تصرف ہونے کے متعلق ان کے فرمودات کو پڑھ کر حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی۔ حیرت تو اس لیے کہ عالم ہونے کے باوجود وہ کتمانِ حق کے مرتکب ہوئے ہیں اور افسوس اس لیے کہ بعض استثنائی تاریخی واقعات سے متعلق میری وضاحت کو انہوں نے یک سطری اقتباس بنا کر مغالطہ انگیزی کرنے کی کوشش کی ہے، جو علمی دیانت کے منافی ہے۔

میں نے اپنے مکتوب میں لکھا تھا کہ کیا وجہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر رسول کو تو علم غیب حاصل نہ تھا لیکن خضر علیہ السلام کو ایک درجہ میں اس نوع کا علم حاصل تھا؟ اسی طرح سلیمان علیہ السلام جیسے ذی مرتبت نبی اور عظیم الشان بادشاہ کو اللہ کی طرف سے کئی طرح کی قوت و اختیار حاصل ہونے کے باوجود یہ قدرت حاصل نہ تھی کہ وہ بذات خود ملکۂ سبا کا تخت شاہی آن واحد میں اٹھالاتے لیکن ان کے ایک مقرب درباری کو ''علم الکتاب'' کی شکل میں یہ قدرت حاصل تھی۔ ایسا کیوں؟ میں نے اسی پس منظر میں لکھا تھا کہ یہ استثنائی واقعات ہیں، ان سے غیر خدا کے علم غیب اور تصرف پر استدلال کرنا صحیح نہ ہوگا۔

لیکن جناب ذیشان احمد نے نہ تو مذکورہ سوال کا جواب دیا اور نہ ہی اس سوال کا جو جواب میں نے دیا تھا اس کا ذکر کیا اور اس اغماض کے بعد انہوں نے ایک ایسی بات لکھی جس کی ان سے توقع نہیں تھی۔ وہ فرماتے ہیں ''حضرت خضر کی ولایت مسلم اور نبوت مختلف فیہ ہے، بہرکیف! اگر ان کے لیے علم غیب کا ثبوت استثنائی طور پر ہی سہی جائز ہو تو یہ استثنا پیغمبر آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی امت کے اولیا کے لیے ناجائز بلکہ شرک کیوں ہوگا؟ بطور خاص جب ایسی آیتیں موجود ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے غیب پر مطلع فرما دیتا ہے۔ (الاحسان، ص ۱۷)

یہ بدترین مغالطہ انگیزی ہے۔ اللہ کا اپنے رسولوں کو غیب پر مطلع فرمانا اور ان کا بالذات عالم الغیب ہونا، دو مختلف چیز ہیں۔ پہلی چیز کار رسالت کی انجام دہی کے لیے تقریباً جملہ رسولوں کو حاصل تھی اور ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس وصف سے بخوبی بہرہ ور تھے۔ لیکن بالذات عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ ہے، اس کے سوا کسی کو بھی اس طرح کا علم حاصل نہیں ہے، جیسا کہ قرآن مجید

میں بہ تکرار فرمایا گیا ہے۔سورۂ اعراف کی آیت ۱۸۸ میں اس نوع کے علم کا ذکر ہوا ہے۔پیغمبر آخر الزماں نے خود اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرمایا ہے کہ ’’میں نہ تو علم غیب رکھتا ہوں اور نہ ہی صاحب تصرف ہوں، صاحب تصرف ہونا تو درکنار میں تو اپنی ذات کے نفع ونقصان کا بھی مالک نہیں۔‘‘

اس ارشاد نبوی کے باوجود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور امت کے اولیا کے عالم الغیب اور متصرف ہونے کا اقرار واعلان جیسا کہ ذیشان احمد مصباحی کے مذکورہ بالا قول سے بالکل واضح ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید دونوں کی تردید وتکذیب کے مترادف ہے۔اللہ تعالیٰ ہم سب مسلمانوں کو نفس اور شیطان کے فتنوں سے اپنی امان میں رکھے۔(آمین)۔

اس وعدے کے مطابق جو میں نے دہلی میں جناب ذیشان احمد سے کیا تھا، اپنا مضمون ’’بیعت وارادت: قرآن مجید اور احادیث وآثار کی روشنی میں‘‘ الاحسان میں اشاعت کے لیے بھیج رہا ہوں۔ مجھے قوی امید ہے کہ میرے مکتوب کی طرح یہ مضمون بھی شائع کر دیا جائے گا، تا کہ میں اپنے ذی علم دوستوں سے کہہ سکوں کہ دوسرے دینی اداروں کے برعکس اس علمی و دینی ادارے میں روحانیت کی شمع گو لو مدھم ہی سہی، جل رہی ہے۔

○ **مولانا سیف الدین اصدق** (آستانہ چشتی چمن، پیر بیگھہ شریف، نالندہ (بہار)

حدیث جبریل کے مطابق تصوف دین کے تین اجزا میں سے ایک جزو ہے جسے اگر جزو اعظم کہا جائے تو یقیناً مبالغہ نہ ہوگا؛

کیوں کہ کسی بھی چیز کا ہونا الگ بات ہے مگر اس چیز کا حسین ہونا یہ ایک الگ چیز ہے ظاہر ہے کوئی چیز اس وقت تک اپنے کمال کو نہیں پہنچتی جب تک کہ اس میں حسن نہ پیدا ہو جائے۔

تصوف یا احسان کو جزو اعظم کی حیثیت اس لیے حاصل ہے کہ یہ جزو ماقبل والے دونوں اجزا کو حسین بنا دیتا ہے بایں طور کہ اسلام جو کہ ظاہری اعمال سے متعلق ہے اور ایمان جس کو قلب اور باطن سے تعلق ہے یہ دونوں ہی بنا حضوری کے محض ایک ’’وجود‘‘ ہیں اور جیسے ہی احسان’’ ان تعبد اللہ کانک تراہ وان لم تکن تراہ فانہ یراک کے ذریعہ انہیں حضوریٔ ربانی مل جاتی ہے تو یہ اب ’’حسین وجود‘‘ میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور بازار میں اچھی قیمت صرف چیز کی نہیں ملتی بلکہ حسین چیز کی ملتی ہے شاید اسی لیے اس جزو اعظم کی تعبیر حدیث میں لفظ احسان سے کی گئی ہے جس کے معنیٰ حسن پیدا کرنے کے ہوتے ہیں۔

بہر کیف! تصوف جس کا دوسرا نام احسان ہے، یہ روح کو غذا فراہم کرانے کا ایک انوکھا ذریعہ ہے کہ انسان اس کے واسطے سے نفس مطمئنہ کا مالک ہو جاتا ہے اور رب کے بندوں میں شامل ہو کر رضائے الٰہی کے باغوں میں سیر کرنے کا مستحق بن جاتا ہے اور اطمینان نفس اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ روح آسودہ نہ ہو جائے۔

تصوف پر بہت کچھ لکھا گیا اور کہا گیا گزشتہ صدیوں میں اسے بدنام کرنے والے بھی پیدا ہوئے اور آہ سحر گاہی سے کاروان تصوف کو آگے بڑھانے والے بھی ہوئے مگر درمیان میں ایک دور ایسا بھی آیا کہ تصوف کے متعلق لوگوں کے بیچ نفرت پیدا کرنے کی کوششیں کی گئیں، کچھ لوگ واقعی تصوف سے بیزار بھی ہوئے اس کی وجہ خواہ نام نہاد صوفیہ کی جماعت رہی ہو یا خود بیزار رہنے والوں کا اندرونی بخار جس کی وجہ سے وہ کبھی قریب سے تصوف کو سمجھنے کی کوشش بھی نہ کر سکے لیکن صرف یہ کہہ کر کہ" جو لوگ تصوف بیزار ہیں گمراہ ہیں، یا تصوف جہلا اور نام نہاد صوفیوں کی وجہ سے بدنام ہے" اہل علم اور اصل خادمین صوفیہ خاموش نہیں رہ سکتے تھے اور نہ یہ ان کی شان تھی یہی وجہ ہے کہ بہت سے اہل دل نے اپنے اپنے طور پر اور اپنے اپنے دور میں نہ صرف یہ کہ تصوف و احسان کے حوالے سے اپنی بے لوث خدمات پیش کیں بلکہ ہر دور میں تصوف اور صاحبان تصوف پر ہونے والے اعتراض کا جواب بھی دیا موجودہ عہد میں" الاحسان" بلاشبہ اسی خدمت تصوف کی راہ پہ گامزن ہے اور نہایت ہی احسن طریقے سے وہ اس خدمت کو انجام بھی دے رہا ہے آج علم و تحقیق کا دور ہے، آپ اپنی کوئی بات کسی زور بیانی، دھونس اور ملمع سازی کے ذریعہ نہیں منوا سکتے، الاحسان کی سب سے بڑی خوبی یہی رہی ہے کہ اس نے علمی طریقۂ کار کو اس مضبوطی سے اپنایا ہے کہ فراخ دل اور حقیقت پسند مخالفین بھی اس کی داد دینے پر مجبور ہیں۔

میں صاحب سجادہ داعی اسلام حضرت شاہ ابوسعید صفوی زید مجدہ کو دل کی اتھاہ گہرایوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ اس کار عظیم کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کا انتخاب فرمایا۔ آپ الاحسان، خضر راہ اور دیگر کتب تصوف کے ذریعہ جہاں قال اور تصوف کی طرف زمانے کو مائل فرما رہے ہیں وہیں جامعہ وخانقاہ کے ذریعہ نئی نسل کو شراب تصوف پلا کر ان کا حال بدلنے میں شب و روز کوشاں ہیں حضرت والا نے نوجوان فضلا کی جو پاکیزہ جماعت تیار کی ہے، اسے دیکھ کر طبیعت عش عش کر اٹھتی ہے ہم جیسے طالب علموں اور کچھ کر گذرنے کا جذبہ رکھنے والوں کے لیے بلاشبہ آپ ایک آئیڈیل کی حیثیت رکھتے ہیں اس وقت پورے ملک کے صاحبان خانقاہ، ارباب علم وفضل اور تصوف دوست حضرات کی توجہ، امیدیں اور دعائیں آپ کی طرف مرکوز ہیں میں شاہ صفی اکیڈمی کے جملہ ارکان کو بھی خانوادہ اصدقیہ، اپنی خانقاہ اور تحریک پیغام اسلام کی جانب سے صمیم قلب کے ساتھ مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ حضرت والا کے دست و بازو بن کر اتنے عظیم مشن کو آگے بڑھانے کا آپ کو موقعہ ملا اللہ جل شانہ اپنے حبیب علیہ السلام اور صوفیہ کرام و بزرگان دین کے صدقہ و طفیل آپ سب کی کاوشوں کو قبول فرمائے اور جام بادہ وسبو کا یہ دور یوں ہی چلتا رہے۔ع ---- آباد رہے ساقی دائم ترا مے خانہ۔

○ **ڈاکٹر نوشاد عالم چشتی علیگ** (علی گڑھ)

بخدمت، عالی جناب مدیر مجلہ الاحسان، خانقاہ عارفیہ، سید سراواں۔ محبِ گرامی مجیب الرحمٰن علیمی صاحب سے یہ اطلاع ملی ہے کہ سال نامہ مجلہ الاحسان کا تازہ شمارہ بہت جلد ہی منظرِ عام پر آنے والا ہے۔ اس مسرت بخش خبر نے دل کو سرور بخشا اور آپ کی جناب میں چند سطور لکھنے کے لیے ذہن کو مائل کیا۔

اللہ عز وجل ورسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بے حد احسان اور سراپا کرم ہے کہ سال نامہ مجلہ الاحسان کا ساتواں شمارہ اب نکلنے جا رہا ہے، اس سے قبل چھ شمارے اردو میں اور غالباً دو شمارے عربی میں نکل چکے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اب تک کے تمام شمارے اردو اور عربی میں جو منظرِ عام پر آئے ہیں وہ انتہائی معیاری اور تحقیقی ہیں۔ موضوع بندی، ترتیب اور سلیقہ مندی کے ساتھ ان تمام شماروں کا تحقیقی معیار انتہائی بلند اور علمی ہے۔ عصرِ حاضر میں تصوف کے موضوع پر پورے ہند و پاک میں مجلہ الاحسان اپنی انفرادیت میں کوئی ثانی نہیں رکھتا۔ اب تک کے وہ تمام شمارے جو میری نظر سے گذرے ہیں ان کے مطالعے کے بعد میں یہ بات بالکل شرحِ صدر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ الاحسان تصوف سے دلچسپی رکھنے والے اصحابِ علم وفکر کے دلوں کی دھڑکن بن چکا ہے جو ایک شمارے کے بعد دوسرے شمارے کے لیے انتظار کرتے رہتے ہیں۔

آج کے اس دور میں جب کہ لوگ مادیت سے پریشان ہو چکے ہیں ان کے دلوں پر روحانیت کی دستک دینے والا یہ مجلہ خانقاہِ عارفیہ کے ترجمان کی حیثیت سے اپنا انمٹ چھاپ چھوڑ چکا ہے۔

میں بے حد شکر گذار ہوں خانقاہِ عارفیہ کے ہر دل عزیز سجادہ نشین گلِ گلزارِ چشتیت داعیِ اسلام مخدومِ گرامی حضرت ابوسعید چشتی صفوی عارفی مدظلہ العالی کا کہ انھوں نے اس معیاری اور علمی مجلہ کی سرپرستی فرما کر تشنگانِ علومِ تصوف کو سیرابی کے لیے بہت حسین موقع فراہم کیا ہے۔ اسی کے ساتھ مجلہ کے مدیر اور ان کے رفقا بھی قابلِ ستائش ہیں کہ انتہائی محنت اور کاوش سے مجلہ نکال کر ہم سبھی کی علمی پیاس کو بجھانے کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ داعیِ اسلام، خانقاہِ عارفیہ اور مدیران کے رفقا کو اپنے حفظ وامان میں رکھے، تاکہ یہ علمی سلسلہ تادیر جاری وساری رہے۔ ع

دل نے آنکھوں سے اور آنکھوں نے ان سے کہہ دی
بات چل نکلی ہے اب دیکھو کہاں تک پہنچے

○ **مفتی آفتاب مصباحی** (پرنسپل: جامعہ ہاشم پیر، بیجاپور، کرناٹک)

کہا جاتا ہے یہ دور تصوف کے احیاءِ نو کا دور ہے اور یہ کچھ غلط بھی نہیں ہے۔ مگر شائع ہونے والے اکثر کتب ورسائل اور مجلّات وغیرہ پر بے طرح کی روایت پرستی چھائی ہوئی ہے۔ وہ

تو ہم اردو والوں پر آپ کا ہی احسان ہے کہ آج کے اس دھندلی اور گرد آلود فضا میں کچھ حقیقی اور سچی تصویریں نظر آئی ہیں جس سے دامن کش نگاہ رہنا تحسین ناشناسی ہی کہلائے گی۔

راقم الحروف تو اول شمارے ہی سے اس کا قاری رہا ہے۔ سچ پوچھیے تو اس کا ہر آنے والا شمارہ اس انداز سے منصۂ شہود پر آتا ہے کہ **کل یوم هو فی شأن** کا مظہر اتم ہوتا ہے۔ گذشتہ سے لے کر موجودہ سارے شماروں پر نظر ڈالیے کتنی جدت ہے، کتنا نیا پن ہے، کتنی ندرت ہے۔ وہ شخصیات جن پر لکھنا تو دور جن کا نام لینا بھی حلقۂ یاراں میں مکروہ سمجھا جاتا رہا ہے ان پر آپ نے لکھوایا اور خوب لکھوایا، چھاپا اور خوب چھاپا۔ پھر اتنے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنی خانقاہ کی چہار دیواری سے باہر نکل کر ان خانقاہوں کا بھی بھرپور تعارف پیش کیا جن کے در کی گدائی نے ہزاروں کو کندن بنا دیا۔ خانقاہ عالیہ نظامیہ صفی پور، خانقاہ کاظمیہ قلندریہ کاکوری، خانقاہ عالیہ رشیدیہ جون پور اور خانقاہ ہاشمیہ شطاریہ بیجاپور۔ ہمیں امید ہے کہ خانقاہ عالیہ عارفیہ سید سراواں سے آپ نے جو شمع روشن کی ہے اس کی روشنی میں ہم نہ صرف ہند و حوالیٔ ہند بلکہ دنیا بھر کی مقتدر خانقاہوں کے علمی و روحانی کمالات دیکھ پائیں گے۔ ان شاء اللہ!

یہاں ایک بات کہے بغیر نہیں رہا جاتا وہ یہ کہ اردو والوں کے یہاں ایک اچھی چیز یہ بھی پائی جاتی ہے کہ جب وہ کسی ادیب کا تعارف پیش کرتے ہیں تو ان کی کتابوں کے ساتھ ان پر لکھا گیا جملہ کتابوں (بصورت استقرائی) کا اشاریہ بشمول مصنف/ مرتب، مطبع اور سنہ اشاعت درج کر دیتے ہیں جس کی روشنی میں ایک باذوق قاری ان کی حیات وخدمات کے جملہ اطراف واکناف و جہات سے مکمل واقف ہو جاتا ہے۔ یہ چیز ابھی تک ارباب تصوف کے یہاں دیکھنے کو نہیں ملی۔ ہماری دلی خواہش ہے کہ یہ جدت طرازی بھی آپ کے کارناموں کی زینت بنے۔ آپ سے ہماری یہ خواہش بجا بھی ہے کہ برصغیر ہند و پاک سے تصوف اور صوفی ادب پہ نکلنے والے معدود چند مجلّات ورسائل میں مواد، پیش کش اور وسعت موضوعات میں جو منفرد مقام آپ کے مؤقر، مستند اور معتبر مجلہ کو حاصل ہے وہ کسی دوسرے کو میسر نہیں۔ اس لیے یہ کام بھی آپ ہی کے یہاں سے ہونا چاہیے، امید کہ آپ ضرور توجہ فرمائیں گے۔

آپ کی کاوشوں کا یہ چھٹا شمارہ اپنے تمام تر اسباب کشش کے ساتھ اس وقت میرے پیش نظر ہے، حصار مناجات وغزل سے باہر ابتدائیہ کی مندرجہ ذیل سطور میں مولانا ذیشان احمد مصباحی ''مذہبی فساد کل'' کے سبب اصلی کی بڑی خوبصورت وضاحت کی ہے۔ لکھتے ہیں:

''زمینی حقیقت یہ ہے کہ ہم سب نے دنیا جہان کی ساری ذمہ داریاں تو اٹھا رکھی ہیں لیکن دین کا جو بنیادی کام تھا، اس سے غافل ہیں۔ آج مسلمانوں میں جو فساد عام

برپا ہے اس کی بنیادی وجہ علمائے دین اور قائدین امت کی اس بنیادی سبق سے غفلت ہے۔''

مزید آگے لکھتے ہیں:

''اہل نظر پر یہ حقیقت منکشف ہے کہ صوفیہ نے جو خانقاہی نظام وضع کیا تھا، اس کا مطلوب تزکیۂ نفس تھا، وہ نظام مطلوب نہیں تھا۔''

پھر آگے داعی اسلام کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں:

''مطلوب خدا است نہ کہ شخصے، حقیقت است نہ کہ رسمے''

آج معدودے چند کو چھوڑ کر اکثر خانقاہیں اور اکثر شیوخ حضرات اسی رسم ورواج میں اس طرح گرفتار ہیں گویا یہی اصل تصوف ہے۔ یہ بھول چکے ہیں کہ شخصیات اور رسومات کا تعلق دین وتصوف سے ہے نہ دین وتصوف کا تعلق ان سے ہے۔ بقول شاعر مشرق بع

رہ گئی رسم اذاں روح بلالی نہ رہی

سچ کہوں تو صرف اذان ہی رسم نہیں رہی، پورا نظام عبادت ہی رسم ہو گیا ہے۔

بقول محدث اعظم ہند بع

نام ہی نام ہے جو کچھ ہے حقیقت کے سوا

بادۂ کہنہ کے تحت موجودہ ہندو پاک کے بیشتر علما، مشائخ اور خانقاہوں کے پیشوا میر عبد الواحد بلگرامی کی اس عبارت پر نظر ٹھہر گئی:

ارادت کی ابتدا یہ ہے کہ تم ایمان وکفر کے جھگڑے میں نہ پڑو، ایک مذہب کو دوسرے مذہب پر ترجیح نہ دو اور بہتر فرقوں میں کچھ فرق نہ کرو، اگر تم عالم اور طالب خدا نہ ہوگے تو فرق کروگے اور طالب نہ رہ جاؤگے'' (الاحسان: ٦،ص: ٤٤)۔

حضرت میر کی مذکورہ باتیں اور ہندو پاک کے موجودہ مذہبی منظر نامہ میں بعد المشرقین پایا جا رہا ہے، کہاں میر صاحب کا یہ حکم اور کہاں ایک دوسرے کو کافر و مرتد اور ضال ومضل قرار دینے کی روش، وہ بھی صرف ایک فرقے کے درمیان؟ کبھی کبھی تو حالات کے بدلتے تیور کو دیکھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عنقریب اس جماعت میں ایک قدم یہ بھی اٹھے گا کہ علما کی جماعت ہی کہے گی آؤ ہم آپس میں کافر کافر کھیلتے ہیں''۔ کاش رہبری کرنے والے رہزنی چھوڑ کر اپنے منصب کی آبرو رکھتے اور میر صاحب کے کلمات کا لحاظ کرتے۔

تذکیر کے کالم میں'' اطاعت شیخ کے حدود'' جہاں فرائض وواجبات پر شیوخ کے حکم مستحبات کو ترجیح دینے والوں کو اپنا قبلہ درست کرنے کی دعوت دیتا ہے، وہیں مولانا اشتیاق صاحب کا

مضمون دلوں کی تطہیر کا پرزور مطالبہ کرتا ہے، جس کے بغیر سارا عمل بے سود اور ضیاع وقت کے علاوہ کچھ نہیں رہ جاتا۔

تحقیق وتنقید کے تحت آئے تمام مضامین اپنی مثال آپ ہیں، مگر مفتی مطیع الرحمٰن مضطر صاحب کا مضمون صرف پڑھنے سے نہیں بلکہ باضابطہ دوسروں کو پڑھانے سے تعلق رکھتا ہے۔ آج جو یہ گمرہی عام کی جارہی ہے کہ "صوفیہ کو فقہ وحدیث کا علم کہاں؟ انہیں تو اپنے حال سے مطلب ہوتا ہے، فقہ وحدیث سے تو علما شغف رکھتے ہیں" ان یاران نکتہ داں کو اب کون بتائے کہ مخدوم بہاری کا تعلق بھی گروہ صوفیہ ہی سے ہے۔ میرے خیال سے صوفیہ کے تعلق سے اس "فکری انحطاط" کا سبب مدارس کے نصاب سے تصوف اور اصول تصوف کا نکل جانا ہے۔ ہاں! اب بعض جگہوں پر اسے آٹے میں نمک کے برابر شامل کیا جارہا ہے مگر ہائے رے دلچسپی وہاں بھی مریض کا علاج خود ایک مریض کررہا ہے۔ نتیجۃً؛ ع

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اس کالم میں شامل مولانا ذیشان صاحب کے مضمون کا یہ جملہ "سماع مزامیر جب تک کسی حرام کا باعث یا ترک واجب کا موجب نہ ہو، حرام نہیں ہوسکتا" (الاحسان:۶،ص:۱۶۱) مکمل ایک اصولی اور قانونی ضابطہ ہے کسی چیز کے جواز یا عدم جواز کے لیے افسوس ہوتا ہے کہ سماع بالمزامیر کی حرمت کا قول کرنے والوں کو صرف یہی ایک عمل حرام نظر آتا ہے، ارے بھائی! اگر کوئی عمل کسی حرام کے مرتکب یا ترک واجب کا سبب بنتا ہو تو وہ کون کافر ہوگا جو اسے جائز وحلال قرار دے گا؟ مگر سماع مزامیر کے ساتھ سماع غیر مزامیر میں بھی یہی ضابطہ ملحوظ ہونا چاہیے۔ اب دیکھیے نا سماع پر تو ہمارے یہاں خوب گرما گرمی ہوتی ہے، ایک صاحب کہہ رہے تھے کہ اگر بالفرض سماع کو جائز مان بھی لیا جائے تو اس کے کچھ اصول ہیں جن کی روشنی میں آج کے اس پرفتن دور میں اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی، مثلا سننے والے، سنانے والے اور حاضرین سب کا مقصود ایک اور نیک ہو، جب کہ حالات یہ بتاتے ہیں کہ اس میں موجود رہنے والے اور اس سے شغف رکھنے والے پہلوں کی طرح نیک نہیں رہے، بلکہ فسق وفجور میں مبتلا رہنے والوں اور بے نمازیوں کی کثرت ہوتی ہے، آنجناب کو یہی سماع اور سماع کے حاضر باش یاد رہے اور ہر سو ہو رہے کانفرنسز، اجلاس، جلوس، چادر وگاگر اور اعراس کے وہ طرز وتقریب جس کی وجہ سے قائد وسجادہ سے لے کر عوام الناس تک کے فرائض وواجبات ترک ہوتے ہیں، یاد نہیں رہے، مقصود ایک اور حاضرین نیک کی شرط صرف سماع مزامیر میں؟ بے عمل، لالچی، دنیا پرست، اور دین سے دور علما، سجادگان، پیران اور ان کے شاگردان ومریدان کے ذریعہ انجام پارہی ساری مذہبی تقریبات کیا آنکھوں

سے اوجھل ہوگئیں؟ کاش ان بھولے بھالے لوگوں کے پاس کسی چیز کے جواز وعدم جواز کے لیے ایک ہی پیمانہ ہوتا تو ملت انتشار در انتشار کا شکار نہ ہوتی اس کالم کے آخری مضمون کو اگر حاصل کالم کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا، ہر مرید ہونے والے اور ہر مرید کرنے والے کو مرید ہونے اور مرید کرنے سے پہلے اس مضمون کو بغور پڑھنا چاہیے تا کہ مقصد بیعت ہر دو کے سامنے رہے اور اسی کی روشنی میں آگے کا سفر طے کرے، مقصود اصلاح است نہ کہ شخصے وتعدادے۔

شناسائی کے تحت جنوبی ہند کی معروف ومشہور اور تاریخی خانقاہ/ خانقاہ ہاشمیہ بیجاپور اور اس کے علمی وروحانی وارث وامین حضرت شاہ محی الدین المعروف بہ سید محمد تنویر ہاشمی دامت برکاتہ کی خدمات سے تفصیلی آشنائی ہوئی۔ یہاں ایک بات عرض کروں کہ سیدنا سرکار ہاشم پیر دستگیر رحمہ اللہ کی تعلیمات کے سلسلہ میں ثانوی مأخذ کا سہارا لیا گیا ہے، جب کہ اولین سورسز میں حضرت موصوف قدس سرہ کے دو اہم ملفوظات "مقصود المراد" اور "گنج الاسرار" خانقاہ ہاشمیہ میں تنویر ملت حضرت مولانا سید محمد تنویر ہاشمی دام ظلہ کے پاس موجود ہے، اگر اس سے استفادہ کیا جاتا تو حضرت کی تعلیمات کے کچھ اور اہم گوشے سامنے آتے۔

صوفی ادب کے تحت اردو زبان میں اپنی نوعیت کی منفرد مثنوی "مثنوی نغمات الاسرار فی مقامات الابرار" پر محققین وناقدین نے بھرپور روشنی ڈالی، ہندوستان کی مشہور ومعروف تعلیم گاہ جے این یو" کے شعبۂ اردو کے سینئر پروفیسر" پروفیسر معین الدین جینابڑے صاحب" نے مثنوی کی اثر آفرینی کے تعلق سے اپنا تجربہ ان الفاظ میں قلم بند کیا ہے:

مثنوی "نغمات الاسرار فی مقامات الابرار" کا یہ وصف کسی معجزہ سے کم نہیں کہ اس کی قرأت کے دوران پڑھنے والے کی کیفیت قلب پہلے بدلتی ہے اور پھر مباحث مثنوی کی تفہیم کا آغاز ہوتا ہے یہ ہر کسی کے ظرف فہم وفراست پر منحصر ہے کہ کون کتنا سمجھ پاتا ہے، تاہم امر واقعہ ہے کہ اس کے پڑھنے والوں کے دلوں کے قبلے درست ہوجاتے ہیں" (الاحسان-۶ ص: ۳۱۱)

اخیر میں مکتوبات سے قبل شیخ ولی تراش حضرت شیخ نجم الدین الکبریٰ کی حیات وتعلیمات پر خصوصی مقالات ومضامین شامل کیے گئے ہیں۔

کتاب" تاویلات نجمیہ" کے ص: ۴۱۰/ کے حوالے سے مقالہ نگار مولانا ضیاء الرحمٰن علیمی کا ترجمہ کردہ شیخ کا یہ اقتباس بھی خوب آئینے کا کام کررہا ہے:

دین میں تفرقہ پیدا کرنے والوں میں ایک جماعت مدعیان تصوف کی بھی ہے جن کے پاس حقیقت کچھ بھی نہیں، جیسے بعض ریا کارانہ طور پر زہد کا اظہار کرنے والے، بغیر صفائی قلب کے تصوف کا دعویٰ کرنے والے جاہل جھوٹے عارف، جو معرفت سے دور ہیں مثلاً قلندری جوالقی جو داڑھی

منڈواتے ہیں اور موٹے لباس پہنتے ہیں، اکثر ان مدعیان فقر کا حال یہ ہے کہ ان کے اندر فقر کی بو باس بھی نہیں۔ یوں ہی بعض غافل باطل پرست علماء سو بھی اس زمرے میں شامل ہیں جو دین کے عوض دنیا حاصل کرتے ہیں، وہ اپنے وجود سے طلب جاہ، مقبولیت، مال اندوزی، فخر و مباہات، شہرت اور کھانے کمانے کے لیے عہدے اور مناصب کے حصول میں لگے رہتے ہیں"۔ (الاحسان:۶، ص: ۳۸۴)

اسی شمارے کے صفحہ ۴۱۴ / کی یہ سطور؛

حضرت امام شافعی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ مجھے ایک صوفی کی صحبت نصیب ہوئی تو میں نے ان سے دو حرف استفادہ کیے۔ پہلا یہ کہ **الوقت کالسیف ان لم تقطعه یقطعک** یعنی وقت تلوار کی مانند ہے اگر تم اسے نہیں کاٹ سکو گے تو وہ تمہیں کاٹ دے گا، اور دوسری یہ کہ **نفسک ان شغلتها بالحق و الا شغلتک بالباطل**، یعنی اگر تم اپنے نفس کو حق میں مشغول نہیں رکھو گے تو وہ تمہیں باطل میں مشغول کر دے گا"۔

آج کے اس خرافاتی اور فضول وقت گذاری کے دور میں ہمیں اس سے نصیحت حاصل کرتے ہوئے کچھ مثبت کام کر جانا چاہیے ورنہ غفلت کی زندگی تو در حقیقت موت سے بھی بدتر زندگی ہوتی ہے۔ اللہ ہمیں غفلت کی دنیا سے باہر نکال کر ذکر و فکر آخرت کا مسافر بنائے۔

○ **مولانا حماد رضا مصباحی** (کشن گنج، بہار)

اللہ رب العزت کا بے پناہ فضل واحسان ہے کہ اس نے اپنی راہ کے طالبین و سالکین کے لیے تصوف پر نکلنے والا علمی، تحقیقی اور دعوتی مجلہ **الاحسان** کے مطالعہ کی توفیق دی، جو نہ صرف حاملینِ تصوف کے لیے ایک انمول نمونہ ہے بلکہ منکرینِ تصوف کے لیے بھی ایک بہترین رہنما اور مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے، مولیٰ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا ہے کہ اس سلسلہ کو قائم و دائم رکھے۔

الاحسان چھٹا شمارہ کے ٹائیٹل پیج سے ہی پتہ چل رہا ہے کہ اس کے اندر کی چیزیں تصوف سے متعلق ہیں گو اس بار **الاحسان** کا ٹائٹل پیج الاحسان کے لیے" براعتِ استہلال" کا مقام رکھتا ہے۔ کارکنان سے گزارش ہے کہ ٹائٹل پیج کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کریں۔

ہر بار کی طرح اس بار بھی" بادہ و ساغر" کے کالم میں حضور داعی اسلام ادام اللہ ظلہ علینا کے دو کلام منظرِ عام پر آئے جن میں سے ایک مناجات اور دوسرا غزل ہے، مناجات میں حضور داعی اسلام کا یہ شعر:

جو دیکھے مجھ کو وہ ہو جائے بے خود
کر استغراق ایسا یا الٰہی

یہ شعر بلاشبہ مناجات ہے، اس کے جملہ معانی و مفاہیم کی صحت کے ساتھ ساتھ اس شعر کو بھی

اگر مابعد کے لیے براعتِ استہلال مان لیا جائے تو بے جا نہ ہوگا کیوں کہ اس شمارے کا انتساب خصوصیت کے ساتھ حضرت شیخ ولی تراش، ابوالجناب نجم الدین الکبری قدس سرہ کی طرف کیا گیا ہے اور اخیر میں شیخ نجم الدین قدس سرہ پر خصوصی گوشہ بھی ہے۔

مکرمی مولانا ذیشان احمد مصباحی کا ابتدائیہ خوب تر ہے موصوف نے اس میں چشتیت کو جس انداز میں سمجھانے کی کوشش کی ہے وہ قابلِ مطالعہ ہے۔

بادہ کہنہ کے کالم میں چار کتابوں کا ترجمہ کیا گیا ہے جن میں سے دو حضرت شیخ نجم الدین کبری کی تصنیف کردہ ہیں اور بعد کی دو کتابیں بالترتیب شیخ سعدالدین خیرآبادی اور میر عبدالواحد بلگرامی قدست اسرارہم کی طرف منسوب ہیں، اول الذکر میں سے ایک کا ترجمہ مولانا ثاقب علیمی صاحب نے کیا ہے اور دوسرے کا خود راقم الحروف نے، آخر الذکر میں سے پہلی کتاب کا ترجمہ حضرت مولانا ضیاء الرحمٰن علیمی صاحب نے کیا ہے جب کی دوسری کتاب کا ترجمہ حضرت مولانا حسن سعید صفوی صاحب نے کیا ہے۔ چوتھی قسم "علم الحقائق" کے ذیل میں شیخ کی عبارت کا ترجمہ کرتے ہوئے محترم علیمی صاحب لکھتے ہیں "لہٰذا جو شخص علم حقائق اور علمِ احوال میں غلطی کا شکار ہو تو اپنی غلطی کے بارے میں صرف اسی سے پوچھے جو علمائے حقائق کے درمیان علم حقائق کے حوالے سے مردِ کامل ہو، جس نے یہ راہ دیکھی ہو اور اس راہ کی سیر کی ہو، اس لیے کہ ہر چیز کو اس کے مقام و محل میں تلاش کیا جاتا ہے، سیپ کو موتی میں تلاش کیا جاتا ہے، سورج کی تلاش اس کے برجوں میں ہوتی ہے۔۔۔ اسی طرح علم حقائق اور علم مقامات واحوال کو جس کا تعلق علم تصوف سے ہے عارفین کاملین کی بارگاہ میں تلاش کیا جاتا ہے۔"

موصوف کی یہ عبارت ان لوگوں کے لیے درسِ عبرت ہے جو تصوف کو علمائے فقہ وفتاوی سے اور فقہ وفتاوی اور دیگر علوم کو صوفیا سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کیوں کہ **کل اناء یترشح بما فیه، وَ صاحب البیت أدری بمافیه۔**

تذکیر کے کالم میں مولانا ذیشان احمد مصباحی نے شیخ ابوسعید مدظلہ کے افادات ذکر کیے جب کہ اسی کالم میں مولانا اشتیاق احمد مصباحی نے آٹھ صفحات پر مشتمل "قلبی امراض کی تشخیص اور ان کا علاج" کے عنوان پر ایک جامع اور موثر مقالہ تحریر کیا ہے جو بلاتفریقِ عوام وخواص سب کے لیے لائقِ مطالعہ ہے۔

تحقیق وتنقید کے کالم میں ڈاکٹر واحد نظیر کا مختصر لیکن جامع مقالہ "تعلیماتِ صوفیا کی عصری معنویت" گوناگوں اہمیت کا حامل ہے۔ ڈاکٹر صاحب ایک جگہ رقم طراز ہیں: "**فأینما تولوا فثم وجه الله**۔۔۔ جیسے قرآن اور حدیث کے بلیغ کلام پر نگاہِ تفصیل ڈالتے ہیں۔" ڈاکٹر صاحب کا یہ

پیراگراف نہایت جامع ہے لیکن اس کا سیاق سباق سے ربط سمجھ میں نہیں آیا، ممکن ہے کہ کچھ لکھنے سے رہ گیا ہو یا پھر میری کم فہمی ہے۔

مولانا عطاء النبی حسینی مصباحی کا مقالہ "کیا تصوف شریعت کے مخالف ہے" کافی معلومات افزا ہے۔ موصوف حسینی صاحب نے تعلیماتِ تصوف میں سے توکل، تقوی، توبہ، اخلاص، خوف، صبر اور صدق پر بالترتیب تفصیل کے ساتھ خامہ فرسائی کی ہے، اللہ کریم سے دعا ہے کہ مولیٰ تعالیٰ موصوف کے علم وعمل میں خوب خوب ترقی عطا فرمائے۔

مولانا امام الدین سعیدی صاحب کا مقالہ "تفسیر اشاری: ایک تحقیقی مطالعہ" محققانہ اور بے حد دل پذیر ثابت ہوا جو علما اور فقہا کو نہ صرف دعوتِ فکر دے رہا ہے بلکہ صوفیہ کی اشاری تفاسیر کے مطالعہ کی ترغیب بھی دے رہا ہے۔ اس تعلق سے امام غزالی قدس سرہ کے ان چند جملوں کا اعادہ مناسب ہے جن میں انہوں نے منکرینِ تفسیر اشاری کو خطاب کیا ہے اور ان کے انکار کے کچھ اہم اسباب کو بیان کیا ہے:

جب آدمی کچھ ظاہری تفاسیر کا عالم ہو جاتا ہے اور یہ اعتقاد کر لیتا ہے کہ کلمات قرآن کے معانی انہیں میں منحصر ہیں جو حضرت ابن عباس اور مجاہد رضی اللہ عنہما جیسے دیگر مفسرین سے منقول ہیں اور ان کے علاوہ جو تفسیر ہو وہ تفسیر بالرای ہے اور جس نے تفسیر بالرای کی اس نے اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالیا، یہ فکر بھی اس کے فہم کے لیے زبردست رکاوٹ ہوتی ہے۔ (احیاء علوم الدین: ۳۳۹، مکتبۃ الصفا، قاہرہ)

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب بات ایسی ہے تو پھر حضور معلم کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان "ان للقرآن ظهرا و بطنا و حدا و مطلعا" میں ظہر، بطن، حد اور مطلع کا کیا مطلب ہوگا؟ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول "لأوترت سبعين بعيرا من تفسير فاتحة الكتاب" کا کیا معنی ہوگا؟ حالاں کہ سورۂ فاتحہ کی تفسیر ظاہری بہت مختصر ہے، پھر حضرت ابو الدردا کے قول "لا يفقه الرجل حتى يجعل للقرآن وجوها" کا کیا مفہوم ہوگا، (یہاں تو سرے سے فقیہ ہونے کی ہی نفی کر دی گئی ہے)، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بیس مرتبہ تک 'بسم اللہ' پڑھنے میں کیا حکمت ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقصد صرف اور صرف باطنی معانی میں غور وفکر کرنا تھا اور امت کو یہ تعلیم دینا تھا کہ تم بھی اسی طرح غور وفکر کیا کرو، ورنہ تو بسم اللہ کا ترجمہ اور تفسیر ظاہر ہے اس میں تدبر و تفکر کی کیا حاجت ہے؟ (ایضا)

تحقیق و تنقید ہی کے کالم میں حضرت مولانا ذیشان احمد مصباحی کا تفصیلی مقالہ "سماع مزامیر پر چند اہم کتابیں" بھی کافی معلومات افزا ہے۔ حضرت ایک جگہ علامہ احمد سعید کاظمی پر تنقید کرتے ہوئے رقم طراز ہیں "علامہ کاظمی کے یہ دونوں جملے قابلِ غور ہیں" پہلے جملے کا قابل غور ہونا تو واضح ہے لیکن دوسرے جملے کا قابل غور ہونا خود قابل غور ہے۔ ممکن ہے کہ علامہ کاظمی نے اپنے اس جملے

میں اپنی جانب ان باتوں کو منسوب کیا ہے جو خود انہوں نے اپنے رسالے میں رقم نہیں کیا ہے ۔

بحث ونظر کے کالم میں علامہ غلام مصطفی ازہری صاحب نے" بیعت وارادت کے مفہوم پر ایک تحقیقی نظر" کے عنوان سے ۴۰ صفحات پر مشتمل ایک مفصل مقالہ تحریر کیا جو نہایت محققانہ اور غیر جانب دارانہ ہے ۔موصوف کے اس مقالہ کو پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوا کہ نئی نسل میں موصوف علمی و تحقیقی میدان میں اپنی ایک انفرادی شناخت بنانے میں کامیاب ہیں۔موصوف ہم جیسے بہت سے نو وارد حضرات کے لیے تحقیقی منہج کی تفہیم وترسیل کے لحاظ سے آئیڈیل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ موصوف کے علم وعمر میں اضافہ فرمائے اور عوام وخواص کو ان کے تحقیقی افادات سے حظِّ وافر عطا فرمائے۔

اس کے بعد شناسائی کے کالم میں مولانا مجیب الرحمٰن علیمی اور صوفی ادب کے کالم میں بالترتیب پروفیسر اختر الواسع ، پروفیسر مسعود انور علوی، پروفیسر قمر الہدی فریدی ، پروفیسر معین الدین جینا بڑے،ڈاکٹر ظفر انصاری ظفر اور سید تالیف حیدر کے مقالے قابل مطالعہ ہیں جو الاحسان کی زینت کو دوبالا کر رہے ہیں۔

زاویہ کے کالم میں شیخ نجم الدین کبریٰ کی حیات ،افکار اور خدمات پر خصوصی گوشہ ہے ۔ جس میں مولانا رفعت رضا نوری ،مولانا ضیاء الرحمٰن علیمی ،مولانا امام الدین سعیدی ،مولانا انوار احمد بغدادی ،مولانا ناظم اشرف مصباحی اور مولانا حیدر رضا مصباحی کے مقالات شامل ہیں ۔ مولانا حیدر رضا مصباحی کا مقالہ"منہاج السالکین ومعراج الطالبین" بہت جامع ہے ۔مصباحی صاحب شیخ نجم الدین کبری پر نقد کرتے ہوئے ایک مقام پر لکھتے ہیں" بہر کیف ان حکم ومواعظ کے باوجود مقدمے کی اس عبارت پر میری نظر رک گئی و ما رأیت عصمة النفس الا للأنبیا والأوصیا ،کیوں کہ اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ عصمت صرف انبیا و ملائکہ علیہم السلام کے لیے ہے حضرت سے یہ عرض ہے کہ شیخ نجم الدین کبری قدس سرہ کا بھی یہ عقیدہ نہیں ہے کہ اوصیا معصوم ہیں، لیکن چوں کہ حضرت کے بقول" ان کی عبارت سے یہ مترشح ہوتا ہے۔اس لیے جہاں تک ممکن ہو سکے مشائخ کی عبارات میں تاویل کرنا چاہیے، کیوں کہ ابوالجناب نجم الدین کبری کی شخصیت سے شاید ہی کسی کو انکار ہو۔ یہاں عصمت کی دو قسمیں کی جاسکتی ہے (۱) ممکن العصمت جس کو بلفظ دیگر اہل سنت کے علما"محفوظ" سے تعبیر کرتے ہیں (۲) واجب العصمت جو انبیا اور ملائکہ کا خاصہ ہے۔ ممکن ہے کہ شیخ ابوالجناب قدس سرہ نے اول الذکر معنی مراد لیا ہو۔

○○○

اس شمارے کے اہل قلم

- شیخ قطب الدین دمشقی قدس سرہ، مولف: الرسالۃ المکیۃ
- مخدوم شیخ سعدالدین خیرآبادی قدس سرہ، صاحب مجمع السلوک
- شاہ عارف صفی قدس سرہ، بانی: خانقاہ عالیہ عارفیہ، سید سراواں، الہ آباد
- شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی، صاحب سجادہ: خانقاہ عالیہ عارفیہ، سید سراواں، الہ آباد
- احمد جاوید، سابق ڈائریکٹر: اقبال اکیڈمی، لاہور
- شیخ اسامہ محمود ازہری، استاذ: جامعہ ازہر، قاہرہ مصر
- پروفیسر الطاف احمد اعظمی، تغلق آباد، نئی دہلی
- پروفیسر منظر اعجاز، صدر شعبۂ اردو، اے این کالج، پٹنہ-۱۳
- حسن سعید صفوی، مدیر: مجلہ الاحسان، شاہ صفی اکیڈمی، سید سراواں، الہ آباد، یوپی
- ضیاء الرحمٰن علیمی، شریک مرتب: مجلہ الاحسان، شاہ صفی اکیڈمی، سید سراواں، الہ آباد، یوپی
- ذیشان احمد مصباحی، شریک مرتب: مجلہ الاحسان، شاہ صفی اکیڈمی، سید سراواں، الہ آباد، یوپی
- غلام مصطفی ازہری، استاذ: جامعہ عارفیہ، سید سراواں، الہ آباد، یوپی
- امام الدین مصباحی، استاذ: جامعہ عارفیہ، سید سراواں، الہ آباد، یوپی
- آفتاب رشک مصباحی، پرنسپل: جامعہ ہاشم پیر، بیجاپور، کرناٹک

January 2017 **Alehsaan** Issue : 7

(An Annual Journal on Islamic Spirituality)

ہدیۂ تبریک

اے صاحبانِ صحو بصد چشم بنگرید — در بوستانِ جذب و فنا، سروِ بایزیدؒ

آمد ز سمتِ غیب بہارے کہ بر دمید — از خاکِ پاکِ روضۂ جاں غنچہ ہاے دید

بانگِ ہزار و نغمۂ بلبل بلند شد — اے اہلِ جذبہ وقتِ سماع است برجہید

اے قمریان دم بخود و کم نفس ، صلا — شمشادِ معنی از چمنِ حرف سرکشید

یارانِ سینہ صاف و رفیقانِ زندہ دل — آمد نوید خرمی و عیش، بشنوید

رندانِ بادہ خانۂ غیب و شہود را — تبریک با کہ ساقیِ فیاض در رسید

از بس کہ تازہ شد روش و راہِ واصلاں — از سعی و جہد داعیِ اسلام ابو سعید

آں مجریِ قلوب و مصفا گرِ نفوس — آں وارثِ روایتِ خرقانیؒ و فریدؒ

جمع است حبّ و معرفت و خشیت الہ — در مشربِ مرغبِ او با کمال دید

تنزیہ با حضوری و تشبیہ با خفا — ظاہر بباطن است و باظہار ناپدید

فرخندہ بادِ گلشنِ اسرارِ حق و خلق — در صدر و قلب و روح چنیں مرد یا مجید

صد شکر ربِ احمد و معبودِ مصطفیٰ ﷺ — کز میمنم برآمدہ فردے زبس رشید

از اتباعِ سنت و پابندیِ کتاب — اندر حقائق و حِکَم بندگی، فرید

سیارِ اوجِ اوجِ حقیقت بچشمِ باز — سباحِ موجِ موجِ طریق است ابو سعید

غواصِ ژرفِ ژرفِ محیطِ ولایت است — دانائے حرفِ حرفِ سلوک است ایں عمید

از ناحیاتِ پرگنہ چائل بر آمدست — ابرے کز او شگفتہ شود غنچۂ امید

یا ربّ ذا الجلال و الاکرام المدد — تا باشد ایں صباحِ ہدیٰ دائما سپید

انجاست سرِ غیب کہ از دل بدل رود — بے حرف و بے حکایت و بے گفت و بے شنید

ایں مجمع الصفات چو کبریتِ احمر است — ظاہر شود بہ سلسلہ در مدتِ مدید

احمد جاوید صاحب (لاہور)

SHAH SAFI ACADEMY, KHANQAH E ARIFIA

Saiyed Sarawan, Allahabad, Uttar Pradesh 212213 (INDIA)

shahsafiacademy@gmail.com/alehsaan.yearly@gmail.com